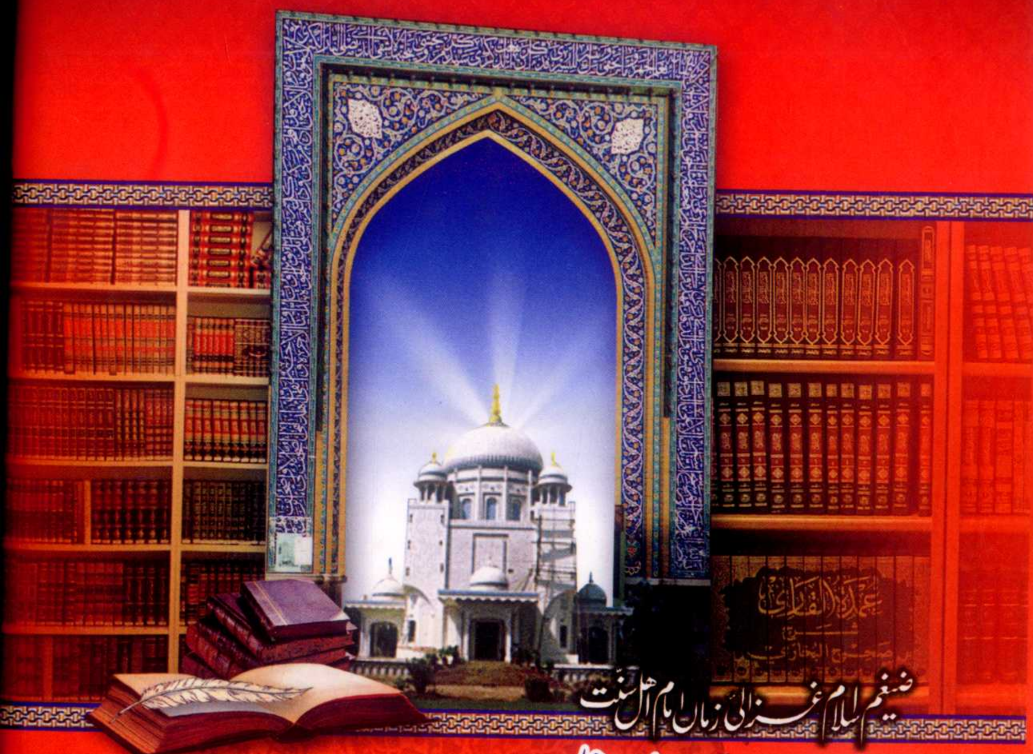
یہ حقائق کا اجالا یہ بصائر کا نکھار کتنا اجلا کتنا نکھرا طرزِ استدلال ہے

غزالیٔ زماں رحمۃ اللہ علیہ کا طرزِ استدلال



ضیغم اسلام غزالی زماں امام اہلسنت

علامہ سید احمد سعید شاہ کاظمی رحمۃ اللہ علیہ

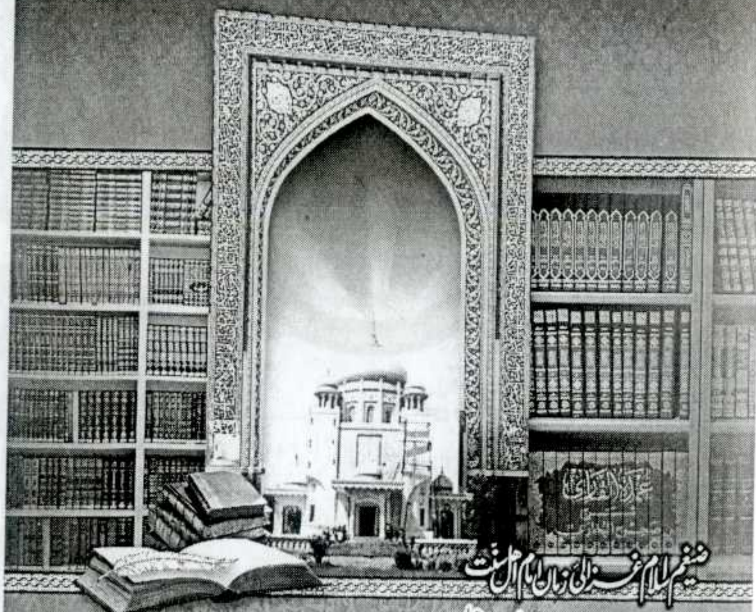
مؤلف حافظ امانت علی سعیدی

باہتمام حافظ طارق جاوید سعیدی

ادارہ احمد سعید کنز العلوم پاکستان

یہ حقائق کا اجالا یہ بصائر کا نکھار
کتنا اجلا کتنا نکھرا طرزِ استدلال ہے

غزالیِ زماں رحمۃ اللہ علیہ کا طرزِ استدلال



ضیغمِ اسلام غزالیِ زماں امام اہلسنت

علامہ سید احمد سعید شاہ کاظمی رحمۃ اللہ علیہ

مؤلف حافظ امانت علی سعیدی

باہتمام حافظ طارق جاوید سعیدی

ادارہ احمد سعید کنز العلوم پاکستان

بسم اللہ الرحمن الرحیم



نام کتاب	....	**غزالی زماں کا طرز استدلال**
مؤلف	....	حافظ امانت علی سعیدی
باہتمام	....	حافظ طارق جاوید سعیدی
نظر ثانی	....	سردار محمد اکرم بٹر سعیدی
سرپرستی	....	علامہ مفتی سعید احمد کریمی ملتان
سن اشاعت	....	27 مارچ 2014
تعداد صفحات	....	360
تعداد کتب	....	1100
قیمت امپورٹڈ پیپر	....	



ادارہ احمد سعید کنز العلوم پاکستان

انتساب

امام فکر حریت، شہنشاہ اقلیم علم و ادب، ترجمان افکار رضا، شناور علوم غزالیِ زماں حضرت علامہ ارشد القادری علیہ الرحمہ کے نام جنہوں نے اپنی حیات مستعار کا ایک ایک لمحہ شمع عشق رسول ﷺ فروزاں کرنے کی جدوجہد میں گزارا جو پرچم اسلام اٹھا کر دنیا کے چپہ چپہ پر صدائے حق بلند کرتے رہے۔ وہ درہ فاروقی جس نے نجد و دیوبندیت کے حلقوں میں زلزلہ برپا کر دیا تھا۔

وہ عالم نبیل جس نے استدلالِ غزالیِ زماں کو نشانِ منزل قرار دیا تھا، وہ ایسی ہستی تھے جس کے بارے کہا جا سکتا ہے

کہ

دل و جاں وجد کناں جھک گئے بہر تعظیم

ناچیز

حافظ امانت علی سعیدی

ملنے کا پتہ

ضیاء القرآن پبلی کیشنز	گنج بخش روڈ لاہور
صراط مستقیم پبلی کیشنز	دربار مارکیٹ لاہور
فرید بک سٹال	اردو بازار لاہور
مکتبہ خلیلیہ سعیدیہ	دربار مارکیٹ لاہور
شبیر برادرز	اردو بازار لاہور
کرماں والا بک شاپ	دربار مارکیٹ لاہور
مکتبہ قادریہ	دربار مارکیٹ لاہور

سٹاکسٹ

ادارہ احمد سعید کنز العلوم پاکستان

0300-8166082
0320-4630729
0300-4478030
0300-8090476

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

نشان منزل

استاذ العلماء علامہ محمد منشاء تابش قصوری زید مجدہ
جامعہ نظامیہ رضویہ لاہور، پاکستان

براعظم ایشاء کی علمی وروحانی شخصیات نے اہل سنت وجماعت کی ایسی آبیاری فرمائی کہ جہاں بھر میں ان کی خدمات اور کرامات کی شہرت اس رنگ میں سنائی دے رہی ہے جیسے ہم ان کی دلکش آواز اپنے کانوں سے سن رہے ہیں ایسی بکثرت ہستیوں کے اسماء گرامی رقم کیے جاسکتے ہیں مگر ان تمام سے صرف نظر کرتے ہوئے ناچیز اس دور کی بلند ترین شخصیت کے نام نامی اسم گرامی سے اپنے قلم کی زبان کو تر کیا جاتا ہوں، جن کی نہ صرف مجھے ایمان افروز روح پرور آواز سنائی دے رہی ہے بلکہ یوں محسوس ہو رہا ہے کہ سراپا کریم ،کرم فرماتے ہوئے زیارت وملاقات سے بھی مستفیض فرمارہی ہے وہ ہستی مبارکہ اکابر اسلام، مرشد الشمام عاشق سیدنا خیر الانام علیہ التحیۃ والثناء غزالئی زماں رازیٔ دوراں امام اہل سنت علامہ سید احمد سعید صاحب شاہ کاظمی رحمہ اللہ تعالیٰ علیہ ہے۔ جن کی ذات ستودہ صفات کے فیضان سے زمانہ ہمیشہ مستفیض ہوتا رہے گا جن کی مبارک زندگی کا ایک ایک لمحہ دین متین کے عروج وترقی کے لئے وقف رہا۔

پیش نظر تصنیف لطیف محترم مولانا حافظ امانت علی سعیدی زید مجدہ کی ساعیٔ جمیلہ کا بہترین شاہکار ہے جسے آپ نے غزالئی زماںؒ کی پرفیض حیات مبارکہ کے علمی استدلال کو اپنے ہی رنگ میں رنگا ہے اہل علم وفکر کی غزالئی زماں علیہ الرحمہ پر تحقیقی کاوشیں اعادہ طریقے احسن سلیقے سے جمع کر کے حضرت کے معتقدین، متوسلین، مریدین، تلامذہ کیلئے ہی علمی سوغات پیش نہیں کر رہے بلکہ عوام المسلمین کیلئے بھی ایک علم کا خزینہ بکھیر دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ جل وعلیٰ اپنے حبیب کریم ﷺ کے وسیلہ سے اس کتاب حسین کو محبوبیت و مقبولیت کا شرف عطا فرمائے۔ (آمین ثم آمین)

دعا گو محمد منشاء تابش قصوری زید مجدہ
جامعہ نظامیہ رضویہ لاہور، پاکستان

18-04-2014

دھنک

دھنک

طرز استدلال

کتنا عمدہ کتنا اعلیٰ طرز استدلال ہے
یہ جو حضرت کاظمی کا طرز استدلال ہے

یہ حقائق کا اجالا یہ بصائر کا نکھار
کتنا اولا کتنا نکھرا طرز استدلال ہے

آپ ہی کرنا سوال اور آپ ہی دینا جواب
عالمان دین یکتا طرز استدلال ہے

سچ کہا ہے ہر گلِ را رنگ و بوئے دیگر است
سارے عالم سے انوکھا طرز استدلال ہے

سینہ قرطاس پہ ہیں کیسے گل بوٹے کھلے
مثل گل تازہ، مہکتا طرز استدلال ہے

اہل دل، اہل نظر، اہل قلم، اہل سخن
دیکھئے کیسا نرالا طرز استدلال ہے

اے خطیبو، واعظو، پیرو، ادیبو، شاعرو
جھولیاں بھر لو خزینہ طرز استدلال ہے

وعظ کی کتنی کتابیں ہیں مگر اے دیدہ ور
علم والوں کا تقاضا طرز استدلال ہے

چاندنی بکھری ہوئی صفحہ قرطاس پر
ہر ورق سے نور پیدا طرز استدلال ہے

حافظ امانت کی ہے محنت خوب تر
اسکا تازہ تر نمونہ طرز استدلال ہے

حافظ طارق سعیدی اس کے ناشر بن گئے
واہ واہ انکا نصیبہ طرز استدلال ہے

جلسہ دستار میں آئے ہیں جو اہل وفا
انکی خدمت میں یہ تحفہ طرز استدلال ہے

اس کتاب تازہ پہ تازہ اظہاریہ
اے سعیدی تیرا حصہ طرز استدلال ہے

نتیجۂ فکر: صلاح الدین سعیدی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

باب نمبر 1

پاکستان میں اہلسنت کی ایک عبقری شخصیت

رئیس التحریر علامہ

ارشد القادری

رحمۃ اللہ علیہ

نعت شریف

از قلم: امام اہلسنّت غزالئی زماں علامہ سید احمد سعید کاظمی شاہؒ

جلوۂ والضحیٰ دیکھتے رہ گئے
حُسن بدر الدجیٰ دیکھتے رہ گئے

روئے روشن پہ زلف سیاہ دیکھ کر
ہم ضحیٰ اور سجیٰ دیکھتے رہ گئے

عرش پہ پہنچے آقا ﷺ تو روح الا میں
سدرۃ المنتہیٰ دیکھتے رہ گئے

حُسن اقراء تو دیکھا تھا جبریل علیہ السلام نے
ہم تو غار حرا دیکھتے رہ گئے

ملک التحریر علامہ ارشد القادری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ''خدا کا شکر ہے کہ مجھے غزالئ زماں حضرت علامہ سید احمد سعید کاظمی رحمۃ اللہ علیہ کی زیارت سے مشرف ہونے کا متعدد بار موقع ملا ہے۔ پہلی بار حضرت علامہ شاہ احمد نورانی کے دولت کدے پر اس تاریخی اجتماع میں ان کی زیارت کا شرف حاصل ہوا، جس میں ''دعوتِ اسلامی'' کے نام سے اہل سنت کی ایک تبلیغی اور اصلاحی جماعت کی بنیاد رکھی گئی۔ اور جس میں پاکستان کے اکثر اکابر اہلسنت تشریف فرما تھے۔ اور ان کے سامنے مجھے دعوتِ اسلامی کا لائحہ عمل پیش کرنا تھا جسے میں نے استاذ العلماء حضرت علامہ عبدالمصطفیٰ ازہری، بحر العلوم حضرت علامہ مفتی وقار الدین رضوی اور رئیس الافاضل حضرت علامہ مفتی ظفر علی نعمانی کے اصرار پر مرتب کیا تھا۔ مفتی صاحب موصوف نے مجھے اس کام کی تکمیل کیلئے دار العلوم امجدیہ کے ایک کمرے میں کئی دنوں تک نظر بند کر دیا تھا۔

دوسری بار دار العلوم امجدیہ ہی کی ایک تقریب میں ان کی ملاقات سے مکرر شاد کام ہوا اور اسی موقع پر علم و حکمت اور عشق و عرفان سے معمور ان کی تقریرِ منیر سننے کا بھی شرف حاصل ہوا۔ چند بار کی ملاقاتوں میں ان کے علم و فضل ان کے اخلاص و تقویٰ ان کے زہد و تقدس اور ان کی دلنواز اداؤں سے میں بہت زیادہ متاثر ہوا۔ لیکن صحیح طور پر ان کی علمی جلالت و جبروت کا اندازہ مجھے اس وقت ہوا جب میں جامعۃ المدینہ الاسلام کے جلسہ دستار بندی میں شرکت کیلئے ہالینڈ گیا اور جامعہ کے استاذ حضرت مولانا حافظ قاری خیر محمد چشتی ازہری نے مجھ سے اصرار فرمایا کہ میں حضرت غزالئ زماں سے متعلق اپنے تاثرات قلمبند کروں تا کہ ''لمعاتِ کاظمی'' کے نام سے جو عظیم الشان کتاب ان کے عزیز القدر مولانا محمد جمیل الرحمٰن صاحب سعیدی رضوی سلمہ شائع کر رہے ہیں، اس میں میرا مضمون بھی شامل کر دیا جائے۔

اپنے تاثرات قلمبند کرنے کیلئے مواد کی تلاش میں جب میں نے حضرت غزالئ زماں کے علمی مضامین کا مطالعہ شروع کیا جو ''مقالات کاظمی'' کے نام سے تین ضخیم

جلدوں مین شائع ہوئے ہیں، تو حیرت سے میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں اوران سے میرا ضمیر چیخ اٹھا کہ ''غزالیٔ زماں'' کا لقب ان کی عبقری شخصیت کیلئے بالکل الہامی ہے۔

ان کے مقالات کا مطالعہ کرنے کے بعد میں حیران ہوا کہ کس کس رخ سے ان کے جلوؤں کا تماشہ دیکھوں اور کدھر کدھر انگلیوں کا اشارہ کروں کہ علم وحکمت کا نگار خانہ یہاں ہے چلمن اٹھاؤ! ورق الٹو اور آنکھوں کے پٹ کھولو! اور کہاں کہاں مجد و شرف کے بیاں کیلئے میں بلبل ہزار داستان کی زبان مستعارلوں، کیسے یہ منظر دکھاؤں کہ قلم کی نوک سے بھی شہر بسایا جاتا ہے سنگ وخشت کا نہیں، علم ودانش کا شہر! وہ شہر جس کا دروازہ فاتح بابِ خیبر ہیں، جس طرف نگاہ اٹھایئے حقائق ومعانی کے گل بوٹے کھلے ہوئے ہیں اور جس صفحے پر نظر ڈالیے علوم ومعارف کے دفاتر کھلے ہوئے ہیں، جس مسئلے پر بھی قلم اٹھ گیا ہے بحث کا ہر گوشہ دوپہر کی دھوپ میں ہے، اورعلم وفن کی جس وادی میں بھی قدم رکھ دیا ہے اس کے کناروں تک پہنچ گئے ہیں، راہرو کی طرح نہیں میر کارواں کی طرح۔

ہرفن میں مہارت ورسوخ اوران کے جزئیات کے استحضار کی بات تو اپنی جگہ پر ہے سب سے بڑا فضل خداوندی تو یہ ہے کہ فلک پیما جولانی فکر اور بے پایاں ذہانت کے باوجود رائے کسی مسئلے میں بھی طغیان وسرکشی کا شکار نہیں ہے، قدم اسی جادۂ حق پر ہے جہاں امت کے اسلاف کھڑے ہیں، قوت فکر اور ذہانت پر نہ کسی طبقے کی اجارہ داری ہے اور نہ کسی فرد کی۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ ہر ذہین آدمی حق وصواب کی منزل کو بھی پالے، نصیبے کی یہ فیروز مندی صرف انہی مردانِ حق کے حصہ میں آتی ہے جو فکر و تحقیق کی منزل میں اسی کاروانِ ہدایت کے نشان قدم کو اپنے سامنے رکھتے ہیں جس کی طرف '' **صراط الذین انعمت علیهم** '' میں قرآن نے اشارہ کیا ہے۔

(وذالك فضل الله يؤتيه من يشاء)

تاریخ میں ایسے لوگوں کی بڑی طویل فہرست ہے جنھیں بے مہار عقل اور بے توفیق ذہانت نے جہنم کے دروازے تک پہنچا دیا، ایک مومن کیلئے ذہانت اور قابلیت بہت بڑی نعمت ہے اگر دل پر توفیقِ الٰہی کا پہرہ ہو اور بہت بڑا عذاب بھی ہے اگر توفیقِ الٰہی ساتھ چھوڑ دے۔

بلاشبہ حضرت غزالیٔ زماں کا بیکراں علم ان کیلئے حجابِ اکبر نہیں بن سکا کیونکہ علم و فن کی جلالت وجبروت کے ساتھ انہیں پہلو میں عجز ومسکنت کا ایک ٹوٹا ہوا دل بھی ملا تھا جو خشیت وعشق کی حرارت سے ہر وقت تپتا رہتا تھا۔ ویسے فراوانیٔ علم وعقل کے ساتھ نفس کی نخوت کا پیوند ہمیشہ جوڑا گیا ہے لیکن غزالیٔ زماں کا معاملہ بالکل دوسرا ہے ان کا نفس تو اسی دن اپنی موت مر گیا، جس دن وہ اپنے برادرِ معظم کے دستِ حق پرست پر مرید ہوئے اور دل کی پوری بشاشت کے ساتھ اپنے پورے وجود کو بھائی کی غلامی میں دیدیا۔ دنیا میں اس کی مثال بہت کم ملے گی کہ کسی نے اپنے بھائی کی عظمتوں کا اعتراف اس طرح ٹوٹ کر کیا ہو۔ بجز اس کے کہ نفس کی شرارت سے خدا نے اسے محفوظ کر دیا۔

اس میں قطعی دورائے نہیں کہ حضرت غزالیٔ زماں مختلف اصناف کے محاسن و کمالات کے جامع ہونے کی حیثیت سے ایک نادر الوجود شخصیت کے مالک تھے وہ اپنے عہد کے بے مثال محقق بھی تھے، بے نظیر خطیب بھی تھے اور یگانہ روزگار مدرس بھی، اسی کے ساتھ اردو ادب میں وہ ایک ایسی زبان کے موجد بھی تھے جو انھوں نے عربی درسگاہوں، دارالافتاؤں، صحافیوں اور خطیبوں کی زبانوں کے امتزاج سے تیار کی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے مقالات پڑھتے ہوئے قاری انہیں کئی روپ میں دیکھتا ہے۔ جب کبھی وہ فتویٰ کی زبان میں بات کرتے ہیں تو الفاظ چیخنے لگتے ہیں کہ ایک فقیہ بول رہا ہے، اور جب کسی علمی مسئلے پر قلم اٹھاتے ہیں تو درسگاہ کی زبان کا وقار

دیکھنے کے قابل ہوتا ہے۔ لیکن جب قومی اور ملکی مسائل پر اظہارِ خیال فرماتے ہیں تو اندازِ تحریر ایک صحافی کے پیرایہ بیان میں تبدیل ہوجاتا ہے۔ اور جب دعوت و تذکیر اور اصلاح و تبلیغ کی مسند سے بات کرتے ہیں تو سطر سطر میں ایک خطیب و داعی کا رنگ چھلکتا ہے۔ تحریر کی اسی بوقلمونی اور قلم کی اسی نیرنگی نے مقالے کی زبان کو رنگا رنگ پھولوں کے گلدستے کی طرح خوبصورت بنا دیا ہے۔

علاوہ ازیں تعبیرات اور اسلوب بیان پر انہیں اتنی قدرت حاصل ہے کہ پیچیدہ سے پیچیدہ علمی حقائق کو بھی نہایت حسن وخوبی کے ساتھ وہ عوام کے ذہنوں میں اتار دیتے ہیں، اپنی فکر کی سطح مرتفع سے نیچے اتر کر عوامی ذہن کی سطح سے بات کرتے ہوئے ہر وقت یہ خطرہ لاحق رہتا ہے کہ علمی وقار مجروح نہ ہوجائے لیکن غزالیٔ زماں کا اندازِ تفہیم اتنا متوازن ہے کہ ذرا بھی محسوس نہیں ہوتا کہ کون نیچے اُترا اور کسے اُوپر اٹھایا گیا۔

اس سلسلے میں ''مقالاتِ کاظمی'' سے بطور شواہد کے میں چند مقامات کی نشاندہی کرتا ہوں۔

(۱) مسئلہ معراج پر فلاسفہ کے اعتراضات کے جواب دیتے ہوئے ایک جگہ یہ ذیلی سرخی قائم کرتے ہیں۔

''معراج شریف کا محال ہونا ہی اس کے واقع ہونے کی دلیل ہے۔''

یہ فقرہ ضرب المثل بنانے کے قابل ہے، سنتے تھے کہ اجتماع ضدین محال ہے لیکن سر دھنئے کہ کس خوبصورتی کے ساتھ انھوں نے جمع کر کے دکھلا دیا۔ ایک ہی فقرے میں یونانی فلسفہ کا سارا غرور خاک میں مل گیا، کون ثابت کرسکتا ہے کہ محال بھی واقع ہوسکتا ہے لیکن ان کی تربت پر عقیدتوں کے پھول برسائیے کہ انھوں نے ثابت بھی کر کے دکھا دیا۔

ارشاد فرماتے ہیں۔

''اگر فلاسفہ معراج شریف کے محال ہونے پر دلائل قائم نہ کرتے تو ہمارا مدعا ثابت نہ ہوتا۔ اس لیے کہ ہم معراج کو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا معجزہ کہتے ہیں کہ اور معجزہ وہی ہے جس کا واقع ہونا عادۃً محال ہو۔'' (مقالاتِ کاظمی ج ۱ ص ۱۳۳)

یہ علامہ ہی کا کمال فن ہے کہ چند سطروں میں ''عقائد نسفی'' اور ''شمس بازغہ'' دونوں کو بہم بھی کیا اور الگ بھی کیا۔ جو مباحث سینکڑوں صفحات میں پھیلے ہوئے ہوں انہیں چند سطروں میں سمیٹ لینا تعبیر کا سب سے بڑا کمال ہے۔

(۲) اسی طرح ''شق صدر'' کے واقعہ سے غزالیٔ زماں نے حیات النبی ﷺ پر جس دلنشین پیرائے میں استدلال فرمایا ہے وہ مقام بھی اہلِ علم کیلئے قابلِ دید ہے۔

ارشاد فرماتے ہیں۔

''روح حیات کا مستقر قلبِ انسانی ہے، لہٰذا جب کسی انسان کا دل اس کے سینے سے باہر نکال لیا جائے تو وہ زندہ نہیں رہتا۔ لیکن رسول اللہ ﷺ کا قلب مبارک سینہ اقدس سے باہر نکالا گیا، پھر اسے شگاف دیا گیا اور وہ منجمد خون جو جسمانی اعتبار سے دل کیلئے بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ صاف کردیا گیا۔ اس کے باوجود بھی حضور ﷺ بدستور زندہ رہے جو اس امر کی روشن دلیل ہے کہ روح مبارک کے قبض کے بعد بھی حضور ﷺ زندہ ہیں۔'' (مقالاتِ کاظمی ج ۱ ص ۱۴۲)

مقالاتِ کاظمی میں اس طرح کے بیش قیمت جوہرات پوری کتاب میں بکھرے ہوئے ہیں۔ اگر انہیں ایک جگہ جمع کردیا جائے تو آج اختلافی مسائل پر مذہب اہلسنت کا ایک نیا علم کلام منظر عام پر آجائے۔ جامعۃ المدینہ الاسلام کی مصروفیات اگر حائل نہ ہوتیں حضرت غزالیٔ زماں کے یہ علمی خزائن اس امر کے متقاضی تھے کہ انہیں چن چن کر ایک جگہ جمع کردیا جائے، ان کی علمی افادیت تو اپنی جگہ پر ہے، سب سے بڑا فائدہ تو یہ ہے کہ اہلسنت کی نئی نسل بحث و استدلال کے ایک ایسے فن سے واقف ہوجائے گی جسے علامہ کاظمی اپنے ساتھ لے کر آئے تھے اور اپنے ساتھ لیکر چلے گئے۔

زندگی نے وفا کی توفیقِ الٰہی شریکِ حال رہی تو اِس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کا عزم کرلیا ہے۔

مسئلہ حیات النبی ﷺ:

مسئلہ حیات النبی ﷺ پر ہمارے علماء نے علم وتحقیق کے ایسے ایسے چراغ جلائے ہیں کہ اس رہگزر میں اب کہیں اندھیرا نہیں ہے، اور اپنے رشحاتِ قلم سے دلائل و براہین کے ایسے ایسے چمن سجائے کہ قریب سے گزر جایئے تو دماغ معطر ہوجائے اور اگر ان مہکتی ہوئی سطروں کو پڑھ لیجیے تو چشمِ تصور میں ایسا محسوس ہونے لگے کہ ہمارے حضور ﷺ مدینہ کی گلیوں میں آج بھی محوِ خرام ناز ہیں، حجرۂ عائشہ کے دروازے پر آج بھی دلوں کا فرش بچھا ہوا ہے اور اب گھڑی میں جلوؤں کی بارات اترنے ہی والی ہے۔

صلی اللہ علیک یارسول اللہ　　　الصلوٰۃ والسلام علیک یارسول اللہ

لیکن غزالیٔ زماں حضرت علامہ کاظمی کے قلم کی کاشت سب سے نرالی ہے۔

وہ بنجر زمینوں میں فصل اُگاتے ہیں اور ایسی اُگاتے ہیں کہ ساری عمر خرمن جمع کرتے رہیۓ اور پیداوار ختم نہ ہو۔ ''مقالاتِ کاظمی'' میں اس موضوع پر بھی حضرت موصوف کا ایک طویل مضمون شائع ہوا ہے، مضمون کیا ہے فکر انگیز بحث واستدلال کا ایک چمکتا ہوا چمن ہے جو قدم قدم پر اہلِ محبت کو کوچۂ حبیب کا پتہ بتاتا ہے، عطر بوئے گریباں سے سطر سطر معطر ہے اور پسینے کی خوشبوں میں لفظ لفظ بھیگا ہوا ہے، ہر نئے پیرا گراف کے بعد یہ آرزو مچلنے لگتی ہے کہ کاش حروف ونقوش کو زباں مل جاتی تو بریلی کے عاشقِ دلگیر کا قصیدۂ نور ہم ان کی زبانی بھی سن لیتے!

مولائے غافر وقدیر علامہ کاظمی رحمۃ اللہ علیہ کی تربت پر رحمت واکرام کے بادل برسائے انھوں نے اپنے اس مضمون میں دل کے بیماروں کی ایسی مسیحائی کی ہے کہ

صحت چاہنے والے بیمار اچھے ہوجائیں اور آئندہ کوئی بیمار نہ ہو۔ عقل فتنہ پرداز اور فکر غلط اندیش کے راستے سے اس مسئلہ میں جتنے بھی شکوک وشبہات پیدا ہوسکتے تھے، علامہ نے ڈھونڈ ڈھونڈ کر ان کا ایک ایک روزن بند کردیا ہے، بات میں بات پیدا کرنے کی خوبی اور بحث کے درمیان ایمان افروز نکتۂ آفرینی، حضرت علامہ کے قلم کی ایسی شوق انگیز دلربائی ہے جس پر نثار ہوجانے کو جی چاہتا ہے۔ یہ مضمون شروع سے آخر تک اسی طرح کے صوری اور معنوی محاسن سے آراستہ ہے، ہر ورق نگاہ کا دامن تھامتا ہے کہ یہیں رُک جاؤ!

لیکن حضرت علامہ کے علمی تبحر، جملہ فنون میں رسوخ، وسعتِ مطالعہ، قوتِ حافظہ، مسائل کے استحضار، اور فکر وذہانت کی عبقریت کا جلوہ دیکھنا چاہتے ہوں تو اسی مضمون کا وہ حصہ پڑھیۓ جہاں انھوں نے ایک حدیث پر مولوی اشرف علی تھانوی کے اعتراضات کا جواب دیا ہے، پوری بحث پڑھنے کے بعد ایسا محسوس ہوتا ہے کہ علامہ کاظمی کے پیکر میں عہد رفتہ کا کوئی عظیم وجلیل محدث بات کررہا ہے۔ جولوگ پریس کی طاقت کے بل پر رائی کو پہاڑ بنا کر پیش کرتے ہیں وہ سنجیدگی کے ساتھ ذیل کی بحث کا مطالعہ کریں، تھانہ بھون مین جس قامت کو اکیلے دیکھا تھا اب اسے کسی کے پہلو میں کھڑا کر کے دیکھیں تو مشاہدہ فیصلہ کردیگا کہ علم وفضل کے اعتبار سے کون بلند قامت ہے اور کون کوتاہ قد ہے۔

اب اس بحث کی پوری تفصیل چشمِ حیرت سے پڑھیۓ کہ زیادہ دیر تک ہم آپ کو انتظار کی زحمت نہیں دینا چاہتے۔ واضح رہے کہ میری تحریر میں فکری مواد اور مطالب و مفاہیم حضرت موصوف کے ہیں اور توضیح وتلخیص کی حد تک الفاظ میرے ہیں۔

عقیدہ حیاۃ النبی ﷺ پر طبرانی کی ایک حدیث:

نبی پاک ﷺ کی حسی حیات اور غیبی قوتِ ادراک پر دلائل پیش کرتے ہوئے

حضرت علامہ کاظمی رحمۃ اللہ علیہ نے ابن قیم کی جلاء الافہام سے طبرانی کی روایت کردہ ایک حدیث نقل فرمائی ہے، جس کا اردو ترجمہ یہی ہے۔

حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضور انور ﷺ نے ارشار فرمایا'' کہ جمعہ کے دن مجھ پر کثرت سے درود پڑھا کرو کہ وہ یوم مشہود ہے اس دن فرشتے حاضر ہوتے ہیں، کوئی بندۂ مومن جہاں سے بھی مجھ پر درود پڑھتا ہے اس کی آواز مجھ تک پہنچ جاتی ہے، چاہے وہ جہاں بھی موجود ہو۔

حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور کا یہ ارشاد سن کر ہم نے عرض کیا کہ علم وادراک کا یہ سلسلہ آپ کی وفات کے بعد بھی باقی رہے گا؟ فرمایا ہاں، میری وفات کے بعد بھی، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے زمین پر حرام کردیا ہے، کہ وہ انبیاء کے جسموں کو کھائے۔'' امام طبرانی کہتے ہیں کہ اس حدیث کو حافظ منذری نے ترغیب میں ذکر کیا ہے اور کہا ہے کہ اس حدیث کو حضرت ابن ماجہ نے بسند جید روایت کیا ہے۔ (جلاء الافہام، ص ۷۳، ۷۴)

اس حدیث پر تھانوی صاحب کا پہلا اعتراض:

تھانوی صاحب کے مجموعہ ملفوظات ابو دارالنور، ج ۱، ص ۵۰۲، کے بیان کے مطابق کسی نے ان سے سوال کیا کہ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور ﷺ ہر شخص کی آواز کا سماع فرماتے ہیں، اگر اس کے علاوہ حدیث کا کوئی اور مطلب ہو تو اسے واضح فرمائیں تا کہ تردد رفع ہو، یا ایسا ہی عقیدہ رکھنا چاہیے۔

تھانوی صاحب نے اس سوال کے جواب میں حدیث کی سند اور اس کے مضمون، دنوں پر اعتراض کیا۔ سند پر اعتراض کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ اس حدیث کی سند میں ''یحییٰ بن ایوب العلاف'' نام کے ایک راوی ہیں، جن کا نام یہاں بلانسب مذکور ہے، جبکہ حدیثوں کے سلسلہ اسناد میں ایک راوی یحییٰ بن ایوب غافقی کا

بھی نام آتا ہے، جن کے متعلق اسماء الرجال کی کتابوں میں لکھا ہے کہ وہ حدیث بیان کرنے میں اکثر خطا کرتے ہیں، یہاں اس بات کا احتمال ہے کہ اس یحییٰ سے وہی یحییٰ بن ایوب غافقی مراد ہوں۔ لہٰذا اس احتمال کی وجہ سے یہ حدیث استدلال کے قابل نہیں رہی۔

علامہ کاظمی رحمۃ اللہ علیہ کی طرف سے تھانوی صاحب کے اعتراض کا دندانِ شکن جواب:

حضرت علامہ کاظمی نے تھانوی صاحب کے اعتراض کا جو جواب دیا وہ فنِ حدیث میں ان کے رسوخ ومہارت کی ایک کھلی ہوئی شہادت ہے، تہذیب التہذیب ج ۱۱، ص ۲۸۵ کے حوالہ سے موصوف نے ارشاد فرمایا کہ اسماء الرجال کی کتابوں میں یحییٰ بن ایوب العلاف، اور یحییٰ بن ایوب غافقی کے نام سے دو راویوں کا الگ الگ ذکر کیا گیا ہے، اور دونوں راویوں کو علاف اور غافقی کے الفاظ سے ممتاز کردیا گیا ہے، پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ احتمال کہاں سے پیدا ہوگیا؟ اس کے بعد تنبیہ فرماتے ہیں کہ اس کھلے ہوئے امتیاز کے باوجود علاف کے بارے میں غافقی کا احتمال پیدا کرنا علمی دیانت کا خون نہیں تو اور کیا ہے؟

تھانوی صاحب کا دوسرا اعتراض:

اس حدیث کی سند پر تھانوی صاحب کا دوسرا اعترض یہ ہے کہ اس حدیث کے راویوں میں ''خالد بن زید'' نام سے ایک راوی ہیں ان کا نام بھی یہاں بلانسب مذکور ہے، جبکہ اس نام کے راویوں میں ایک صاحب کی عادت ارسال کی ہے، اوراس جیسی معنعن حدیث میں راوی کے متروک ہونے اوراس متروک کے غیر ثقہ ہونے کا احتمال ہے، اس لحاظ سے بھی یہ حدیث قابلِ استدلال نہیں ہے۔

علامہ کاظمی رحمۃ اللہ علیہ کا محققانہ جواب:

حضرت علامہ رحمۃ اللہ علیہ نے تدریب الراوی کے حوالہ سے اس اعتراض کا

جواب دیتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے کہ تھانوی صاحب کا یہ احتمال تین وجوہ سے رد کر دینے کے قابل ہے۔

① پہلی وجہ یہ ہے کہ اس طرح کے غیر وقیع اور بے بنیاد احتمال کو اگر معتبر مان لیا جائے تو ساری معنعن حدیثوں کا ساقط الاعتبار ہونا لازم آجائے گا، اور یہ اصول حدیث کی صریح خلاف ورزی ہوگی۔

② دوسری وجہ یہ ہے کہ خالد بن زید نام کے کسی راوی میں ارسال کی عادت کا پایا جانا اس امر کیلئے دلیل نہیں بن سکتا کہ زیرِ بحث راوی بھی ارسال کا عادی ہے جب تک باوثوق ذرائع سے راوی کے شخص کا تعین نہ ہوجائے، صرف نام کے اشتراک سے کسی کے خلاف اس طرح کا الزام عائد نہیں کیا سکتا۔

③ تیسری وجہ یہ ہے کہ اگر بالفرض زیرِ بحث راوی ارسال کی عادت کیلئے متعین بھی ہوجائے جب بھی اصولِ حدیث کی روشنی میں ارسال کو اس وقت تک منافی اتصال نہیں قرار دیا جاسکتا جب تک معنعن کا مدلس ہونا ثابت نہ ہوجائے، نیز روای اور مروی عنہ کے درمیان لقاء کا امکان بھی منتفی نہ ہوجائے۔

اس کے بعد علامہ نے تدریب الراوی کے حوالہ سے تھانوی صاحب کو متنبہ کیا ہے کہ حدیث معنعن میں تدریس سے سقم پیدا ہوتا ہے، ارسال سے نہیں! حضرت موصوف کی یہ تنبیہ تھانوی صاحب کے مبلغ علم پر اتنی کاری ضرب ہے کہ ان کے اعتراض کی ساری بنیاد ہی مسمار ہوکر رہ گئی ہے۔ امید ہے کہ ان کے متبعین علمی افلاس کا یہ کرب ضرور محسوس کریں گے؟

تھانوی صاحب کا تیسرا اعتراض:

اس حدیث پر تھانوی صاحب کا تیسرا اعتراض یہ ہے کہ اس حدیث کے راویوں میں سعید بن ابی ہلال نام کے ایک راوی ہیں، جنھیں علامہ ابن حزم نے ضعیف کہا

ہے۔ لہٰذا اس ضعف کی وجہ سے زیرِ بحث حدیث استدلال کے قابل نہیں رہی۔

علامہ کاظمی رحمۃ اللہ علیہ دندان شکن جواب:

حضرت غزالیٔ زماں رحمۃ اللہ علیہ نے اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے بخیہ ادھیڑ کر رکھ دیا ہے، علمی نخوت کا غرور کس طرح چکنا چور ہوتا ہے، اسے حضرت موصوف کے الفاظ میں یہاں دیکھیے۔

"مجھے حیرت ہے کہ تھانوی صاحب نے سعید بن ابی ہلال کی تضعیف تو دیکھ لی مگر انہیں توثیق نظر نہ آئی، میزان الاعتدال ہی اٹھا کر دیکھ لیا ہوتا تو انہیں اپنی رائے کی غلطی کا احساس ہوجاتا جس میں علامہ ذہبی نے نہایت صراحت کے ساتھ لکھا ہے کہ سعید بن ابی ہلال ثقہ راوی ہیں، اور صحاح ستہ کے شیوخ کے یہاں وہ ثقاہت کے ساتھ مشہور ومعروف ہیں۔ انہیں ضعیف کہنے میں ابن حزم تنہا ہیں۔"

اس کے بعد حضرت غزالیٔ زماں نے تھانوی صاحب کو ان لفظوں میں متنبہ کیا ہے۔

"ہر طرف سے آنکھ بند کر کے تنہا ابنِ حزم ہی کے قول پر اگر تھانوی صاحب کو اعتماد ہے تو انہیں چاہیے کہ وہ حدیث کی مشہور متداول کتاب جامع ترمذی سے بھی ہاتھ اٹھالیں کیونکہ ابنِ حزم نے جامع ترمذی کو مجہول کہا ہے۔"

اخیر میں حضرت غزالیٔ زماں نے زیرِ بحث حدیث کے متعلق ایک فیصلہ کن بات کہہ کر پوری بحث لپیٹ کر رکھ دی ہے فرماتے ہیں کہ "وہ زیرِ بحث حدیث کے متعلق حافظ منذری کا یہ قول کہ ابن ماجہ نے بسند جید اس حدیث کی روایت کی ہے تھانوی صاحب کے جملہ احتمالات واہیہ کا قلع قمع کردیتا ہے۔"

تھانوی صاحب کا چوتھا اعتراض:

زیرِ بحث حدیث پر تھانوی صاحب کا چوتھا اعتراض یہ ہے کہ کئی جگہ اس میں

عنعنہ ہے اس لیے جب تک راویوں اور مروی عنہم کے درمیان لقاء ثابت نہ ہو جائے اس حدیث کو سند کے اعتبار سے متصل نہیں قرار دیا جا سکتا۔

علامہ کاظمی رحمۃ اللہ علیہ کا مدلل جواب:

حضرت غزالیٔ زماں رحمۃ اللہ علیہ نے اس اعتراض کا ایسا مدلل اور مسکت جواب دیا ہے کہ تھانوی صاحب اس میں بالکل طفل مکتب نظر آنے لگے ہیں۔

''فرماتے ہیں کہ عنعنہ کے مسئلے پر تھانوی صاحب کا یہ کلام ہی سرے سے غلط اور رد کر دینے کے قابل ہے کیونکہ اصولِ حدیث کے مطابق حدیث معنعن میں راوی اور مروی عنہ کے درمیان لقاء کا ثبوت قطعاً ضروری نہیں ہے، بلکہ صرف لقاء کا امکان کافی ہے جیسا کہ پچھلے اوراق میں تدریب الراوی کی یہ صراحت گزر چکی ہے کہ بشرط امکان لقاء بعضہم بعضاء یعنی راوی اور مروی عنہ کے درمیان لقاء کا امکان کی شرط پر ساری معنعن حدیثیں عندالمحدثین قابلِ قبول ہیں۔''

حدیث کے مضمون پر تھانوی صاحب کا پہلا اعتراض:

تھانوی صاحب نے زیرِ بحث حدیث کی سند پر جو اعتراضات کیے ہیں اس کا سلسلہ یہاں ختم ہو گیا۔ اب حدیث کے مضمون پر ان کے اعتراضات کی بحث شروع ہوتی ہے۔

زیرِ بحث حدیث کے متن پر تھانوی صاحب کا سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ اس حدیث کا مضمون دوسری متعدد احادیث صحیحہ کے معارض ہے اس لیے وہ قابلِ استدلال نہیں ہے، اپنے دعوے کے ثبوت میں تھانوی صاحب نے اس کے معارض یہ تین حدیثیں پیش کی ہیں۔

(۱) حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ''زمین میں گشت لگانے والے اللہ کے فرشتے میری امت کا سلام مجھے پہنچاتے

ہیں۔''

(۲) مشکوٰۃ المصابیح میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ حضور انور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ''جو شخص میری قبر کے پاس حاضر ہو کر مجھ پر درود پڑھتا ہے، میں اسے خود سنتا ہوں اور جو دور سے مجھ پر درود پڑھتا اسے مجھ تک پہنچایا جاتا ہے۔

(۳) اور نسائی نے حضرت اوس بن اوس سے روایت کی کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تمہارا درود مجھ پر پیش کیا جاتا ہے۔

ان تمام حدیثوں کو نقل کرنے کے بعد تھانوی صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

یہ سب حدیثیں دور سے نہ سننے میں صریح ہیں اور ظاہر ہے کہ جلاء الافہام ان کتب کے برابر قوت میں نہیں ہو سکتی! لہٰذا اقویٰ کو ترجیح ہوگی، یعنی جلاء الافہام کی حدیث مرجوح ٹھہرے گی اور وہ استدلال کے قابل نہیں رہے گی۔

علامہ کاظمی رحمۃ اللہ علیہ کا محققانہ جواب:

حضرت علامہ نے تھانوی صاحب کے اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے کہ ان تمام حدیثوں میں ''پہنچانے'' اور ''پیش کرنے'' کے الفاظ عدم سماع میں صریح نہیں ہیں۔ کیونکہ فیض الباری شرح بخاری کی تصریح کے مطابق عرض صلوٰۃ علم کے منافی نہیں ہے، بہت سی حدیثوں میں منقول ہے کہ فرشتے بندوں کے اعمال خداوند ذوالجلال کے حضور پیش کرتے ہیں، حالانکہ اس کے عالم الغیب والشہادۃ ہونے پر سب کا اتفاق ہے اس سے ثابت ہوا کہ علم وسماع کے باوجود بھی اعزاز وتکریم کے طور پر کسی چیز کا کسی معظم کے سامنے پیش کیا جانا عندالشرع اور عندالعقل شائع اور ذائع ہے۔ لہٰذا تھانوی صاحب کا یہ دعویٰ بالکل غلط ہے کہ ان کی پیش کردہ حدیثیں عدم سماع میں صریح ہیں۔

''نیز متعدد حدیثوں میں حضور انور ﷺ کا یہ ارشاد بھی نقل ہوا ہے کہ میری قبر پر

ایک فرشتہ اللہ کی طرف سے مقرر ہے، جو شخص میری قبر کے پاس حاضر ہو کر مجھ پر درود پڑھتا ہے وہ مجھ تک اس کا درود پہنچاتا ہے، اگر پہنچانا عدم سماع میں صریح ہے تو اس حدیث سے لازم آئے گا کہ قریب کا درود بھی حضور ﷺ نہیں سنتے اور یہ بالاتفاق باطل ہے، اور یہ تعارض اسی صورت میں دفع ہو سکتا ہے، جبکہ ''پیش کرنے'' اور ''پہنچانے'' کو عدم سماع میں صریح نہ مانا جائے، تعارض اٹھ جانے کے بعد دو حدیثوں کے درمیان ترجیح کا سوال ہی ختم ہو جاتا ہے۔''

تھانوی صاحب کی پیش کردہ حدیث پر حضرت علامہ کا نقد!

یہاں تک تو حضرت علامہ کی طرف سے دفاع کا رنگ تھا جس نے تھانوی صاحب کی حدیث دانی کا سارا رنگ ہی پھاڑ دیا، اب ایک دھماکے کی صورت میں حضرت موصوف کے اقدام کی سطوت ملاحظہ فرمایئے۔ قلم کا ہتھیار اٹھانے کے بعد ذرا رجز کی یہ شان دیکھئے، ارشاد فرماتے ہیں۔

''جس طرح تھانوی صاحب نے ہماری پیش کردہ حدیث کی سند پر کلام کیا ہے ہمیں بھی حق پہنچتا ہے کہ ان کی پیش کردہ احادیث کی سند پر کلام کریں۔ ان کی پیش کردہ تمام احادیث کی سند پر کلام کریں۔ ان کی پیش کردہ تمام حدیثوں میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت خاص اہمیت رکھتی ہے کہ اس میں دور سے پیش کرنے اور قریب سے سننے کا لفظ بطور تقابل وارد ہوا ہے، اس لیے بطور خاص اسی حدیث کی سند پر میں کلام کرتا ہوں۔''

سند حدیث پر اپنے کلام کا آغاز کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں کہ تھانوی صاحب نے بیہقی کی اس حدیث کو بروایت ابو ہریرہ مشکوٰۃ المصابیح سے نقل کیا ہے جس میں سند مذکور نہیں ہے، اب ہم اس حدیث کو خود امام بیہقی کی تصنیف ''رسالہ حیاۃ الانبیاء'' سے مع سند نقل کرتے ہیں۔

اس حدیث کی سند میں ابو عبد الرحمٰن نامی ایک راوی ہے جس کے متعلق امام بیہقی نے اپنی کتاب میں تحریر فرمایا ہے کہ ابو عبد الرحمٰن جس کی کنیت ہے اس کا اصل نام ''محمد بن مروان السدی'' ہے ''**وفیه نظر**'' اور وہ محل نظر ہے، یعنی وہ قابلِ اعتماد نہیں ہے، دوسری طرف اسی حدیث کے تحت حیاۃ الانبیاء کے شارح محمد بن بوسنوی نے کہا ہے کہ اس حدیث کا ایک راوی محمد بن مروان السدی ضعیف اور مہتم بالکذب ہے، اور تیسری طرف اسی محمد بن مروان السدی کے بارے میں امام ذہبی نے میزان الاعتدال میں تصریح فرمائی کہ محدثین نے اسے ترک کر دیا ہے اور بعض نے اسے مہتم بالکذب کہا ہے، ابن معین نے صراحت کی ہے کہ وہ ثقہ نہیں ہے، محمد بن مروان السدی کے خلاف آئمۂ حدیث کی یہ ساری جرحیں اس بات کیلئے شاہد عدل ہیں کہ اس کی روایت کردہ حدیث استدلال کے قابل نہیں ہے۔

اس کے بعد حضرت غزالیٔ زماں رحمۃ اللہ علیہ تھانوی صاحب کی جانِ ناتواں پر قیامت ڈھاتے ہیں کہ تھانوی صاحب نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی جس حدیث کو عدم سماع میں صریح قرار دیا تھا جب وہی معیارِ صحت سے گر گئی تو اب وہ شاخ ہی نہ رہی جس پہ آشیانہ تھا۔

ترکش کا آخری تیر:

تھانوی صاحب کو حضور انور ﷺ کی حسی حیات وغیبی قوتِ ادراک سے اتنا سخت انکار ہے کہ جب جلاء الافہام کی زیرِ بحث حدیث پر اعتراض کرنے کیلئے ان کے پاس کچھ نہیں رہ گیا تو وہ اختراعات پر اتر آئے اور اس انجام سے بے پرواہ ہو کر کہ اہلِ علم کی دنیا انہیں کیا کہے گی، ایک نیا گل کھلایا، اب ان کے ترکش کا آخری تیر ملاحظہ فرمایئے۔

ارشاد فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں ''بلغی صوتہ'' دراصل ''بلغی صلوتہ'' ہے کاتب کی غلطی سے لام لکھنے سے رہ گیا جس کا مطلب یہ ہے کہ حضور ﷺ تک درود

پڑھنے والے کی آواز نہیں پہنچتی، اس کا درود پہنچتا ہے۔

اب اس پر علامہ کاظمی رحمۃ اللہ علیہ کا وہ خوبصورت طنز ملاحظہ فرمایئے، جسے بار بار پڑھیے اور سر دھنیے۔

"جان چھڑانے کیلئے اس سے بہتر کوئی جواب نہیں ہوسکتا کہ الہامات پر نہ کوئی نقص وارد ہوسکتا ہے نہ معارضہ! بہر حال تھانوی صاحب کے ہنر کی ہم داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ جب کسی بات کا جواب نہ ہو سکے تو کاتب سے غلطی کرادی جائے۔"

پوری بحث کا خلاصہ:

مبلغ علم اور عقیدے کا فساد دو الگ الگ چیزیں ہیں، اہلسنت کی طرف سے معتزلہ پر عقیدے کے فساد کا الزام کئی سو برس کا جانا پہچانا واقعہ ہے، لیکن جہاں تک ان کے مبلغ علم کا تعلق ہے، ہم اس سچائی سے ہرگز انکار نہیں کر سکتے کہ علم وفن کے اعتبار سے تھانوی صاحب کے خلاف ہمارا الزام معتزلہ سے بھی زیادہ سخت ہے کیونکہ ضلالت والحاد کے ہزار الزام کے باوجود معتزلہ پر اہانت رسول اللہ ﷺ کا کوئی الزام نہیں ہے، جبکہ تھانوی صاحب پوری طرح اس الزام کی زد میں ہیں، جیسا کہ اپنی اہانت انگیز عبارت کو تبدیل کر کے انھوں نے عملاً اس کا اعتراف بھی کرلیا ہے۔

کاش! یہی کام انھوں نے اعتراف تقصیر کے ساتھ کیا ہوتا تو آج ان کا مقام ہمارے دلوں میں بزمِ عقیدت میں شہ نشین کی جگہ پر ہوتا۔ ان کے عقیدے کا فساد تو بہت پہلے سے ہمیں معلوم تھا، لیکن آج ان کا مبلغ علم بھی معلومات کے اُجالے میں آ گیا۔ اپنے معتقدین میں تھانوی صاحب کا علمی تبحر فسادعجائب کی طرح مشہور رہے، لیکن آج کی پوری بحث پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ تھانوی صاحب اصولِ حدیث کے مبادیات سے بھی واقف نہیں ہیں، یہ تو اپنے اپنے مقدر کی بات ہے کہ ملتان کا نغمہ درود بغیر کسی روک ٹوک کے مدینہ کے حریم قدس تک پہنچ گیا، لیکن تھانہ بھون کی آواز

اپنے ہی شہر کی دیواروں سے ٹکرا کر واپس آ گئی۔ مانا کہ ہدایت کسب سے نہیں فضلِ الٰہی سے حاصل ہوتی ہے۔ لیکن علم تو کسبی شئی ہے پھر فنِ حدیث کی جو کتابیں کاظمی صاحب کا ہاتھ پکڑ کر روضۂ رسول ﷺ تک لے گئیں آخر تھانوی کو دشتِ نامرادی میں بھٹکنے کیلئے کیوں چھوڑ دیا......؟

ایں سخن را چہ جوابست تو ہم میدانی؟

امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ کا اعلانِ حق:

یہ بتانے کیلئے کہ مسئلہ حیاۃ النبی ﷺ میں ہم اپنے اسلاف کے مسلک پر ہیں، حضرت علامہ نے امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک اعلانِ حق نقل فرمایا ہے، اسے ایمان کی بشاشت کے ساتھ پڑھیے اور اندازہ لگایئے کہ جب روحیں عشق وعقیدت کے احساس سے ہم آہنگ ہوجاتی ہیں تو ماضی کی آواز مستقبل میں کس طرح گونجنے لگتی ہے۔ حضور انور ﷺ کی غیبی قوت ادراک اور حسی حقیقی حیات پر احادیث صحیحہ کے مہکتے ہوئے پھولوں کا انبار لگا کر علامہ سیوطی نے جو عطر نکالا ہے اس سے اپنے دل ودماغ معطر کیجئے۔ ارشاد فرماتے ہیں۔

"ان ساری احادیث وروایات کے مجموعہ کا ماحصل یہ ہے کہ حضور انور ﷺ اپنے جسم اقدس اور اپنی روح مبارک کے ساتھ زندہ ہیں اور عالم میں جس طرح چاہتے ہیں تصرف فرماتے ہیں، اور اقطار ارضی اور عالم ملکوت میں جہاں چاہتے ہیں تشریف لے جاتے ہیں، اور وہ اپنی اسی ہیئت پر ہیں جس پر وفات سے پہلے تھے اس میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی، اور یہ کہ حضور انور ﷺ ہماری آنکھوں سے اس طرح اوجھل کردیے گئے ہیں، جس طرح فرشتے اپنے نوری اجساد کے ساتھ زندہ ہونے کے باوجود ہماری آنکھوں سے اوجھل ہیں، لیکن جب اللہ تعالیٰ اپنے کسی مقرب بندے کو اپنے حبیب ﷺ کے دیدار سے مشرف کرنا چاہتا ہے تو اس کی آنکھوں پر سے حجاب

اُٹھالیتا ہے، اور وہ حضور ﷺ کو اسی ہیئت پر دیکھتا ہے۔ جس ہیئت کے ساتھ حضور ﷺ اپنی تربت انور میں تشریف رکھتے ہیں اور جسے حسی حیات سے تعبیر کرتے ہیں۔ کوئی امر اس سے مانع نہیں ہے اور اس کیلئے رویت مثال کی تخصیص کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔" (الحاوی للفتاوی ج۲ ص۲۶۵)

حیاۃ النبی ﷺ کے مسئلے میں حضرت امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ بے غبار مسلک دلوں کا غبار دھونے کیلئے کافی ہے، اگر لوگ بریلی کی آواز سے ہم آہنگ نہیں ہو سکتے تو حضرت امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ کے پیچھے چلنے میں کیا عذر ہے؟ اور ہمارا تو اپنا حال یہ ہے کہ جس قلم سے امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے ایمان واتقان کے یہ گل بوٹے کھلائے ہیں، وہ اگر کہیں مل جائے تو ہم اسے ہونٹوں سے چومیں، آنکھوں سے لگائیں اور دلوں میں اتارلیں۔ انھوں نے جو کچھ بھی لکھا ہے اس کے پیچھے صرف عقیدت ہی کا جذبہ کارفرما نہیں ہے بلکہ وہ حقائق بھی ہیں جو مشاہدات کے مراحل سے گزر چکے ہیں، کیونکہ امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ ابن تیمیہ کی طرح اندھیری رات کے مسافر نہیں تھے، بلکہ وہ صبح تجلیات کے اُجالوں کے رہ نورد تھے، وہ عارف بھی تھے، وہ صاحب قوتِ قدسیہ بھی تھے، وہ اسرارِ غیب کے محرم اور حریم اقدس کے حاضر باش بھی تھے، اس لیے ان کا علم ان کیلئے حجابِ اکبر نہیں بن سکا۔ عقل سے زیادہ عرفان نے ان کی رہنمائی کی اور کتاب سے زیادہ صاحبِ کتاب کو انھوں نے پڑھا اس لیے سیاہ نقوش کے نہیں بلکہ اجلے حقائق کے وہ امین ہیں۔

علاجِ دلِ بیمار:

علامہ کاظمی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے اس مضمون میں جس حکیمانہ انداز میں دل کی بیماروں کا علاج کیا ہے وہ انہی کے قلم کا حصہ ہے۔ ایک جگہ نہایت حسرت کے ساتھ

ارشاد فرماتے ہیں۔

"سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ لوگ نبی کریم ﷺ کے خارق للعادۃ سننے اور دیکھنے کا اتنی شدت سے انکار کیوں کرتے ہیں جبکہ عام اولیائے کرام کے حق میں جو کثرت نوافل کے فیضان سے تقرب کے منصب پر فائز ہوتے ہیں۔ بخاری شریف کی حدیث میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد نقل کیا گیا ہے کہ میں اس کے کان ہو جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے، میں اس کی آنکھ ہو جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے، اور امام رازی کی صراحت کے مطابق حدیث کا یہ مفہوم کسی مجازی معنیٰ پر محمول نہیں ہے، بلکہ اس کے وہی معنیٰ مراد ہیں جو اس کے الفاظ سے ظاہر ہیں، امام رازی کے الفاظ یہ ہیں۔

"فاذا اصار نور جلال اللہ سمعا لہ سمع القریب والبعید واذا اصار ذالک النور بصر الہ رای القریب والبعید۔" (تفسیر کبیر ج۸ ص۳۸۸ مصری)

جلالت کبریائی کا نور جب بندے کا کان ہو جاتا ہے تو وہ دور ونزدیک کی آواز کو سنتا ہے اور جب جلالت کبریائی کا نور بندے کی آنکھ بن جاتا ہے تو وہ نزدیک ودور کی چیزوں کو دیکھ سکتا ہے۔

اس تفصیل کے بعد حضرت علامہ تنبیہ فرماتے ہیں کہ دور کی چیز کو دیکھنا اور سننا جب اولیاء کرام کیلئے دلیل شرعی سے ثابت ہے تو نبی کریم ﷺ کی ذات سے اس کمال کی نفی کیوں کی جاتی ہے، جب کہ وہ ولایت کبریٰ کے منصب پر فائز ہیں، اس کے بعد علامہ نے اس کانٹے کو بھی توڑ کر پھینک دیا ہے جو بیمار دلوں میں اکثر چبھتا ہے۔ کسی کے دل میں یہ شبہ گزر سکتا ہے کہ دور سے آوازوں کا سن لینا خدائی منصب ہے، لہٰذا یہ کھلا ہوا شرک ہے کہ یہ منصب کسی پیغمبر کیلئے تسلیم کیا جائے۔

اس شبہ کا ازالہ کرتے ہوئے علامہ نے فرمایا کہ پچھلے اوراق میں یہ حدیث گزر چکی ہے، جس میں حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ میری قبر پر اللہ تعالیٰ نے ایک فرشتہ مقرر فرمایا ہے جسے دور ونزدیک سے تمام مخلوقات کی آوازیں سننے کی طاقت دی گئی

ہے۔ اب دور کی آواز سننا اگر غیر اللہ کیلئے محال اور شرک ہے تو وہ فرشتہ بھی تو غیر اللہ ہے اسے یہ قوت کیونکر حاصل ہے؟ اس لیے کوئی وجہ نہیں ہے کہ علم وادراک کی جو قوت ایک فرشتے کیلئے شرک نہیں ہے وہ ایک پیغمبر کے حق میں کیوں شرک ہو جائے۔

حیاۃ النبی ﷺ پر اس طرح کے علمی اور مذہبی دلائل اور ذیلی مباحث سے پوری کتاب ایک مہکتے ہوئے گلشن کی طرح قاری کی نگاہوں کو سیراب کرتی ہے۔ میں نے تو صرف چند مقامات سے جلووں کی عکاسی کی ہے، آپ پوری کتاب پڑھ لیں تو اندازہ لگ جائے گا کہ اس موضوع پر حضرت علامہ نے اپنے علم وفضل اور عشق و عقیدت کے کیسے کیسے گل بوٹے کھلائے ہیں۔ (والسلام خیر الختام)

جمالِ یار کی زیبائیاں ادا نہ ہوئیں
ہزار کام لیا میں نے خوش بیانی سے





باب نمبر 2

ماضی کے جھروکوں سے

صاحبزادہ علامہ سید

حامد سعید کاظمی شاہ

زید مجدہ

ماہنامہ السعید امام اہل سنت نمبر جنوری (۲۰۰۱) صفحہ ۲۷ تا ۲۸

سابق وفاقی وزیر مذہبی امور حکومت پاکستان جگر گوشہ غزالیٔ زماں صاحبزادہ علامہ سید حامد سعید کاظمی بیان فرماتے ہیں کہ ''اباجی قبلہ جب بیماری کی شدت، ضعف اور گھٹنوں کے درد کے باعث جامعہ انوار العلوم تشریف نہ لے جاسکتے تھے تو سبق کا ناغہ کرنے کی بجائے طلباء کو گھر بلوایا کرتے تھے اور گھر پر باہر برآمدے میں باقاعدہ درس دیا کرتے تھے۔ حد یہ ہے کہ دل کے عارضے کے باعث ہسپتال میں جب ڈاکٹروں کی طرف سے ملاقاتیوں پر پابندی ہوتی تھی۔ اباجی قبلہ اس بات پر ملول رہتے تھے کہ طلباء کے سبق کا ناغہ ہو رہا ہے۔ بلکہ ایک آدھ بار تو ہسپتال میں یہ فرمایا بھی کہ اگر ڈاکٹر صاحبان اجازت دیں تو گھر کی طرح طلباء کو ہسپتال میں بلوالیا جائے تاکہ ان کا حرج نہ ہو۔

ایک بار اباجی قبلہ گھر میں طلبہ کو دورۂ حدیث پڑھا رہے تھے، میں کالج میں پڑھتا تھا۔ اس دن چھٹی تھی اور اباجی کی خدمت پر مامور تھا۔ اب مجھے یہ تو یاد نہیں کہ کون سی حدیث پر کلام ہو رہا تھا لیکن جو گفتگو میرے حاشیہ خیال میں رہ گئی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے۔ کہ بشریت اور نورانیت کے حوالے سے کوئی حدیث زیر بحث تھی۔ فرمایا'' **قل انما انا بشر مثلکم**'' پڑھ کر'' **انما**'' کے حصر پر اصرار کر کے دوسرے مکتبہ فکر کے علماء نورانیت کا انکار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جب حصر آگیا اور ہاماسوی المذکور کی نفی آگئی تو ثابت یہ ہوا کہ نبی کریم ﷺ بشر کے سوا کچھ نہیں، اس لیے نبی کو نور ماننے والے گویا قرآن کے منکر قرار پاتے ہیں اور جو قرآن کا منکر ہو مسلمان کہلانے کا حق دار نہیں، حالانکہ نورانیتِ مصطفیٰ ﷺ کا اس بے ڈھب طریقے سے انکار کرنے والوں کو قرآن مجید کے دیگر مقامات پیشِ نظر رکھنے چاہییں، قرآن مجید کی آیت ہے'' **وما محمد الا رسول**'' یہاں پر بھی تو حصر ہے، لفظ'' انما'' کے مقابلے میں نفی اثبات کے ذریعے جو حصر آتا ہے وہ زیادہ معتبر ہے۔ بلکہ یہ حصر کی انتہا ہے کہ کلمہ میں خدا تعالیٰ کی توحید کے کیلئے بھی حصر کی یہی قسم لائی گئی ہے۔ اب قرآن کی آیت دیکھیے'' وما محمد الا رسول'' حضور پاک ﷺ رسول کے سوا کچھ نہیں۔ جب حصر میں ماسوی المذکور کی نفی ہوتی ہے تو رسول ہونے کے سوا ہر چیز کی نفی ہوگی۔ تو یہاں بشرت کا بھی انکار ہو جائے گا، رسالت کے سوا ہر چیز کا انکار لازم آئے

گا، اسی طرح قرآن مجید میں ہے'' **انما حرم علیکم المیتة والدم ولحم الخنزیر وما اھل به لغیر الله**'' یہاں پر بھی حصر انما کیلئے لفظ'' **انما**'' آیا ہے اور ماسوی المذکور نفی کا حصر مدعا ہے اس کا مطلب یہی ہوا کہ اس مقام پر جو چیزیں حرام کی گئیں ان کے سوا باقی تمام چیزیں حلال ہونا چاہییں اور خنزیر کا صرف گوشت حرام ہونا چاہیے، اس کے کلیجی، گردے، اس کا مغز، سری پائے وغیرہ وغیرہ باقی تمام چیزیں بھی حلال ہونا چاہییں۔ اگر ایسا نہیں ہے تو پھر حصر کا فائدہ کیا ہے؟ لفظ'' **انما**'' کا سہارا لے کر نورانیت کا انکار کرنے والے صرف اور صرف بغض کے سبب یہ بات کر رہے ہیں۔ وگرنہ اہلِ علم جانتے ہیں کہ حصر کبھی ماسوی المذکور کی نفی کیلئے آتا ہے اور کبھی صرف زورِ بیان کیلئے اور مذکورہ شے کی اہمیت کو اجاگر کرنے کیلئے آتا ہے۔ گویا ارشادِ ربانی کا مطلب یہ ہوا کہ اگر لوگوں نے میرے محبوب کی عظمت وشان اور نورانیت کی بنا پر میرے محبوب کی تعلیمات کو اپنے لیے مشعلِ راہ نہ مانا اور یہ عذر کیا کہ وہ ہستی جو بشری تقاضوں اور انسانی ضرورتوں سے بالاتر ہو۔ اس کی تعلیمات ہمارے لیے حجت کیونکر ہو سکتی ہیں، انہیں بہر حال ملحوظ رکھنا چاہیے کہ میرا محبوب اس دنیا میں تو بشر ہی کی صورت میں آیا ہے۔ بچپن، لڑکپن، جوانی، کہولت، یہ ادوار بشر کیلئے ہوتے ہیں میرا محبوب ان تمام مراحل سے گزرا ہے، اسی طرح میرا محبوب تمہاری طرح زندگی گزارتا ہے۔ دوستوں دشمنوں کے درمیان رہتا ہے۔ دشمنوں کو زیر کرنے کے لیے مادی اور ظاہری ساز و سامان کو استعمال کرتا ہے بلکہ تمہیں سلیقہ سکھاتا ہے، اس لیے میرے محبوب کی بشریت کا انکار کر کے تم میرے محبوب کی سیرت اپنانے سے گریز کیسے کر سکتے ہو۔ اور دوسرے مقام پر جہاں وما محمد الا رسول فرمایا، اس کا مدعا یہ تھا کہ میرے محبوب کو اگر تم نے بالکل اپنے جیسا سمجھ لیا، اس کے احکام و فرامین اور اس کی رضا و ناراضگی کی پروا کرنا چھوڑ دی یا اپنی مرضی اور اپنی خواہش کو سامنے رکھ لیا۔ جس حکم کو ماننے ۔ میں فائدہ نظر آیا اس کو اپنا لیا اور جس مین تمہیں وقت اور مشکل محسوس ہوئی، اس سے منہ موڑ لیا تو یاد رکھو کہ میرا محبوب رسول کے سوا کچھ نہیں اور رسول تو وہ ہے جسے میں اپنے بندوں کی راہنمائی کیلئے بھیجتا ہوں۔ تم جب میرے محبوب کو مانتے ہو اور میرا رسول مانتے ہو تو تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ وہ رسول کے سوا کچھ نہیں۔ یعنی اس کے

دکھائے اور متعین کیے ہوئے راستے کو اختیار کرنا تمہارے لیے بہر حال ضروری ہے۔ تم اس کے حکم سے کبھی منہ نہیں موڑ سکتے۔ اور اگر ایسا کرو گے اور رسول کے فرمان اور حکم کا انکار کرو گے تو مومن کیسے ہو سکتے ہو۔ پھر جب اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب ﷺ کی بشریت کا ذکر فرمایا تو وہاں دراصل الوہیت کی نفی تھی کہ اے میرے محبوب تیری عظمت و شان اور تیری قدرت و اختیار کو دیکھ کر کہیں میرے بندے تجھے میرا شریک نہ سمجھ بیٹھیں۔ اس لیے یہ اعلان کر دے کہ اپنے تمام اختیار، کمال اور مقام و مرتبے کے باوجود خدا نہیں ہے، خدا کا شریک نہیں ہے" **الھکم الہ واحد**" فرما کر ربِ کریم نے یہ وضاحت فرما دی۔

اور دوسرے مقام پر جب اللہ نے "**وما محمد الا رسول**" فرمایا تو یہاں بھی آگے وضاحت فرمائی کہ دوسرے سول بھی آئے ہیں۔ اس کارزارِ حیات میں رہے ہیں، پھر ان پر موت کا قانون طاری ہوا ہے اور انھوں نے دنیا سے پردہ کیا ہے تو میرا محبوب بھی اس قانون سے بالاتر نہیں، یہ قانون تو اس پر بھی لاگو ہوگا چاہے ایک آن ہی کیلئے ہو۔ رسالت کا ذکر ہوا تو یہاں بھی الوہیت کی نفی مقصود تھی۔

گویا اس بات کو یوں بھی کہاں جا سکتا ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ اپنے محبوب کی بشریت کا ذکر فرمائے یا رسالت کا، بندوں کیلئے وضاحت و صراحت یہی ہوتی ہے یہ میرا محبوب ہے، میرا شریک نہیں۔"



بسم اللہ الرحمن الرحیم

باب نمبر 3

لفظِ بشر کی تحقیق

از خلیل احمد رانا

جہانیاں

ماہنامہ السعید امام اہل سنت نمبر دسمبر ۲۰۰۱ صفحہ ۵۵ تا ۵۶

خلیل احمد رانا، جہانیاں سے بیان فرماتے ہیں کہ ضیغم اسلام علامہ سید احمد سعید کاظمی امروہوی محدث ملتانی قدس سرہٗ العزیز (المتوفی ۱۹۸۶ء) نے اپنی دنیاوی زندگی کے آخری سالوں میں قرآن مجید کا اردو زبان میں ترجمہ فرمایا، قرآن مجید کے بہت سے اردو تراجم مارکیٹ میں موجود ہیں، مگر حضرت سیدی علامہ کاظمی رحمۃ اللہ علیہ نے جو ترجمہ فرمایا ہے، ایک عجیب شاہکار ہے، بڑے بڑے اختلافی مسائل کو صرف ترجمہ میں حل فرما دیا ہے۔ مثلاً سورۃ الکہف کی آیت نمبر ۱۱۰ " **قل انما انا بشر مثلکم یو حی الی انما الھکم الہ واحد** " اے حبیب کافروں سے فرما دیجیے، (الوہیت کا مدعی نہیں بلکہ معبود نہ ہونے میں) تم جیسا ہی بشر ہوں میری طرف وحی کی جاتی ہے کہ (میرا اور) تمہارا معبود ایک ہی ہے۔ (ترجمہ قرآن البیان، مطبوعہ ملتان ۱۹۸۷ء ص ۳۹۴)

اس آیت مبارکہ میں تین جملے ہیں۔

۱) **قل انما انا بشر مثلکم**، فرما دیجیے میں تم جیسا ہی بشر ہوں۔

۲) میری طرف وحی کی جاتی ہے۔

۳) **انما الھکم الہ واحد** (میرا اور) تمہارا معبود ایک ہی ہے۔

ان تینوں جملوں میں مناسبت و تعلق ضروری ہے ورنہ کلام الٰہی فصاحت و بلاغت سے بے ربط ہو جائے گا اور یہ محال ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کلام فصاحت و بلاغت اور ربط و مناسبت سے خالی ہو۔

اگر کوئی پہلے جملہ سے کلی مماثلت مراد لے کر کہے حضور نبی کریم و ﷺ ہر بات میں ہم جیسے ہیں تو یہ درست نہیں کیونکہ آیت کے دوسرے جملہ نے اس کو رد کر دیا، فرمایا " میری طرف وحی آتی ہے، اب دیکھیے ہماری طرف تو وحی نہیں آتی تو حضور ہماری طرح تو نہ رہے، جو لوگ مماثلت کلی مراد لیتے ہیں تو ان کو تو آیت کے دوسرے جملے نے ہی لاجواب کر دیا، آیت کے تیسرے جملہ نے مسئلہ حل کر دیا کہ معبود اور الہ

ہونے میں، میں تمہاری مثل ہوں، جو تمہارا معبود ہے وہی میرا معبود ہے تو جنھوں نے مثلیت کلی کا دعویٰ کیا، انھوں نے قرآن کریم کو بے ربط مانا۔

جو لوگ کہتے ہیں کہ حضور نبی کریم ﷺ ہماری ہی مثل بشر ہیں تو اس کا مطلب ہوا کہ جس طرح ہمارے اندر بشریت کے عیب ہیں، حضور نبی کریم ﷺ کے اندر بھی بشریت کے عیب ہیں، (معاذ اللہ) قرآن کریم کی اس آیت کے یہ معنیٰ نہیں ہیں بلکہ اسکے معنیٰ یہ ہیں کہ جو انبیاء علیہم السلام تشریف لائے تو لوگوں نے ان انبیاء کرام ک علیہم السلام ے دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد ان کی الوہیت کا اعتقاد پیدا کرلیا ان کی پوجا کی، ان کی عبادت کی، ان کو معبود مانا، یہی وجہ تھی کہ لوگوں نے بعض انبیاء کرام سے وہ سوالات کیے جو سوالات الہٰ سے کیے جاتے ہیں بلکہ خود حضور نبی کریم ﷺ سے بھی ایسے سوالات کیے جو اللہ تعالیٰ سے کرنے چاہییں، مثلاً مشرکین عرب نے سوال کیا کہ آپ آسمان پر چڑھ جائیں اور وہاں سے ہم پر ایک کتاب نازل کریں اور وہ کتاب ایسی ہو کہ آپ اسے نازل کریں اور ہم اسے نازل ہوتی دیکھیں۔

اب دیکھئے کتاب نازل کرنا اللہ تعالیٰ کا کام ہے یا رسول اللہ ﷺ کا؟ ظاہر ہے کہ کتاب نازل کرنا تو اللہ تعالیٰ کا کام ہے۔ " **تنزیل من رب العلمین** " تو انھوں نے رسول سے مطالبہ کیا جو اللہ تعالیٰ سے کرنا چاہیے، انھوں نے رسول اللہ ﷺ کی الوہیت کو رسالت کیلئے لازم قرار دیا ان کا مفہوم یہ تھا کہ جو رسول اللہ کا کام نہ کر سکے وہ رسول نہیں ہو سکتا تو انھوں نے الوہیت اور رسالت میں کوئی فرق نہ رکھا۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا " **قل انما انا بشر مثلکم** " یعنی میرے محبوب فرما دیجیے جیسے تمہارا معبود ہونا محال ہے ویسے ہی میرا معبود ہونا بھی محال ہے۔ تو فقط یہ مماثلت معبود نہ ہونے میں ہے ورنہ یہ نہیں ہے کہ جیسے ہمارے اندر عیب ہیں۔ (معاذ اللہ) حضور ﷺ میں بھی عیب ہوں، اللہ تعالیٰ نے قرآن میں صاف صاف بیان فرما دیا کہ میرے محبوب کی اطاعت تم پر فرض ہے " **قل ان کنتم تحبون اللہ**

فاتبعونی یحببکم اللہ" اللہ تعالیٰ سے محبت کے دعویٰ کی دلیل یہ ہے کہ تم ان کی ہر بات کو مانو، ان کے ہر قول کو مانو، ان کے ہر حکم کو مانو، اگر معاذ اللہ وہ ہمارے جیسے خطا کار ہوں تو جس طرح ہماری کوئی بات دلیل نہیں ہوسکتی، اسی طرح رسول کی بھی کوئی بات دلیل نہ ہو، لیکن رسول کی تو ہر بات دلیل ہے، معلوم ہوا کہ ہم غلطیوں کے مجتمع ہیں، ہم سے غلطی ہوسکتی ہے مگر رسول سے غلطی نہیں ہوسکتی، یہی وجہ ہے کہ ہماری بات حجت نہیں، ہماری بات دلیل نہیں، رسول کی ہر بات دلیل ہے، رسول کہے تو دلیل، رسول کرے تو دلیل اور رسول کچھ بھی نہ کریں اور چپ رہیں تو خدا کی قسم ان کا خاموش رہنا بھی دلیل ہے، اس لیے حضور ﷺ کے بارے میں قرآن کی آیت کا یہ معنیٰ بیان کرنا کہ وہ ہمارے جیسے عیب دار بشر ہیں، غلط ہے، لاحول ولاقوۃ الا باللہ۔

قرآن کریم میں جو یہ فرمایا ہے کہ فرما دیجیے میں تم جیسا بشر ہوں، یہاں بشر فرمانے میں مماثلت کلی مراد نہیں ہے، بخاری و مسلم کی حدیث ہے، حضور ﷺ وصال کے روزے رکھتے تھے، صحابہ کرام نے دیکھا کہ حضور ﷺ صوم وصال رکھتے ہیں، ہم بھی رکھیں، بعض صحابہ نے صوم وصال رکھا اور بے ہوش ہوکر گر پڑے، حضور ﷺ نے دیکھا ہے کہ انھوں نے صوم وصال رکھا ہے تو آپ نے فرمایا "ایکم مثلی" تم میں میری مثل کون ہے؟ دوسری جگہ فرمایا "**لست کا ھد مکن**" اور ایک جگہ فرمایا "**انی لست مثلکم**" یعنی میں تمہاری طرح نہیں، میں تمہاری مثل نہیں ہوں۔ صحابہ کرام نے یہ نہیں فرمایا کہ یا رسول اللہ ﷺ قرآن تو کہتا ہے "**بشر مثلکم**" اور نہ ہی صحابہ کرام نے مثلیت کا دعویٰ کیا۔ پتہ چلا کہ اگر حضور ﷺ ہماری مثل ہیں تو معبود نہ ہونے میں، ہمارا معبود ہونا بھی محال ہے اور آپ ﷺ کا معبود ہونا بھی محال ہے، بشریت کے امور میں آپ ﷺ ہماری مثل نہیں ہیں اور نہ ہم آپ ﷺ کی مثل ہیں نہ آپ کے کھانے میں، نہ آپ کے پینے میں، نہ چلنے پھرنے میں، نہ سونے جاگنے میں، آپ ﷺ سو جائیں تو آپ کی نیند ناقص وضو نہیں، میرے آقا ﷺ

چوبیس گھنٹے سوتے رہیں میرے آقا ﷺ کا وضو نہیں ٹوٹتا، یہ اس لیے کہ میرے آقا ﷺ بشریت کے امور میں ہماری مثل نہیں ہیں۔"



بسم اللہ الرحمن الرحیم

باب نمبر 4

میدانِ مناظرہ کے شہسوار

علامہ
سراج احمد سعیدی قادری
اُوچ شریف

ماہنامہ السعید امام اہل سنت نمبر دسمبر ۲۰۰۱ صفحہ ۷۷ تا ۸۱

غزالئی زماں کے فن مناظرہ کے بارے فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری نبی سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ کے دین اسلام کی بقاء اوراس کی حقانیت وصداقت کا لوہا منوانے کیلئے اوراس پر باطل قوت کے متوقع حملوں سے بچاؤ کیلئے جلیل القدر مناظر پیدا کردیئے ہیں جنھوں نے خداداد علم وعقل اوردانش وبصیرت کے ساتھ اورحسنِ تکلم و ہوش ربا تفنن سے اپنے مدمقابل کومبہوت ومخبوط کردیا۔ عہدِ رسالت مآب ﷺ سے لے کر آج تک کوئی دورایسانہیں گزرا جس میں یہ اسلام کے معاون، مددگار نہ ہوئے ہوں، اگران حضرات کے اسماء کو گنا جائے تو اس کیلئے بھی دفتر درکار ہے اس مضمون میں ہم گذشتہ صدی کے بہت بڑے مناظراوردین متین کے حامی، ناصر الملک والملۃ، شیخ الاسلام، غزالئی زماں، رازی دوراں، امام اہلسنت، سیدنا ومرشدنا حضرت علامہ سیداحمد سعید کاظمی رحمۃ اللہ علیہ کے ایک مناظرہ کا تذکرہ کرتے ہیں۔

امام اہلسنت، غزالئی زماں رحمۃ اللہ علیہ بیک وقت پیشوائے طریقت بھی تھے اورعظیم المرتبت شیخ المحدثین بھی، جلیل القدر مفسر بھی تھے، اورفقہ کی کلیات وجزئیات پر دسترس رکھنے والے مفتی بھی۔ منطق وفلسفہ کے شہنشاہ تھے تو علم معانی وبیان وبدیع کے بادشاہ، آسمان علم وتحقیق کے آفتابِ لازوال تھے تو عربی خوانی وعربی دانی میں بے مثال فصاحت وبلاغت کے میدان کے شہسوار تھے تو دنیائے رشد وہدایت کے نیر اعظم، شریعت وطریقت کے امتزاج کا حسین مرقع تھے تو ملک معرفت وحقیقت کے تابندہ چراغ، سیرتِ رسول اللہ ﷺ کے عملی نمونہ تھے تو غواص بحرِ توحید، ان خوبیوں کے حامل ہمارے شیخ طریقت ومعلم حقیقت میں تکبر، غرور، عجب، نخوت، سنگ دلی وبزدلی نام کی کوئی شے نہ تھی۔ ہمارے حضرت پیکر تواضع، مجسمۂ محبت، سراپا رحمت وشفقت، اپنے بیگانے ہر ایک کے ہمدرد وخیرخواہ تھے اورسیرت رسول اللہ ﷺ کا سچا نقشہ اور کھری تصویر تھے۔

اللہ تعالیٰ نے جہاں آپ کو ان خوبیون اور کمالات جلیلہ سے سرفراز رفرمایا تھا

وہاں آپ کو اللہ تعالیٰ نے اسلام کا بہت بڑا مناظر بھی بنایا تھا، میدانِ مناظرہ میں آپ کی گفتگو، اور گرفت، نہایت مضبوط و مستحکم ہوتی تھی۔ متانت و سنجیدگی حلم و حوصلہ قابلِ دید ہوتا تھا۔ شیریں تبسم قابلِ رشک ہوتا تھا بلکہ کبھی کبھار بذاتِ خود ایسے اعتراض مد مقابل کی جانب سے اپنے اوپر وارد کر دیتے تھے کہ خود مدمقابل بھی ورطۂ حیرت میں ڈوب جاتا تھا اور جب اس کا جواب عنایت کرتے تو سامعین و حاضرین بلا ساختہ عش عش کر اٹھتے۔ خواص و عوام یکساں محظوظ و مستفیض ہوتے، علماء کرام کی حالت قابلِ دید ہوتی اور جواب بالصواب پا کر ان کی عقلیں دنگ ہو جاتی تھیں۔

یہاں ہم صرف ایک مناظرہ کی مختصر روئیداد پیش کرنے کی سعادت حاصل کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے سطور بالا میں لکھا ہے اس کی حقیقت کو کھولنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ مناظرہ ضلع مظفر گڑھ کے نواحی ضلع لیہ میں منعقد ہوا۔ وہاں کے ایک مماتی مولوی، جو دیوبندی شیخ الہند مولوی محمود الحسن صدر مدرس مدرسہ دیوبند کے قابل ترین شاگردوں میں تھے۔ اس مماتی مولوی صاحب نے، یہ کہنا شروع کیا کہ بعد از موت انبیاء کو کسی قسم کا علم و ادراک نہیں ہوتا اور وہ مرنے کے بعد قبر میں ہوتے ہیں، معاذ اللہ۔ جب ان کا قبر میں یہ حال ہے تو ان سے کم درجہ والے کیونکر علم و ادراک کے متحمل ہو سکتے ہیں، (آج کل بھی ایسا کہنے والوں کی کمی نہیں) حضور غزالی زماں رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے بھی اس نے اپنے اس عقیدے کا اظہار بڑے جوش و جذبے سے کیا اور دلیل کے طور پر قرآن مجید کی درج ذیل آیت سے استدلال پیش کیا۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں " **او کالذی مر علی قریۃ وھی خاویۃ علی عروشھا** " (سورۃ بقرہ، آیت نمبر ۲۵۹) اس مولوی نے آیت کا ترجمہ کرتے ہوئے کہا کہ " اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے، عزیر علیہ السلام جو اللہ تعالیٰ کے نبی تھے وہ ایک بستی سے گزرے وہ بستی گری پڑی تھی اپنی چھتوں سمیت، تو اس نبی نے کہا اس بستی والوں کو مرنے کے بعد اللہ تعالیٰ کیسے زندہ کرے گا تو اللہ تعالیٰ نے اس نبی کو سو سال تک مار دیا

دیا پھر اس کو زندہ کیا اور پوچھا تو کتنی مدت مرا رہا اس نے کہا پورا دن یا دن کا کچھ حصہ، اللہ تعالیٰ نے فرمایا بلکہ تو سو سال مرا رہا تو اپنے گدھے کو دیکھ جس کی ہڈیاں سالم نہیں ہیں۔

ترجمہ کرنے کے بعد اس نے کہا کاظمی صاحب! کی موجودگی میں ایک حقیقت پیش کر رہا ہوں، جس کا انکار کوئی نہیں کر سکتا میرا استدلال بالکل واضح ہے اگر حضرت عزیر علیہ السلام کو مرنے کے بعد علم ہوتا تو وہ کہتے کہ میں سو سال تک یہاں رہا ہوں ان کا یہ کہنا کہ ایک دن یا دن کا کچھ حصہ میں یہاں رہا ہوں تو صراحتاً اس بات کی دلیل ہے کہ انبیاء کرام کو مرنے کے بعد کوئی علم و ادراک نہیں ہوتا۔

(۲) دوسری بات یہ ہے کہ عزیر علیہ السلام نے کہا " **یوما او بعض یوم** "، کوئی حتمی و پکی بات نہ کہہ سکے بلکہ " **او** " کہہ کر شک و تردد میں مبتلا ہو گئے۔ اگر ان کو علم و ادراک ہوتا تو وہ " **او** " کا استعمال کبھی نہ کرتے، یہ میرے موقف کی دوسری دلیل ہے جو میں نے اللہ کے قرآن سے پیش کر دی ہے۔ جب مرنے کے بعد نبیوں کی یہ حالت ہے، ان سے کم درجہ والا کب علم و شعور کا متحمل ہو سکتا ہے؟

(۳) تیسری بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا " **بل لبثت مائۃ عام** " یہاں بل ابطالیہ ہے اور یہ میری تیسری دلیل ہے جب اللہ تعالیٰ نے نبی کے قول کی تردید کر کے اس کو باطل کر دیا تو کون ہے جو ان کا علم و ادراک ثابت کر سکے لہٰذا ہمارا ایمان و عقیدہ بالکل قرآن اور فرمانِ الٰہی کے مطابق ہے انبیاء کرام بعد از مرگ علم و ادراک و شعور سے یکسر خالی ہوتے ہیں۔ ایسے جس طرح جماد، مٹی، پتھر۔ اگر کاظمی صاحب کو قرآن کے خلاف کچھ کہنے کی ہمت ہے تو میں میدان گو میں ان کو چیلنج دیتا ہوں کہ انھیں اور ہمیں بتائیں وہ اور ان کی جماعت کیا کہتے ہیں۔

مناظرِ اسلام کی جوابی تقریر " غزالی زماں، مناظرِ اسلام، اپنی عادت مبارکہ کے مطابق مسکرا کر اٹھے اور خود بھی درود شریف پڑھا اور حاضرین کو بھی پڑھنے کا حکم دیا،

درود شریف پڑھنے کے بعد آپ نے انتہائی تحمل کے ساتھ اور خوبصورت انداز میں جارحانہ وفاتحانہ اقدام کے تحت دیوبندی مولوی مماتی کی دلیلوں کے بخئے ادھیڑنے شروع کیے کہ مولوی مماتی مبہوت، مخبوط اور حیران وسرگرداں نظر آنے لگے۔

آپ نے فرمایا ''مسلمانو! میرے مدمقابل مماتی مولوی نے آپ کو یہ تاثر دینے کی بھونڈی حرکت اور نہایت مذموم کوشش کی ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا اور قرآن کہتا ہے کہ بعد از وصال، اللہ کے نبی عزیر علیہ السلام کو کوئی علم وشعور نہ تھا۔

اور تعجب یہ ہے کہ بناء الفاسد علی الفاسد کے طور پر مماتی مولوی یہ کہتا چلا گیا کہ جب انبیاء کرام کو وصال کے بعد کوئی علم کوئی ادراک کوئی شعور نہیں ہوتا تو ولیوں کو مرنے کے بعد علم وشعور کیسے ہوسکتا ہے اور ان سے کم درجے والے لوگ علم وادراک کیسے پاسکتے ہیں؟

مماتی مولوی جی نے انبیاء کرام اور اولیاء کرام اور ان کے علاوہ دوسرے لوگوں کو ایک ہی صف میں کھڑا کرکے ان کے فوت ہوجانے کے بعد ان کے علم وشعور کی نفی کردی ہے اور دلیل کے طور پر قرآن مجید کی آیت مبارکہ کو اور خود اللہ تعالیٰ کو پیش کردیا ہے اور انھوں نے آیت کے تین حصوں کو اپنی دلیل بنالیا ہے۔

غور سے سنو!

پہلی بات میں یہ عرض کروں گا کہ جو آیت کریمہ مدمقابل نے آپ کے سامنے پڑھی۔ اس کا آغاز ''**او کالذی**'' سے ہوتا ہے۔ میرا پہلا سوال اپنے مدمقابل سے یہ ہے کہ کس کتاب اور کس لغت میں ہے کہ ''**الذی**'' کا معنی عزیر علیہ السلام ہوتا ہے؟ اگر وہ یہ کہیں کہ الذی کا معنی عزیر علیہ السلام نہیں ہوتا بلکہ تفسیروں میں ہے کہ ''الذی'' سے مراد عزیر ہیں تو پھر میں ان سے یہ سوال کروں گا کہ جب ایک بات قرآن مجید میں نہیں تھی تو اس کو انھوں نے بذاتِ خود قرآن مجید سے منسوب کرکے، مسلمانوں کو فریب ودھوکہ دینے کی جسارت کیونکر کی؟ اور اس بات کو تفسیر سے منسوب کرتے تو حق بجانب

ہوتے۔ مگر انھوں نے کہا کہ قرآن مجید کہتا ہے کہ وہ عزیر علیہ السلام تھے۔ اللہ کہتا ہے وہ عزیر تھے۔ اگر وہ یہ کہیں کہ جب ایک بات بھی تفاسیر میں آگئی تو ان کا مدعا ثابت ہوگیا؟

میں اس کا جواب یہ دیتا ہوں کہ بیشک اہلِ تفاسیر نے ایک قول یہ بھی لکھا ہے کہ اس ویران بستی سے گزرنے والے اور ''**انی یحی هذه الله بعد موتها**'' فرمانے والے حضرت عزیر علیہ السلام تھے لیکن اس آیت مبارکہ کے تحت ایک اور قول بھی تفاسیر معتبرہ میں مرقوم ہے، دنیائے اسلام کا مستند مفسر امام فخر الدین رازی رحمۃ اللہ علیہ ان کی تفسیر کبیر میرے ہاتھوں میں آپ کے سامنے ہے اس میں لکھا ہے کہ اس ویران بستی سے گزرنے والا شخص کافر تھا۔ ''**فقال قوم كان رجلا كافرا**'' تفسیر کبیر طبع ایران، پ۳ تحت آیت ''**او کالذی مر علی قریة**'' افسوس کی بات یہ ہے کہ میرے مدمقابل نے صرف اسی بات پر عزم بالجزم کرلیا ہے کہ وہ صرف حضرت عزیر علیہ السلام ہی تھے، کتنا بہت بڑا افراڈ ہے، دیکھو جب ایک واقعہ کے بارے میں دو شخصوں کے قول سامنے آگئے تو مولوی جی کی پیش کی ہوئی دلیل قطعی اور یقینی نہ رہی، اور حیاۃ بعد الوفاۃ کی نفی کے بارے میں مولوی جی کا استدلال باطل ولایعنی ہوگیا اور قاعدہ یہ ہے کہ ''اذا جاء الاحتمال الاستدلال'' جب احتمال وشک پیدا ہوجائے تو استدلال باطل ہوجاتا ہے، مولوی صاحب کا یہ قول کہ ''**الذی**'' کا مصداق صرف حضرت عزیر علیہ السلام ہیں اور دوسرے قول کو شیر مادر جان کر ہضم کرجانا تو ایک کافر شخص کے بارے میں اس پر عذاب الیم کے سوا اور کچھ نہیں۔ مولوی صاحب کے طرز خطاب سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ (معاذ اللہ) عزیر علیہ السلام کو کافر تصور کرتے ہیں، اور ''**الذی**'' سے مراد اللہ کا پیغمبر مانتے ہیں تو اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ معاذ اللہ، مولوی صاحب ایک کافر شخص کیلئے نبوت کا اقرار کرتے ہیں، کیونکہ ابھی ابھی یہ قول آپ نے دیکھا ہے کہ ''الذی'' سے مراد ایک کافر شخص تھا۔ (پناہ بخدا نقل کفر کفر نہ باشد)

مولوی جی! آپ نے اپنے خود ساختہ عقیدے کو ہوا دینے کیلئے نہایت توہین

آمیز رویہ اپنا کر اللہ کے مقدس نبی اور ان کے منصب نبوت پر وار کرنے شروع کر دیے ہیں، خوب یاد رکھو، جس طرح نبی کو کافر کہنا کفر ہے۔ اسی طرح کافر کو نبی کہنا بھی کفر ہے مولوی جی آپ نے دونوں باتوں کا ارتکاب کرلیا ہے اور اسلام میں یہ دونوں باتیں کفر ہیں۔ لہٰذا آپ جلدی توبہ کریں اور اللہ تعالیٰ سے اس جرم عظیم کے ارتکاب کی معافی مانگیں (یہ سن کر مولوی جی کی ہوش کے طوطے اڑ گئے) آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ اگر (الذی) سے مراد حضرت عزیر علیہ السلام ہیں تو یہ آیت ان کے بعد از وصال، شعور وعلم وادراک وآگاہی کا روشن ثبوت ہے۔ مولوی صاحب آپ نے اپنی کم علمی اور نافہمی کی بناء پر اس آیت سے غلط مطلب کرید لیا ہے۔ (الذی) سے مراد حضرت عزیر علیہ السلام والے قول کو تسلیم کرلیا جائے تو اس سے ثابت نہیں ہوتا آپ نے کہا ہے کہ مرنے کے بعد ان کو کوئی علم نہیں تھا تو سوال پیدا ہوا کہ جس کو کسی بات کا علم نہ ہو اس سے سوال کرنا اور کوئی بات دریافت کرنا کیسے صحیح ہوگا؟ اگر حضرت عزیر علیہ السلام کو اس عرصہ میں علم نہیں تھا تو اللہ تعالیٰ نے ان سے کیوں پوچھا؟ کیا جماد، مٹی، پتھر سے کوئی پوچھتا ہے؟ نہیں، اگر وہ (معاذ اللہ) اس طرح تھے تو ان سے علم کی بات پوچھنا غلط بات نہیں ہوگا؟ اہلِ اسلام کے نزدیک اللہ تعالیٰ کا ان سے یہ سوال کرنا ”**کم لبثت**“ حضرت عزیر علیہ السلام کے علم وادراک شعور آگاہی کی روشن اور واضح دلیل ہے۔

شاید کوئی یہ کہے کہ اللہ تعالیٰ جو کام کرے اس پر کوئی اعتراض نہیں کرسکتا کہ اللہ تعالیٰ نے یہ کیوں کیا، تو میں عرض کروں گا، اگر آیت سے یہ مطلب نکالا جائے تو اللہ تعالیٰ جل جلالہ کی حکمت پر دھبہ آئے گا، اور اللہ تعالیٰ کی ذات ہر عیب سے منزہ ہے اور اس کا ہر کام نہایت حکمت پر مبنی ہے اور جو علم وادراک سے خالی ہو اس سے علم کی بات پوچھنا حکمت کے تقاضے کے خلاف ہے اور جو بات حکمت کے تقاضے کے خلاف ہو اس بات کو اللہ تعالیٰ کی ذات سے منسوب کرنا حماقت اور ظلم ہے۔ معلوم ہوا یہ سوال

اس سے کیا جارہا ہے جو علم وادراک کے دامن سے وابستہ ہے۔

مولوی جی! کان کھول کر سن لو۔ یہاں دو چیزیں ہیں، سائل اور مسئول عنہ، سائل کا سوال ہی اس بات کی دلیل ہے کہ مسئول عنہ صاحب علم وادراک ہے کیونکہ سوال کرنے والا **علیم بذات الصدور، خبیر بما تعملون** اور حکیم ہے، اس نے اپنی حکمت کے تقاضے کے ساتھ سوال لکھا ہے، یہ سوال ہی حضرت عزیر علیہ السلام کے علم وادراک کی دلیل ہے، دیکھیے اگر حضرت عزیر کو علم نہ ہوتا وہ خاموش ہوجاتے یا عرض کرتے، اے اللہ میں تو مرا پڑا تھا اور مرنے کے بعد مٹی اور پتھر اور جماد ہوگیا تھا، میں کیا بتاؤں مجھے کوئی علم نہیں، مگر وہ تو کہتے ہیں اے مالک! میں یہاں ایک دن ٹھہرا ہوں یا دن کا کچھ حصہ۔

”**لبثت یوما اوبعض یوم**“ پتا چلا کہ حضرت عزیر علیہ السلام اپنے علم و ادراک کا اعتراف کر رہے ہیں اور یہ بتا رہے ہیں کہ محبوبانِ خدا بعد از وصال بھی علم و ادراک کی دولت سے مالا مال ہوتے ہیں، اللہ تعالیٰ کا ”کم لبثت“ فرمانا اور عزیر علیہ السلام کا ”**لبثت یوما او بعض یوم**“ عرض کرنا، ان کے علم وادراک کی بین اور واضح دلیل ہے، مولوی جی، جس آیت سے آپ نے محبوبانِ الٰہی کو بعد از وصال بے خبر ہونے کی دلیل سمجھا، وہ تو ان کے علم وشعور کی عظیم المرتبت دلیل ثابت ہوگئی ہے، لیکن۔

ناطقہ سر بگریباں اسے کیا کہیے

مولوی جی! آپ نے کہا تھا کہ ”او“ شک کیلئے آتا ہے، عزیر علیہ السلام کا یہ کہنا ”**یوم او بعض یوم**“ شک پر دلالت کرتا ہے، کیونکہ صحیح مدت کا ان کو علم نہیں تھا، اس کا جواب میں میں کہوں گا کہ اس آیت کی ابتداء بھی ”**او**“ سے ہوئی ”**او کالذی مر علی قریة**“ دیکھو آیت کے اول میں ”**او**“ موجود ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے یعنی اس کا اپنا مقولہ ہے، بتاؤ کیا یہاں بھی ”**او**“ شک کیلئے آیا ہے (مولوی جی

ہیں کہ نہ اگلتے ہیں اور نہ ہی نگلتے) آپ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا "میں کہتا ہوں او ہمیشہ شک کیلئے نہیں آتا۔ اور عزیر علیہ السلام کا او کہنا شک کیلئے ہرگز نہیں بلکہ تاخیر کیلئے ہے یعنی "او بعض یوم" سے مراد یوم مقرر کا جز نہیں بلکہ مراد یہ کہ میں اتنی دیر ٹھہرا ہوں کہ مدت قلیلہ تھی اور معنیٰ یہ ہوں گے کہ اے اللہ میں تو مدت قلیلہ ٹھہرا ہوں، مولوی جی! آپ نے تو اللہ تعالیٰ کے نبی کو شک میں مبتلا کر کے اپنے ایمان کا جنازہ نکال دیا کہاں شک اور کہاں تاخیر، کیا آپ شک اور تاخیر کے فرق میں امتیاز نہیں کر سکتے؟ **فیا للعجب**۔

مولوی صاحب! آپ نے آخر میں نبی کی بے خبری ظاہر کرنے کیلئے کہا تھا کہ" بل" ابطالیہ ہے، اللہ تعالیٰ نے عزیر علیہ السلام کی عرض پر فرمایا" **بل لبثت مائة عام**" بلکہ تم اس حالت میں سو برس تک ٹھہرے رہے ہو، یہ امر مسلم ہے کہ بل، ابطال کیلئے آتا ہے، اور اللہ تعالیٰ کا "بل" فرمانا، عزیر علیہ السلام کے قول کو باطل قرار دینا ہے، جس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ قلیل مدت والا قول باطل ہے (العیاذ باللہ تعالیٰ) اور یہ قول حضرت عزیر علیہ السلام کا ہے جو واقع کے مطابق نہیں اور جو بات واقع کے مطابق نہ ہو کذب ہے، جبکہ کلام کا واقع کے مطابق ہونا صدق ہے اور واقع کے مطابق نہ ہونا کذب ہے، مولوی جی نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ نبی نے واقع کے مطابق قول نہ کر کے کذب کا ارتکاب کیا ہے۔ (معاذ اللہ)

آپ نے فرمایا مولوی جی! سن لو اللہ کا نبی نہ تو قصداً جھوٹ بولتا ہے اور نہ ہی بلا قصد۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ آیت کے یہ معنیٰ ہرگز نہیں جو آپ نے تراش کر کے ہمارے سامنے پیش کر دیے ہیں۔ بالفرض آپ کی اس تراش کو تسلیم کر لیا جائے تو حضرت عزیر علیہ السلام کی ذات ستودہ صفات کی طرف کذب منسوب ہوگا۔ اور کذب وصف نبوت کے معنیٰ کے منافی ہے، جھوٹا ہرگز نبی نہیں ہو سکتا لہٰذا آپ نے آیت کے معنیٰ غلط کر دیے ہیں، مولوی جی! سن لو۔ ہمارے نزدیک، اللہ تعالیٰ اس بات پر قادر ہے کہ وہ بے نیاز ایک امر کو دو واقعوں کی شکل میں ظاہر فرما دے، حقیقت یہ ہے کہ مدت تو سو برس تھی مگر اللہ تعالیٰ نے اس مدت کو

حضرت عزیر علیہ السلام کیلئے اپنی قدرت سے اتنا چھوٹا کر دیا کہ وہ ان کیلئے" **یوم او بعض یوم**" بن گئی۔ آپ نے معاذ اللہ جھوٹ کا ارتکاب نہیں کیا بلکہ اپنے حسب حال واقعہ عرض کر دیا، اور اللہ تعالیٰ جل جلالہ کا ارشاد اس حقیقت کے مطابق ہے جو جہاں والوں پر گزرا۔ لہٰذا حضرت عزیر علیہ السلام کا قول بھی سچا ہے، اور ارشاد باری تعالیٰ بھی حق وصداقت کی روشن دلیل ہے، دیکھو قیامت کا دن پچاس ہزار سال کا ہوگا، قرآن مجید میں ہے" **کان مقدارہ خمسین الف سنه**" اس دن کی مقدار پچاس ہزار سال ہے، دوسرے مقام پر" **وما امر الساعة الا کلمح البصر هوا اقرب ان الله علیٰ کل شی قدیر**" اور قیامت کا معاملہ نہیں ہے مگر ایک پلک جھپکنے کی طرح بلکہ وہ اس سے بھی قریب تر ہے بیشک جو اللہ تعالیٰ چاہے اس پر قادر ہے۔

مولوی صاحب! ذرا بتاؤ کس آیت کو سچا مانتے ہو اور کس کو جھوٹا؟ خوب یاد رکھو۔ ہمارے نزدیک دونوں آیتیں سچی ہیں، قیامت کا دن کفار و مشرکین کیلئے ۵۰ ہزار سال کی مقدار کے برابر ہوگا۔ اور محبوبانِ خدا، انبیاء و مرسلین اور ان کے غلاموں کیلئے اس کی مقدار آنکھ کے برابر ہوگی۔ یہی حال ہے اس واقعہ کا۔ جس میں حضرت عزیر علیہ السلام نے" **یوم او بعض یوم**" کہا۔ اور اللہ تعالیٰ نے" **بل لبثت مائة عام**" فرمایا اور ایمان لائے اور یقین کر لیجیے کہ اللہ جل جلالہ وعم نوالہ کا ارشاد اصل واقع کے مطابق ہے اور حضرت عزیر علیہ السلام کا کلام ان کے اپنے کلام اپنے علم وشعور اور ادراک و آگاہی کے عین موافق ہے اس بات کو سمجھنے کیلئے قرآن مجید واحادیث صحیحہ کی روشنی میں ایک مثال اور پیش کرتا ہوں۔

دیکھو! واقعہ معراج، جو ہمارے پیارے رسول ﷺ کا روشن ترین معجزہ ہے، جس کا ذکر قرآن نے بایں الفاظ کیا ہے" **سبحٰن الذی اسرٰی بعبدہٖ لیلا**" عیب سے پاک ہے وہ جو لے گیا اپنے مقدس عبد کو رات کے تھوڑے حصے میں مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک، مسجد اقصیٰ میں تمام انبیاء کرام کو نماز پڑھانا، وغیرہ آسمانوں پر جانا انبیاء و ملائکہ سے ملاقات کرنا بیت المعمور جانا، سدرۃ المنتہیٰ پر جانا، عرش پر جا کر ٹھہرنا، لامکان اور لامنتہیٰ

قربِ خدا، دیدار رب العلیٰ سے سرفراز ہونا، نمازیں لینا احکامات سننا پھر واپس آنا اور آسمان ششم پر حضرت موسیٰ علیہ اسلام کے مشورہ وامداد وتوسل سے نو بار نمازوں کی تخفیف کیلئے جا کر یہ ثابت کرنا کہ کوئی ایسا نہیں جو کسی نماز کا ایک سجدہ کم کرا سکے لیکن ہمارے رب ذو الجلال سے ایسا تعلق محبت وعقیدت ہے کہ ہم چاہیں تو نمازیں معاف ہو جائیں اور واپس مکۃ المکرمہ میں تشریف لانا کہ جب آئے تو جس پانی سے وضو کیا تھا چل رہا ہے، جس گھر کا دروازہ کھول کر گئے تھے اس کی کنڈی ہل رہی ہے، جس بستر سے اٹھ کر گئے تھے ابھی تک گرم ہے، کیا خوب فرمایا امام المسلمین حضرت الشاہ احمد رضا خان قادری بریلوی علیہ الرحمۃ نے:

خدا کی قدرت کہ چاند حق کے کروڑوں منزل میں جلوہ کر کے
ابھی نہ تاروں کی چھاؤں بدلی کہ نور کے تڑکے آلیے تھے

ثابت ہو گیا کہ ایک وقت کسی کیلئے کثیر ہوتا ہے اور کسی کیلئے طویل، مان لیجیے کہ حضرت عزیر علیہ السلام نے اپنے علم وادراک کے مطابق کہا کیونکہ وہ وقت ان کیلئے بحکم الٰہی کثیر ہو گیا تھا جو دوسرے لوگوں یعنی اہلِ دنیا کیلئے طویل تھا لہٰذا نبی کا قول بھی حق ہے اور خالق کائنات کا ارشاد بھی حق ہے اور اس سے یہ بات بھی روشن اور واضح ہو گئی کہ یہاں بل ابطالیہ ہونا محض اس واقعہ کے مطابق تھا جو دنیا والوں پر گزرا۔ اس واقعہ کے مطابق نہیں تھا جو حضرت عزیر علیہ السلام نے بتایا تھا اور جو ان کے علم وادراک میں تھا۔

مولوی جی! آپ اگر تھوڑی سی زحمت گوارہ کر کے اپنی مستدلہ آیت میں غور وخوض کر لیتے تو آپ کو اتنے پاپڑ نہ بیلنے پڑتے۔ دیکھو اسی آیت میں ہے ''**فانظر الی طعامك وشرابك لم يتسنه وانظر الى حمارك**'' یعنی دیکھو اپنے کھانے اور پینے کی چیز کو وہ اب تک بدبودار نہیں ہوئی اپنے گدھے کو (جس کی ہڈیاں سالم تک نہ رہیں) جو چیز جلد خراب ہونے والی تھی۔ وہ صحیح حالت میں موجود ہے اور جانور ذی روح اور طاقتور تھا اس کی ہڈیاں بکھری پڑی ہیں۔ بحکم خدا سو برس کا عرصہ تو سب پر برابر

گزرا تھا مگر جو چیزیں جلد خراب ہونے کے لائق نہ تھی اس کی ہڈیاں چمک رہی ہیں تو اس کا مطلب ہوا؟ بھائی اس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت عزیر علیہ السلام کا فرمان ''یوم او بعض'' بھی صحیح ہے اور اس کی دلیل کھانے پینے کی اشیاء کا اپنی اصلی حالت میں رہنا اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد کہ تم سو سال ٹھہرے ہو بھی حق ہے اور بلکہ آپ کی پڑھی ہوئی آیت نے واضح کر دیا کہ اللہ تعالیٰ کے پیغمبر کا فرمان بھی سچا ہے اور خود خالق کائنات جل شانہ کا ارشاد بھی بالکل حق ہے۔ رہا آپ کا وہ دعویٰ جو آپ نے پیش کیا ہے تو اس کا طلسم ٹوٹ گیا ہے اور وہ خود بخود غلط ہو گیا ہے کہ بعد از وصال انبیاء کرام واولیاء اللہ کو علم وادراک نہیں ہوتا۔ یہ تصور یہ گمان یہ سوچ یہ عقیدہ سراسر باطل ہے اور قرآن واحادیث کے منافی۔

آپ کی اس مدلل گفتگو اور محیر العقول جوابات سے حاضرین پر سکتہ طاری ہو گیا۔ اس مناظرہ کے فیصل وصدر مولانا نواب دین صاحب تھے وہ آپ کے قدموں پر گر پڑے اور پاؤں چومنے کے بعد اٹھ کر کہا۔ لوگو میں تو اس وقت بہت پریشان ہو گیا تھا جب حضرت کے مدمقابل مولوی صاحب نے اپنا استدلال پیش کیا تھا اور میں یہ سوچ رہا تھا کہ اس استدلال کا جواب کہاں سے آئے گا، لیکن حضرت غزالیٔ زماں، مناظرِ اہلِ اسلام رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے مدمقابل کی دلیلوں کی ایسی بخیہ دری کی ہے کہ خود مدمقابل مبہوت اور سرگرداں ہو گیا ہے اور بھاگ نکلنے میں اپنی عافیت سمجھی، دیوبندی مناظر آپ کی اس ضربِ کاری اور گرفتِ باری کی تاب نہ لا کر ایڑیاں رگڑتا ہوا جلد ہی اپنے انجام کو جا پہنچا۔'



بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باب نمبر 5

ثبوتِ اعراس

از حضرت غزالیِ زماں

علامہ سید احمد سعید کاظمی

ماہنامہ السعید امام اہل سنت نمبر ۲۰۱۰ صفحہ ۴۷ تا ۴۸

حضرات محترم! بارگاہِ پیران پیر رحمۃ اللہ علیہ کے عرس پر حضرت مخدوم صاحب کی محبت و اصرار نے مجھے حاضر کیا میں چند مسائل شرعیہ جو اس محفل کے انعقاد کے ساتھ وابستہ ہیں ان کا ذکر ضروری سمجھتا ہوں۔ لفظِ عرس اس مبارک تقریب کو کہا جاتا ہے کہ جس دن کسی بزرگ کا یومِ وصال ہو۔ اس دن اس کی روح کو ایصالِ ثواب کرنے اور ان سے روحانی فیض پانے کا نام عرس ہے۔

صحابہ رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں:

یہ کہا جاتا ہے کہ یہ عرس حضور ﷺ اور صحابہ کرام کے زمانہ میں نہ تھے اور نہ ہی ان کے بارے میں کوئی شرعی دلیل ہے لہٰذا ایسا کام جس کی اسلام میں کوئی اصل نہ ہو وہ ضلالت و گمراہی ہے۔

شبہ کا ازالہ: میں عرض کروں گا کہ جو کام حضور ﷺ نے نہ کیا ہو اس کو ضلالت و گمراہی قرار دینا غلط ہے اس کے بارے میں بخاری شریف کی دو حدیثیں پیش کرتا ہوں پہلی حدیث مبارکہ تو یہ ہے کہ جب سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں مسیلمہ کذاب کے ساتھ جہاد شروع ہوا تو صحابہ خصوصاً وہ جن کے سینوں میں قرآن مجید کی امانت رکھی ہوئی تھی بکثرت شہید ہونے لگے اور وہ وقت تھا کہ کہیں قرآن مجید پتھروں پر اور کہیں کھجوروں کے پتوں پر اور کہیں ہڈیوں پر لکھا ہوا تھا۔ تو سیدنا فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے اور کہنے لگے کہ قاریانِ وحفاظ قرآن کریم بکثرت شہید ہو رہے ہیں کہیں کلام الٰہی ہم سے ضائع نہ ہو جائے لہٰذا قرآن کریم کو یکجا جمع کیا جائے تو سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے فرمایا" **كيف افعل شيالم يفعله رسول الله** ﷺ" یعنی میں وہ کام کیسے کروں جسے رسول اللہ ﷺ نے نہیں کیا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا، اس میں خیر کا پہلو ہے اور ممانعت کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ لیکن حضرت سیدنا صدیقِ اکبر

رضی اللہ عنہ نے وہی جواب دیا۔ مراجعتِ کلام کے بعد حضرت ابو بکر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے فرمایا" **حتیٰ شرع الله صدری للذی شرع له صدر عمر**" حتیٰ کہ جس امر کیلئے اللہ نے عمر کا سینہ کھولا تھا اسی امر کیلئے میرا سینہ بھی کھول دیا کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا مشورہ بہت اچھا ہے اور واقعی اس کام میں بھلائی ہے تو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے زید بن ثابت انصاری رضی اللہ عنہ جو کاتبِ وحی اور صاحبِ امانت و دیانت تھے کو بلایا اور وہی بات دھرائی جو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ سے کہی تھی" حضرت زید رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ" جس امر کیلئے اللہ تعالیٰ نے حضرت ابو بکر صدیق و عمر رضی اللہ عنہما کے دل میں بات ڈالی تھی اور ویسے ہی مراجعت کلام ہوئی اور زید بن ثابت انصاری رضی اللہ عنہ کا سینہ کھولا تھا اسی امر کیلئے میرا سینہ بھی کھول دیا اور میں نے جان لیا کہ قرآن کریم ضرور جمع کیا جائے۔ اس میں خیر کا پہلو ہے۔

اب سوچنے کی بات ہے کہ حدیث شریف قیامت تک آنے والے مسلمانوں کیلئے مشعلِ راہ اور ہدایت ہے کہ جس کام کو حضور سیدِ عالم ﷺ نے نہ کیا ہو اور اس کی ممانعت بھی نہ ہو اور اس میں خیر کا پہلو ہو تو وہ کام جائز ہے۔ اسی طرح ان اعراس کا اصل مقصد ایصالِ ثواب ہے اور یہ جائز ہے اور اس کی اصل بھی موجود ہے جیسا کہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ حضور اقدس ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ میری والدہ فوت ہوگئی ہے اور میں ان کی طرف سے کچھ صدقہ پیش کرنا چاہتا ہوں تو آپ ﷺ نے فرمایا اس کے نام سے کنواں لگائیں جس کا ثواب اس کو ملتا رہے گا اس کے علاوہ حضور ﷺ خود جنت البقیع میں تشریف لے جاتے تھے اور فرمایا! تم بھی ایسا کیا کرو معلوم ہوا کسی کی قبر پر جانا جائز ہے۔ جمع قرآن کریم سے بھی معلوم ہوگیا کہ یہ بدعت (ضلالہ) نہیں ہے اگر یہ (قبر پہ جانا) بدعت ہے تو جمع قرآن کریم بھی بدعت ہوگیا لیکن قرآن کریم بدعت ہو نہیں سکتا۔ اس لیے یہ امر بھی بدعت نہیں ہو سکتے۔

اگر آج ہم اس اصل مقصد کو فوت کر دیں تو یہ ہماری غلطی ہے ہمیں چاہیے کہ اس

غلطی کو دور کریں۔ آج تو ہماری نمازوں میں بھی اصل مقصد فوت ہوگیا ہے۔ اس طرح ہم حج، روزہ، زکوٰۃ میں بھی اصل مقصد سے دور ہوگئے ہیں اس سے یہ نہ کہا جائے کہ نماز روزہ حج زکوٰۃ کو چھوڑ دیں بلکہ یہ کہا جائے گا کہ اس غلطی کو دور کریں اور اصل مقصد کو حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ اسی طرح یہ نہ کہا جائے گا کہ عرس کو چھوڑ دو بلکہ یہ کہا جائے گا کہ جو زیادتی یا خلاف شرع بات پائی جائے اس کو مٹانے کی کوشش کی جائے نہ کہ اعراس سے روکا جائے۔ جن حضرات قدسیہ کے ہم اعراس مناتے ہیں ان کے بارے میں اللہ فرماتا ہے۔" **من عادلی ولیا فقد اذنته بالحرب**" کہ جس نے میرے ولیوں کے ساتھ دشمنی رکھی اس سے میرا اعلانِ جنگ ہے۔

جس کے ساتھ خدا جنگ کرے وہ کسی طرح نجات نہیں پا سکتا، ولیوں سے بغض و حسد والا نجات سے محروم رہے گا۔ رہا عرس کا مطلب! عرس ماخوذ ہے عروس سے حدیث میں ہے حضور سید عالم ﷺ نے فرمایا کہ مومن جب قبر میں صحیح جواب دیتا ہے تو حکم ہوتا ہے" **نعم کنومة العروس**" نیند کر جیسے عروس نیند کرتی ہے اور عروس کا معنیٰ خوشی بھی ہے۔ اور جب موت کا فرشتہ محبوب کے وصال کی خوشخبری دیتا ہے تو مومن کے لبوں پر تبسم ہوتا ہے۔ اور یہی اولیاء اللہ کی پاک زندگی ہے اس لیے حدیث میں عروس کا لفظ آیا کہ محبوب حقیقی کی ملاقات کا وقت آگیا ہے۔ بعض لوگ حاضر ہو کر قرآن کریم کے ختم پڑھ کر پیش کرتے ہیں مگر جاتے وقت خالی ہاتھ نہیں جاتے یہ سب کچھ رضا پر موقوف ہے یہ عرس پاک کا مختصر تذکرہ تھا اب اگر کوئی عرس کو ناجائز کہے تو اپنے اکابر کو دیکھے شاہ ولی اللہ صاحب اور ان کے والد شاہ عبدالرحیم، حضرت امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر حضرات کا بھی یہی طرز عمل تھا۔ باقی رہا سرود وغیرہ تو یہ امر مختلف فیہ ہے لہٰذا اس سے آپ خاموش رہیں اور میں چونکہ صابری چشتی ہوں چند شرائط کے ساتھ جائز قرار دیتا ہوں اگر کوئی تجاوز کرتا ہے تو اس کی اپنی کمی ہے، ہم اللہ والوں کو مانتے ہیں اور اللہ والوں کو ماننا درحقیقت اللہ کو ماننا ہے کبھی کسی

مسلمان نے ابوجہل وابولہب وغیرہ کا عرس نہیں کیا بلکہ غوث الاعظم رحمۃ اللہ علیہ کا عرس مبارک کیا ہے۔



بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باب نمبر 6

حضرت غزالیٔ زماں کا منفرد اندازِ استدلال

ظفر محمود قریشی
واہ کینٹ

ماہنامہ السعید امام اہل سنت نمبر ۲۰۱۰ صفحہ ۵۱ تا ۵۸

غزالیٔ زماں رحمۃ اللہ علیہ کے طرز استدلال کے حوالے سے لکھتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میری امت کے علماء بنی اسرائیل کے انبیاء کی طرح ہیں۔ یعنی امتِ محمدیہ میں ایسے نادرِ روزگار علماء پیدا ہوں گے جن کا کردار، جن کی گفتار، جن کا علم وعمل، تقویٰ و پرہیزگاری اپنی مثال آپ ہوگی جو حقیقت میں وارثِ مسندِ انبیاء ہوں گے۔ جن کا سونا، جاگنا، اٹھنا، بیٹھنا، بات کرنا فقط اطاعتِ خداوندی میں ہوگا۔ جن کے دن علوم و معارف کے خزانے لٹانے میں گزریں گے تو راتیں خالقِ کائنات کی بارگاہ میں سجدہ ریز ہوگی۔ صبح قیامت تک جن کے نام کا ڈنکا بجتا رہے گا۔ ملائکہ جن کے راستے میں اپنے پر بچھائیں گے۔ حورانِ بہشت جن کے نعلین کی دھول کو اپنی آنکھوں کا سرمہ بنائیں گی۔ ایک زمانہ جن کی عظمتوں کے گن گائے گا۔ حاملانِ عرش جن کی قسمت پر ناز کریں گے۔

نہ پوچھ ان خرقہ پوشوں کی ارادت ہو تو دیکھ ان کو
یدِ بیضا لیے بیٹھے ہیں اپنی آستینوں میں

ایسے ہی خرقہ پوشوں میں غزالیٔ زماں، رازیٔ دوراں، امام الاتقیاء، حاملِ علمِ لدنی، فخر الاسلام شیخ الحدیث حضرت علامہ سید احمد سعید کاظمی رحمۃ اللہ علیہ کی ذاتِ ستودہ صفات بھی ہے۔ جنھوں نے اپنی ساری زندگی اخلاص وللّٰہیت کے ساتھ قرآن و حدیث کی خدمت میں گزار دی۔ اللہ کریم نے آپ کو بے پناہ عظمتوں سے نوازا تھا۔

آپ بہ یک وقت بہترین مدرس بلند پایہ خطیب اور مایہ ناز مصنف اور سیاسی و مذہبی رہنما تھے۔ عام طور پر یہ تمام خوبیاں کسی ایک شخصیت میں کم ہی دکھائی دیتی ہیں۔ لیکن جن لوگوں نے حضرت غزالیٔ زماں رحمۃ اللہ علیہ کی صحبت اختیار کی ہے یا جن شائقینِ علم وادب نے آپ کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیا ہے وہ اس بات کے گواہ ہیں کہ غزالیٔ زماں رحمۃ اللہ علیہ جیسی روحانی وجدانی شخصیت صدیوں بعد ہی اس دھرتی پر جنم لیتی ہے۔ اللہ کریم عزوجل نے آپ کو علم و معارف کا ایک ایسا سمندر عطا فرمایا تھا جس

میں ہزاروں تشنگانِ علم نے غوطہ زنی کی اور اپنی علمی و روحانی پیاس بجھائی۔

آپ نے تحصیلِ علوم سے فراغت کے بعد مختلف مدارس اسلامیہ میں تدریس کے فرائض سرانجام دیے۔ آپ اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور میں **9** سال تک شیخ الحدیث کے منصب پر فائز رہے اور علمِ حدیث کے متوالوں کو سیراب کرتے رہے پھر ملتان شریف میں جامعہ اسلامیہ عربیہ انوار العلوم کے نام سے ایک عظیم ادارہ قائم فرمایا اور یہاں درس وتدریس کا ایک طویل سلسلہ شروع کر دیا دور دراز سے لوگ آپ کے پاس علوم دینیہ کی تحصیل کرنے کیلئے آتے۔ یہاں تک کہ مخالفین کو بھی آپ کی محدثانہ شان اور علمی جلالت کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا پڑا۔ جب روز بہ روز آپ کی مقبولیت میں اضافہ ہوتا گیا تو ہر دور کی طرح اس دور میں بھی حاسدین نے اپنا کام شروع کر دیا اور مخالفتوں کا ایک نہ تھمنے والا طوفان شروع ہو گیا لیکن آپ کے پائے استدلال میں لغزش پیدا نہ ہوئی اور آپ اپنا کام تن دہی سے سرانجام دیتے رہے۔ حضرت شرفِ ملت علامہ عبدالحکیم شرف قادری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

''میدانِ خطابت وتصنیف میں ان کے زورِ بیان، قوتِ استدلال اور دلائل کی فراوانی کے آگے اہلِ باطل کے دل بیٹھ جاتے۔ یوں دکھائی دیتا کہ مخالفین کی تمام کاوشیں ایک سیلِ بے پناہ کے آگے خس وخاشاک کی طرح بہتی چلی جارہی ہیں، یہی سبب تھا کہ مخالفین نے آپ کا راستہ روکنے کی بارہا کوششیں کیں، مخالفتوں کے طوفان اٹھائے یہاں تک کہ آپ پر قاتلانہ حملے کرائے گئے مگر آپ کے پائے استقامت میں جنبش نہ آئی اور آپ کا ہر قدم منزل کی طرف آگے بڑھتا رہا اور ایک وہ وقت آیا کہ سید احمد سعید کاظمی رحمۃ اللہ علیہ شہرِ اولیاء ملتان کی آبرو تھے۔''

آپ رحمۃ اللہ علیہ نے جب قرآن پاک کی تفسیر کا درس دینا شروع کیا تو صرف بسم اللہ کی تفسیر بیان کرنے میں چھ ماہ لگ گئے اور اسی طرح پورے قرآن کریم کا درس ختم کرنے میں اٹھارہ سال کا طویل سفر طے کیا۔ درس و تدریس کے علاوہ مختلف

مذہبی، ملی و سیاسی تحریکوں میں بھرپور حصہ لیا اور ملتِ اسلامیہ کی بروقت صحیح رونمائی فرمائی۔ آپ نہ صرف تحریکِ پاکستان کے سرگرم رکن تھے بلکہ پاکستان بننے کے بعد تحریکِ نفاذِ نظامِ مصطفی ﷺ، تحریکِ ختمِ نبوت، تحریکِ آزادیٔ کشمیر وغیرہ میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

حضرت غزالئ زماں رحمۃ اللہ علیہ ایک مدرس و مصنف ہونے کے ساتھ ساتھ ایک کامل شیخ طریقت بھی تھے، ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ ''میں بہت عرصے تک کسی کامل پیر کی تلاش میں سرگرداں رہا پھر ایک مرتبہ حضرت داتا گنج بخش علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ کے دربار پر حاضری کا شرف حاصل ہوا خصوصی دعا کی کہ یا اللہ مجھے کسی کامل شیخ طریقت تک پہنچا دے۔ دربار شریف کی حاضری اور دعا سے فراغت کے بعد جب واپسی کیلئے میں دربار شریف کے مین گیٹ پر پہنچا تو دیکھا کہ حضرت کاظمی شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اندر داخل ہو رہے ہیں مجھے دیکھ کر بڑی محبت کے ساتھ ملے اور فرمایا حاجی صاحب آپ کسی کامل شیخِ طریقت کی تلاش میں ہیں۔ میں حضرت کے یہ الفاظ سن کر حیران ہو گیا اور اس ملاقات کو اللہ تعالیٰ کی نعمت اور حضور داتا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا روحانی فیضان سمجھتے ہوئے حضرت غزالئ زماں رحمۃ اللہ علیہ کے دستِ حق پرست پر بیعت ہو گیا۔ حضرت شاہ صاحب نے فرمایا کہ '' حاجی صاحب آپ پر یہ لازم ہے کہ آپ پاکستان میں جہاں کہیں بھی ہوں حضرت داتا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے عرس مبارک پر ضرور حاضری دیجئے گا اور کبھی ناغہ نہ کیجئے گا۔''

حضرت غزالئ زماں رحمۃ اللہ علیہ کے علمی مقام پر بات کرنا مجھ جیسے کم علم کے بس کی بات نہیں لیکن چونکہ میرا موضوع آپ کا طرزِ استدلال ہے اس لیے اس ضمن میں چند واقعات عرض کرنا چاہتا ہوں جن سے یہ ظاہر ہوگا کہ آپ پر اللہ کریم کا کتنا فضل تھا۔ حضرت غزالئ زماں رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ''مدینہ طیبہ کے ایک قاضی نے مجھ سے کہا کہ آپ روضۂ اقدس کی حاضری کے وقت بیت اللہ شریف کی طرف پشت کر کے

کھڑے ہوتے ہیں کیا آپ قبرِ رسول ﷺ کو کعبے سے افضل مانتے ہیں؟ میں نے کہا صرف کعبہ ہی نہیں بلکہ عرشِ اعظم سے بھی افضل مانتا ہوں اس نے دلیل طلب کی تو فرمایا حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے عبدِ شکور ہیں اور چوتھے آسمان پر اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء اور شکر میں مصروف ہیں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے'' **لئن شکرتم لازیدنکم** '' اگر تم شکر بجالاؤ تو میں ضرور نعمتوں میں اضافہ کر دوں گا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مراتب میں ترقی یہ ہونی چاہیے تھی کہ شکرِ الٰہی کی بدولت عرشِ الٰہی پر پہنچا دیا جاتا حالانکہ وہ قیامت کے قریب زمین پر تشریف لائیں گے اور نبی اکرم ﷺ کے جوار میں محوِ استراحت ہوں گے۔ ثابت ہوا کہ روضۂ مقدسہ آسمانوں بلکہ عرشِ اعظم سے بھی افضل ہے۔ یہ استدلال سن کر قاضی دم بخود رہ گیا۔ حضرت غزالئ زماں رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میرے بچپن میں حزب الاحناف لاہور اہلسنت کا عظیم الشان علمی مرکز تھا جس میں پانچ روزہ جلسہ ہوا کرتا تھا میری عمر سولہ سترہ سال ہوگی نیا نیا فارغ التحصیل ہو کر آیا تھا۔ یہ میری خوش نصیبی تھی کہ مجھے بھی اس جلسے سے خطاب کرنے کا موقع ملا۔ آپ فرماتے ہیں کہ یہ واقعہ **1929**ء کا ہے جب ابھی تقسیم برصغیر عمل میں نہیں آئی تھی جلسہ گاہ کے قرب و جوار میں ہندو اور سکھ بھی رہتے تھے میں تقریر کر رہا تھا تو میری تقریر کے دوران ایک پرچی آئی اس میں لکھا تھا کہ مولانا صاحب میں ایک ہندو لڑکی ہوں اور بی اے میں پڑھتی ہوں میرا گھر آپ کے جلسہ گاہ کے بالکل ساتھ ہے اس لیے کئی دن سے میں آپ کے جلسے میں ہونے والی تقاریر سن رہی ہوں آپ کہہ رہے ہیں کہ دنیا میں کسی صفت اور کسی خوبی میں آپ کے نبی (ﷺ) سے بڑھ کر کوئی نہیں ہو سکتا جب کہ اسی اسٹیج پر ایک مولانا صاحب نے حاتم طائی کی سخاوت کا ایک واقعہ بیان کیا۔ انھوں نے بتایا کہ حاتم طائی اتنا بڑا سخی تھا کہ اس نے لوگوں میں مال و دولت تقسیم کرنے کیلئے ایک محل بنوایا جس کے سات دروازے تھے جو سائل جس دروازے سے آتا اسے خیرات دے دیتا وہ دوبارہ دوسرے دروازے سے

آتا حاتم پھر اسے خیرات دیتا تیسرے اور چوتھے حتیٰ کہ وہی سائل ساتوں دروازوں سے آتا اور ساتوں مرتبہ ہی اسے خیرات مل جاتی اور حاتم کی زبان پر یہ الفاظ نہیں آتے تھے کہ تم پہلے کتنی دفعہ آچکے ہو اب بار بار کیوں چلے آرہے ہو اور وہ سائل پھر پہلے دروازے پر مانگنے چلا جاتا ہے حاتم کے ماتھے پر تب بھی شکن نہ پڑتی اور اس نے دستِ سخاوت پھر بھی نہ کھینچا۔ واقعہ تاریخی اعتبار سے صحیح ہے یا غلط اس پر بحث مقصود نہیں وہ اس لیے کہ یہ آپ کے اسٹیج سے آپ کے اپنے عالمِ دین نے بیان کیا ہے۔ اس لیے اس کو صحیح ماننا پڑے گا اب آپ یہ بتائیں کہ آپ کا دعویٰ ہے کہ مخلوق میں کوئی آپ کے نبی ﷺ سے بڑھ کر نہیں ہوسکتا اگر یہ بات درست ہے تو پھر آپ حاتم طائی کی اس سخاوت کے واقعے سے بڑھ کر اپنے نبی ﷺ کی سخاوت کا کوئی واقعہ بیان کریں ورنہ تسلیم کریں کہ حاتم طائی آپ کے نبی ﷺ سے بھی بڑھ کر سخی تھا۔

میں نے کہا کہ حاتم طائی بے حد سخی تھا اس واقعے سے اگر کوئی یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ وہ بے حد سخی تھا اور بڑا دیالو تھا تو وہ اس کی کم فہمی ہے اس واقعے سے تو اس کی کنجوسی اور کم ہمتی ثابت ہوتی ہے ایک سائل آتا ہے سوال کرتا ہے حاتم اسے دیتا ہے لیکن سائل کی جھولی نہیں بھرتی یعنی سائل کی مراد پوری نہیں ہوتی اس کی طلب ختم نہیں ہوتی وہ دوبارہ جھولی پھیلاتا ہے حاتم اسے پھر کچھ دیتا ہے لیکن اب بھی اس نے اتنا کم دیا ہے کہ سائل دوبارہ سوال کرنے پر مجبور ہے حاتم بار بار دیتا ہے سائل کی طلب باقی رہتی ہے وہ بار بار لوٹ کر آتا ہے یہ کیسی سخاوت ہے درحقیقت یہ تو کنجوسی ہوئی۔ اگر سخاوت دیکھنا ہے تو آؤ میرے آقا ﷺ کی سخاوت دیکھو تہجد کا وقت ہے حضرت ربیعہ رضی اللہ عنہ سرکارِ دو عالم ﷺ کے جاں نثار صحابی، سرکار دو عالم ﷺ کو وضو کروا رہے ہیں سرکار ﷺ ان کی خدمت پر خوش ہوتے ہیں دریائے رحمت جوش میں آتا ہے سرکار دو عالم ﷺ فرماتے ہیں سل ربیعہ؟ اے ربیعہ مانگ کیا مانگتا ہے؟ حضرت ربیعہ رضی اللہ عنہ عرض کرتے ہیں " **اسئلك مرافقتك فی الجنة یا رسول الله**

ﷺ "میں جنت میں آپ ﷺ سے آپ کی رفاقت طلب کرتا ہوں۔ سرکار فرماتے ہیں یہ تو ہم نے تمہیں عطا کر دیا تیرا سوال پورا ہوا اس کے علاوہ کوئی اور طلب ہو تو مانگ حضرت ربیعہ رضی اللہ عنہ عرض کرتے ہیں " **هذا رسول الله** " اللہ کے رسول ﷺ میرے لیے سب کچھ ہیں۔

سب کچھ خدا سے مانگ لیا تجھ کو مانگ کر
اُٹھتے نہیں ہیں ہاتھ میرے اس دُعا کے بعد

یارسول اللہ ﷺ جب آپ مل گئے تو اور کیا چاہیے سرکار فرماتے ہیں " **او غیر ذالک ربیعه** " اے ربیعہ کچھ اور مانگ لے۔ یارسول اللہ ﷺ بس یہی کافی دامنِ طلب میں اب بھلا کس شے کی کمی ہے۔ ذرا دیکھو اس کی طرف وہ سائل ہے جو بار بار آتا ہے اور حاتم سے سوال کرتا ہے ایک یہ داتا ہیں جو سائل سے بار بار کہتے ہیں کہ کچھ مانگ لو تو اب تم خود ہی فیصلہ کرلو کہ کون زیادہ سخی ہے؟ یہ جواب سن کر ہندو لڑکی مسلمان ہوگئی اور اسٹیج پر موجود علماء حیران و ششدر رہ گئے کہ اتنا مکمل جواب اس نو جوان نے دے دیا۔

علامہ صاحبزادہ سید حامد سعید کاظمی (سابق وفاقی وزیر برائے مذہبی امور حکومتِ پاکستان) فرماتے ہیں کہ میں نے یہ واقعہ خود اباجی (حضور غزالئ زماں رحمۃ اللہ علیہ) قبلہ کی زبانی سنا فرمایا دورانِ تقریر ایک پرچہ آیا جس میں عورت کے پردے کے بارے میں سوال تھا اور ضمناً یہ بھی ذکر تھا کہ علامہ اقبال اس بارے میں ذرا روشن خیال واقع ہوئے ہیں اور عورتوں کیلئے پردہ لازمی خیال نہیں کرتے۔ میں نے پرچہ پڑھ کر لوگوں کو بتایا کہ سوال کرنے والے نے پوچھا ہے کہ عورت کیلئے پردہ کی شرعی حیثیت کیا ہے بات دراصل یہ ہے کہ فقہ کا ایک مسئلہ ہے کہ "سترِ عورت فرض ہے" کیا مطلب؟ مطلب یہ ہے کہ ہر شخص کے جسم میں کچھ حصہ وہ ہے جس کا چھپانا فرض ہے اگر اس حصے کو نہ ڈھانپا جائے تو نماز نہیں ہوتی مرد کے جسم کا جو حصہ سترِ عورت کہلاتا ہے اس کو ڈھانپنا فرض ہے تو جو جسمِ عورت ہو اس

کو چھپانا فرض ہوگا یا نہیں؟ اور ایک اور بات سمجھتے چلو اگر کوئی شخص اپنی عورت یعنی اپنی بیوی کو چھپانا اور پردہ کروانا ضروری خیال نہیں کرتا اور سمجھتا ہے کہ پردہ غیر ضروری چیز ہے تو اسے چاہیے کہ اپنی بیوی سے پہلے اپنی عورت یعنی اپنے جسم کا وہ حصہ جسے عورت کہتے ہیں اسے بے حجاب (بے پردہ) کرے۔ اباجی قبلہ نے فرمایا جب میں نے اس مسئلے کو یوں بیان کیا تو حضرت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کھل کر مسکرائے اور مجھے داد دی اور تقریب کے اختتام پر مجھے تھپکی دیتے ہوئے کہا "برخوردار لگتا ہے بہت نام پیدا کرو گے۔" حضرت غزالئ زماں رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔ حدیث پاک میں آتا ہے کہ حضرت امان بنت عمیس رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ خیبر میں صہبا کے مقام پر سید دو عالم ﷺ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی گود میں سر مبارک رکھ کر آرام فرما رہے تھے اور حضور ﷺ پر وحی نازل ہو رہی تھی۔ سورج غروب ہو گیا اور حضرت مولا علی رضی اللہ عنہ نے ابھی عصر کی نماز نہ پڑھی تھی۔ رسول کریم ﷺ نے فرمایا اے پیارے علی! کیا ابھی نماز نہیں پڑھی؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے عرض کیا نہیں تو رسول اللہ ﷺ نے دعا کی یا اللہ! پیارے علی تیری اور تیرے رسول کی اطاعت میں تھے لہٰذا سورج کو واپس لوٹا دے۔ حضرت اسماء رضی اللہ عنہا بیان فرماتی ہیں کہ میں نے سورج کو دیکھا کہ سورج غروب ہو چکا تھا پھر سورج واپس آیا زمین اور پہاڑوں پر دھوپ چمکی۔ کسی نے مجھ سے کہا کہ بھئی تم نے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ ﷺ سے بھی بڑھا دیا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ایک نماز قضا ہوئی تو حضور ﷺ نے سورج واپس کر دیا مگر خود حضور ﷺ کی کئی نمازیں قضا ہو گئیں تو حضور ﷺ کی قضا نماز کیلئے سورج واپس نہیں آیا لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ایک نماز قضا ہو گئی تو سورج واپس آ گیا بھئی یہ کیا بات ہوئی تم نے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کو رسول اکرم ﷺ سے بڑھا دیا۔ میں نے کہا یہ بات نہیں ہے کیوں کہ غلاموں کا جو کمال ہوتا ہے وہ غلاموں کا نہیں ہوتا بلکہ آقاؤں کا ہوتا ہے مولائے کائنات حضرت علی رضی اللہ عنہ غلام ہیں حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کے، ان کی قضا نماز کیلئے سورج کا واپس آنا حضرت علی رضی اللہ عنہ کا کمال نہیں بلکہ آقائے دو جہاں حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کا کمال ہے۔ رہا یہ سوال کہ حضور ﷺ کی قضا نماز کیلئے سورج

واپس کیوں نہیں آیا؟ تو اس کی وجہ یہ تھی کہ تمام قیامت تک آنے والے مومنوں کیلئے اسوۂ حسنہ حضور ﷺ ہیں قرآن کہتا ہے "**لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ**" (پ۲۱ الاحزاب) اگر حضور ﷺ کی قضا نماز کیلئے ڈوبا ہوا سورج واپس آ جاتا تو قیامت تک کے مسلمانوں کی قضا نماز کیلئے سورج واپس آتا اور یہ اللہ تعالیٰ کی حکمت کے خلاف ہوتا۔"

راقم نے اس مختصر سے مقالے میں حضرت غزالئ زماں کے علمی اور روحانی پہلو کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا کہ مجھے اپنی کم علمی کا پورا پورا احساس ہے۔ لہٰذا ضرورت اس امر کی ہے کہ حضرت غزالئ زماں جیسی ہمہ جہت شخصیت کو بھرپور انداز میں عوام الناس کے سامنے لایا جائے بالخصوص نوجوان نسل کو ایسے نابغۂ روزگار کی زندگی کے ہر پہلو سے روشناس کرانا ضروری ہے کہ الحاد و بے دینی کی فضا کو مملکتِ خداداد پاکستان میں اپنے پنجے مضبوط کر رہی ہے سے اپنی قوم کو بچایا جا سکے۔ میں نہایت ہی شکر گزار ہوں فاضلِ نوجوان جناب محمد جمیل الرحمٰن سعیدی صاحب کا جو حضرت غزالئ زماں کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر ایک ضخیم کتاب ترتیب دے رہے ہیں جو کم و بیش چار جلدوں پر مشتمل ہوگی اللہ کریم آپ کی مساعی جمیلہ کو قبول فرمائے۔ (آمین، بجاہ سید المرسلین e)

ماخذ (نور نور چہرے، تذکرہ اکابر ملت، از مولانا عبدالحکیم شرف قادری علیہ الرحمۃ) حیاتِ غزالئ زماں از حافظ امانت سعیدی) مقالاتِ کاظمی از علامہ غلام رسول سعیدی) (سہ ماہی) افکار رضا ممبئی انڈیا جنوری تا مارچ 200۶)



بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باب نمبر 7

تخلیقِ آدم علیہ السلام

ضیغمِ اسلام حضرت علامہ

سید احمد سعید کاظمی رحمۃ اللہ علیہ کا تخلیق

آدم علیہ السلام کے موضوع پر خطاب دلنواز

ماہنامہ السعید امام اہل سنت نمبر ۲۰۰۱ صفحہ ۱۹ تا ۲۵

مواعظِ کاظمی

جلد اول



ضیغم اسلام غزالی زماں امام اہل سنت

علامہ سید احمد سعید شاہ کاظمی رحمۃ اللہ علیہ

مرتبہ حافظ طارق جاوید سعیدی

ادارہ احمد سعید کنز العلوم پاکستان

نحمدہ و نصلی علی سولہ الکریم، اما بعد فاعوذ باللہ من الشیطن الرجیم بسم اللہ الرحمن الرحیم۔

محترم حضرات! یہ دیارِ حبیب محمد مصطفیٰ ﷺ ہے۔ آپ ﷺ قبر انور میں حیاتِ طیبہ کے ساتھ زندہ جلوہ گر ہیں۔ مدینہ منورہ کا ایک ایک ذرّہ قابل صد احترام ہے۔ یہ وہ پاک مقام ہے جہاں دس سال متواتر قرآن پاک نازل ہوا اور جہاں بار ہا جبریل علیہ السلام کو بارگاہِ نبوت کی حاضری کا شرف حاصل رہا۔ عظمت و رفعت کے اس احساس کے ساتھ میں نہایت اختصار اور جامعیت کے ساتھ چند کلمات عرض کرتا ہوں۔ ارشاد ہوتا ہے" **واذ قال ربك للملئكة انی جاعل فی الارض خلیفة**" (پ۱، البقرہ، ۳۰)

"اور (یاد کیجئے) جب آپ کے رب نے فرشتوں سے فرمایا بیشک میں بنانے والا ہوں زمین میں (اپنا) نائب۔"

اے محبوب! آپ یاد فرمائیں" **اذ قال ربك**" جب آپ کے رب نے فرمایا یاد وہ چیز دلائی جاتی ہے جو کسی کے علم کے متعلق ہو۔ جو چیز کسی کے علم میں ہے ہی نہیں اسے یاد دلانے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا...... معلوم ہوا کہ جب اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے یہ فرمایا تھا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بناؤں گا تو اس وقت حضور تاجدارِ مدنی محمد مصطفیٰ احمدِ مجتبیٰ ﷺ موجود تھے اور سید عالم ﷺ حضرت آدم علیہ السلام ے بنائے جانے سے پہلے موجود تھے اور یہ بات حدیث شریف میں بھی آئی ہے کہ" **کنت نبیاو آدم بین الروح والجسد**" کہ آپ ﷺ نبی تھے۔" جب آدم علیہ السلام ابھی روح اور جسم کے درمیان تھے۔" اس حدیث کو امام ترمذی نے ترمذی شریف میں حسنِ صحیح کے ساتھ روایت کیا ہے۔ آپ ﷺ فقط موجود ہی نہیں تھے بلکہ اس بات کا علم بھی رکھتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے یہ فرمایا ہے۔ اللہ اکبر! یہی وجہ ہے کہ" **انا اولهم خلقا**" "**واٰخرهم بعثا**" کہ

میں پیدا ہونے میں سب نبیوں سے پہلے ہوں اور تشریف لانے میں سب نبیوں کے بعد...... حضور سید دو عالم ﷺ پیدا ہونے میں سب نبیوں سے پہلے نہ ہوتے تو" **اذ قال رب للملئكة**" والی بات کیسے بنتی؟ ابھی حضرت آدم علیہ السلام پیدا نہیں ہوئے تھے۔ ابھی آپ کا جسم اور آپ کی روح تخلیق کے مراحل میں تھی کہ حضور سرورِ عالم ﷺ جلوہ گر تھے اور حضور ﷺ فقط موجود ہی نہیں تھے۔ بلکہ علم، صفتِ سمع، صفتِ بصر اور میرے آقا ﷺ تمام صفاتِ حسنہ اور صفاتِ محمودہ کے ساتھ موصوف تھے اور یہی وجہ ہے کہ میرے رب نے آپ ﷺ کا نام احمد رکھا۔ میں اس وقت لفظ احمد اور محمد پر گفتگو نہیں کر سکتا...... ہاں اس وقت سلسلۂ کلام جو جاری ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب کریم ﷺ کو آدم علیہ السلام سے پہلے پیدا فرمایا اور سرورِ عالم ﷺ اس جہانِ رنگ و بُو میں تشریف بعد میں لائے۔ گویا حضور ﷺ اول بھی ہیں اور سرکار آخر بھی ہیں۔ خلقت کے اعتبار سے اول ہیں اور بعثت کے لحاظ سے آخر ہیں۔ بلکہ میں اصرار کروں گا کہ جو اول ہوتا ہے وہی آخر ہوتا ہے۔ بظاہر یہ بات شاید سمجھ میں نہ آتی ہو لیکن میں اسے ایک مثال کے ذریعے سمجھاتا چلوں کہ جو اول ہوتا ہے وہی آخر ہوتا ہے۔ دیکھئے آپ ایک کھجور کا درخت لگانا چاہتے ہیں۔ سب سے پہلے آپ کھجور کی گٹھلی زمین میں بوئیں گے۔ اس سے نہایت نرم و نازک پودا بن جائے گا، اس درخت پر پھل لگے گا۔ اور کھجوریں تیار ہو جائیں گی۔ پک جائیں گی، پھر آپ ان کھجوروں کو درخت سے توڑ لیں۔ ان کا گودا کھائیں گے اور آخر میں گٹھلی رہ جائے گی۔ سب سے پہلے گٹھلی جو آپ نے زمین میں بوئی تھی۔ یہی گٹھلی کھجور کی اصل ہے...... حضور سید عالم ﷺ اول ہیں اور اول اس لیے ہیں کہ آپ اصل ہیں اور اصل اول ہوتی ہے۔ اصل نہ ہو تو فرع کا وجود کہاں سے ہو؟ جڑ نہ ہو تو تنا، شاخیں اور پتے کہاں سے ہوں گے؟ حضور ﷺ فقط یہ نہیں کہ انبیاء کی اصل ہیں کہ تمام نبیوں سے خلقت میں پہلے اور بعثت میں بعد میں ہیں،، بلکہ اٹھارہ ہزار عالم کی اصل آپ

ﷺ ہیں۔ بلکہ یوں کہیے کہ اٹھارہ ہزار عالم کا جوہر آپ ﷺ کے دامنِ محمدیت میں اس طرح چھپا ہوا تھا جیسے گٹھلی میں پورا درخت جو چیز اندر نہ ہو وہ باہر آ ہی نہیں سکتی۔ میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ کبھی کھجور کے پیڑ میں سے آپ نے سیب کا درخت پیدا ہوتا ہوا دیکھا ہے؟ کیوں اس لیے کہ سیب کے پھل کی حقیقت اس گٹھلی میں موجود ہی نہیں ہے تو باہر کیسے آئے گی؟ کیا آپ کبھی آم کے پودے سے انگور کے پھل حاصل کر سکتے ہیں؟ یا آپ مرغی کے انڈے سے کبوتر کا بچہ حاصل کر سکتے ہیں؟ ہر گز نہیں۔ کیوں؟ اس لیے کہ اس کی حقیقت اس کے اندر ہے ہی نہیں اور جو چیز اندر نہ ہو وہ باہر کیسے آئے گی؟ اس لیے میں کہتا ہوں کہ جس چیز کا وجود حقیقتِ محمدیت کے دامن میں نہیں تھا۔ وہ قیامت تک باہر آ ہی نہیں سکتی۔ ساری کائنات کیلئے اصل الاصول حضور تاجدارِ مدنی محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ ﷺ ہیں۔ تو میں عرض کر رہا تھا کہ تمام حقائق کائنات میرے آقا کے دامن میں ہیں۔ اور جو اول اور آخر ہوتا ہے سب کچھ اسی کے دامن میں ہوتا ہے۔ اٹھارہ ہزار عالموں کی حقیقت، آپ ﷺ کے دامنِ قدسی میں اس طرح مستور ہے جیسے کہ گٹھلی کے اندر تمام درخت مستور ہوتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اگر آپ کے ذہن میں کوئی خلش ہو تو وہ ابھی دور کر لیں۔ میرے جانے کے بعد اگر آپ کے ذہن میں سوالات پیدا ہوئے تو میں ان کا جواب کیسے دے پاؤں گا؟ اس مقام پر ایک سوال ذہن میں آ سکتا ہے، اس کا جواب دیتا چلوں کہ جب اٹھارہ ہزار کائنات کی حقیقتیں حضور ﷺ میں ہیں تو اٹھارہ ہزار عالم میں سب کچھ کیسے آ گیا۔ گویا ان میں مومن بھی آ گئے اور منافق بھی مسلمان بھی آ گئے اور کافر بھی، موحد بھی آ گئے اور مشرک بھی اور اس میں چرند، پرند، درند بمع سب غلاظتوں کے آ گئے۔ نعوذ باللہ! تو کیا یہ سب چیزیں حضور ﷺ کے دامن میں تھیں؟

میں اب اس شبہ کا ازالہ کر دوں ”جو چیز لطیف ہو اس میں نجاست یا غلاظت نہیں ہوا کرتی۔“ اور ”جو لطافت کے درجہ سے گر جاتی ہے تو اس میں نجاست آ جاتی ہے۔“

مثال دیتا ہوں آپ نے کئی مرتبہ مرغی کے انڈے کھائے ہوں گے، ہم ان انڈوں سے مرغی کے بچے حاصل کر سکتے ہیں۔ اب مرغی کے ان بچوں میں پر بھی ہیں اور ٹانگیں بھی گوشت بھی ہے اور ہڈیاں بھی۔ چربی بھی ہے اور خون بھی سر بھی ہے چونچ بھی، آنکھیں بھی ہیں اور کان بھی گویا یہ تمام چیزیں انڈے کے اندر موجود تھیں، اس کے باوجود ہم سالم انڈا کھا گئے۔ ہمیں کوئی کراہت محسوس نہ ہوئی اور ہم نے کچھ تردد محسوس نہ کیا، بے دریغ، بے دھڑک ہم انڈا کھا گئے۔ میں آپ کو یہ پہلے بتا چکا کہ جو چیز اندر نہ ہو وہ باہر نہیں آ سکتی۔ تو پتا چلا یہ تمام چیزیں یعنی پر، ہڈیاں، خون، وغیرہ لطافت کے درجہ سے نیچے نہیں آئی تھیں۔ اس لیے ہم اس انڈے کو کھا گئے۔ یہ سب چیزیں پاک تھیں۔ کھانے کے قابل تھیں۔ جب یہ چیزیں لطافت کے درجے سے کثافت کے درجے میں آئیں تو ناپاک ہو گئیں۔ تو پتہ چلا کہ اٹھارہ ہزار عالم کی حقیقت جب تک دامنِ مصطفیٰ ﷺ میں وابستہ رہی تو پاک رہی اور جب الگ ہوئی تو ناپاک ہو گئی۔ اب تمہاری لطیف حقیقتیں مصطفیٰ ﷺ کے دامن سے نکل گئیں ہیں تم کثافت اور نجاست کے ڈھیر میں چلے گئے ہو۔ اگر تم ان کے دامن میں لپٹے رہتے تو کوئی حقیقت تمہیں ناپاک نہیں کر سکتی تھی۔ تم پاک ہی رہتے تو اب پاک اور ناپاک کا فرق یہی رہا کہ جو دامنِ مصطفیٰ ﷺ سے لپٹا رہا تو وہ پاک رہا اور جو الگ ہوا وہ ناپاک ہوا۔ معلوم ہوا کہ کائنات کی ساری حقیقتیں دامنِ محمدیت میں موجود ہیں۔ لیکن اس کے باوجود کوئی یہ اعتراض نہیں کر سکتا کہ یہ ناپاک چیزیں دامنِ محمدیت سے تعلق رکھتی ہیں۔ کیونکہ وہ تمام ناپاک چیزیں لطیف تھیں اور لطیف چیزیں لطافت کے مرتبہ میں ہوں تو وہ نجس نہیں ہوا کرتیں۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر کوئی دوبارہ پاک ہونا چاہے تو کیا ہو سکتا ہے۔ اگر ہم نجاستوں اور غلاظتوں میں لتھڑنے کے بعد دامانِ مصطفیٰ ﷺ سے وابستہ ہو جائیں تو کیا پھر پاک ہو سکتے ہیں؟ تو اس کیلئے میں ایک مثال دیتا ہوں کہ لوگ کھیتی باڑی بھی کرتے ہیں اور اپنے پودوں کو کھاد بھی ڈالتے ہیں جو کہ نجس ہوتی ہے

اور پودوں کی غذا بنتی ہے۔ اگر پودہ غلہ ہے تو کھاد غلہ بن جاتی ہے اگر سبزی کا ہے تو کھاد سبزی بن جاتی ہے تو ہم سب ان چیزوں کو مزے سے کھاتے ہیں اگر آپ سے کوئی کہہ دے کہ یہ کھانا نجس ہے کیونکہ یہ کھاد کی تاثیر سے تیار ہوا ہے تو آپ اسکو کیا جواب دیں گے؟ تو آپ یہی جواب دیں گے کہ جب ناپاک اور نجس چیز کسی پاک چیز میں پنہاں ہوجائے تو وہ پاک ہوجاتی ہے۔ اسی لیے تو فرمایا کہ ''فاتبعونی'' کہ میری اتباع کرو' پاکی ملے گی۔ پہلے بھی یہیں پاکی تھی اور اب آخر میں بھی یہیں پاکی ہے اور آپ ﷺ ہم بے چاروں کی ناپاکی دور کرنے کیلئے ہیں۔ اس لیے قرآن نے فرمایا'' **یتلو علیھم اٰیتہ ویزکیھم**'' جوتلاوت کرتا ہے ان پر اس کی آیتیں اور پاک کرتا ہے۔'' (پ۴، ال عمران، ۱۶۳) اللہ اکبر!

تمہارا تزکیہ کرنا تو آپ ﷺ کا کام ہے۔ اب میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ'' **لقد من اللہ علی المومنین**'' (پ۴، ال عمران، ۱۶۳۳) '' بیشک اللہ نے بڑا انعام کیا مومنین پر'' علی المومنین میں مومنین جمع ہے۔ معلوم ہوا کہ ایک مومن سے لے کر قیامت تک کے مومن ''المومنین'' کے اندر شامل ہوگئے۔ کوئی فرد باقی نہیں رہا۔ خواہ وہ حضور اکرم ﷺ کے زمانہ میں ہوں، پہلے ہوں، بعد میں ہوں، کہیں ہوں وہ سب ''المومنین'' کے عموم میں شامل ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ'' اے ایمان والو! میں نے تم پر بڑا احسان کیا ہے'' اور وہ احسان یہ ہے کہ'' وہ محبوب تمہیں عطا فرمایا ہے جو تم پر اللہ کی آیات تلاوت کرتا ہے اور وہ علم وحکمت تمہیں سکھاتا ہے اور وہ تمہیں پاک کرتا ہے۔''

عزیزانِ محترم! وقت نہیں ہے کہ اس آیت پر تقریر کروں۔ میں فقط'' **یزکی**'' پر گفتگو کر کے بات کو آگے بڑھاتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ'' **یزکیھم**'' **یزکیھم** میں جو ضمیر ہے وہ منصوب ہے اور'' **یزکیھم** '' میں اس ضمیر منصوب کا مرجع کون ہے؟ ''المومنین'' ہیں۔ تو یہ ایک کھلی ہوئی بات ہے کہ'' المومنین'' میں

سارے مومن آگئے خواہ کسی زمانہ سے تعلق رکھتے ہوں۔ ابتداء سے قیامت تک سب مومن آگئے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میرا رسول سب مومنین کو پاک کرتا ہے۔ اب میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ رسول پاک کرنے والے ہیں اور مومن پاک ہونے والے ہیں تو جب تک پاک کرنے والا پاک ہونے والے سے نہ ملے تو پاک ہونے والے، پاک کیسے ہوں گے؟ دیکھئے میں مثال دیتا ہوں کہ یہ میرا کپڑا ناپاک ہوگیا ہے۔ تو کیسے پاک ہوگا؟ اور کون سی چیز پاک کرے گی اور کیسے پاک ہوگا؟ تو پانی سے پاک ہوگا۔ اگر ناپاک کپڑا یہاں ہو اور پانی وہاں تو کیا ناپاک کپڑا پاک ہوجائے گا ہرگز نہیں ہوگا، جب تک یہ پانی سے نہ ملے گا پاک نہیں ہوسکتا۔ تو جب تک رسول اور مومن کا ملاپ نہ ہو مومن پاک ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ میں نہیں قرآن کہتا ہے۔'' **النبی اولی بالمومنین من انفسھم**'' (پ۲۱، الاحزاب، ۶) ''یہ نبی ایمان والوں کے ان کی جانوں سے زیادہ قریب ہیں۔'' (یعنی تمہاری جانیں تو تم سے دور ہوسکتی ہیں مگر نبی تمہاری جانوں سے دور نہیں ہوسکتے) **النبی اولیٰ بالمومنین**۔ میں **اولی** کے معنیٰ تین ہیں۔

۱) اولیٰ......اقرب......سب سے زیادہ قریب۔

۲) اولیٰ......بالتصرف......سب سے زیادہ تصرف والا۔

۳) اولیٰ......احب......سب سے زیادہ پیارا۔

۱) اولیٰ کے جتنے معنی دنیا میں ہوسکتے ہیں وہ تمام معنی ان معنوں میں آسکتے ہیں اور ان تین معنوں کا مفہوم (۱) ایک لفظ اقرب میں آجاتا ہے گویا اقرب کے اندر سب معنیٰ آگئے۔

۲) اولیٰ بالتصرف کون ہوتا ہے؟ یعنی تصرف کا سب سے زیادہ حق دار کون ہوتا ہے؟ ......جو قرابت میں سب سے زیادہ قربت والا ہو۔ میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ ایک نابالغ بچی ہے کہ اس کا باپ بھی زندہ ہے اور دادا بھی۔'' دادی'' تو دونوں ہیں۔ لیکن اولیٰ

بالتصرف باپ ہے نہ کہ دادا، کیونکہ دادا کا رشتہ باپ کے مقابلے میں دور کا ہے معلوم ہوا جو اقرب ہوتا ہے وہی اولیٰ بالتصرف ہوتا ہے۔

۳) اسی طرح احب کے معنیٰ میں بھی اولیٰ ہوتا ہے۔لفظِ اولیٰ۔احب کے معنیٰ میں اور احب کے معنیٰ زیادہ محبوب کے ہیں۔محبت کیلئے ظاہری فاصلے کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔محبوب وہی ہوتا ہے جو دل و جان سے زیادہ قریب ہو۔اگر دل میں محبت نہ ہو تو زندگی ساتھ گزار دیجئے فاصلے ختم نہیں ہوتے اور اگر محبت کا جذبہ پیدا ہو جائے تو ایک لمحہ ملاپ کا ساری زندگی پر محیط ہو جاتا ہے۔محبت تو کہتے ہی قربت کو ہیں۔

دور ہو کر بھی قریب ہوتے ہیں
فاصلے بھی عجیب ہوتے ہیں

اللہ تعالیٰ نے فرمایا" **النبی اولیٰ بالمومنین من انفسھم**"" یہ نبی ایمان والوں کے ساتھ ان کی جانوں سے زیادہ قریب ہیں۔" (پ۲۱، الاحزاب ۲۱) گویا نبی محترم ایمان والوں کے ساتھ اتنے قریب ہیں کہ ان کی جانوں سے بھی زیادہ قریب ہیں۔میرا ایمان ہے کہ میری جان مجھ سے دور ہو سکتی ہے مگر مصطفیٰ ﷺ مجھ سے دور نہیں ہو سکتے۔

شبہ:

اب اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ بھائی! وہ قریب ہیں تو کہاں ہیں؟ نظر نہیں آتے۔ ہم ان کی بات سن نہیں سکتے۔ان سے ہم کلام نہیں ہو سکتے۔

شبہ کا ازالہ:

اے خدا کے بندے! مصطفیٰ ﷺ کو دیکھنے کیلئے آنکھ چاہیے۔ہر آنکھ ان کے دیدار کی تاب کہاں رکھ سکتی ہے اور پھر سب کو محبوب دکھائی بھی نہیں جاتے۔میں کہتا ہوں کہ حضور ﷺ نور اللہ ہیں، نور اللہ ہیں، نور اللہ ہیں اور یہ بات ذہن میں رکھئے کہ نور کو نور کے بغیر دیکھا بھی نہیں جا سکتا، دیکھو بھائی! سورج نور ہے، سورج کی روشنی وہ

نور ہے، کہ جس کی آنکھ میں نور نہ ہو وہ سورج کی روشنی کو نہیں دیکھ سکتا۔اگر ایک اندھے کو پکڑ کر کہیں کہ تو سورج کی روشنی کو دیکھ، وہ بیچارہ نہیں دیکھ سکے گا۔وہ معذور ہے کیونکہ وہ نور اسکی آنکھ میں ہے ہی نہیں جس کی مدد سے وہ سورج کی روشنی کو دیکھ سکے۔تو پتہ یہ چلا کہ نور کو دیکھنے کیلئے نور ہی کی ضرورت ہوتی ہے۔نابینا کی آنکھ میں نور ہی نہیں ہے تو وہ آفتاب کی روشنی کیا دیکھ سکے گا؟ وہ بیچارہ محروم رہے گا۔

تو اب معلوم ہوا کہ اگر تمہیں رسول اکرم ﷺ نظر نہیں آتے تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ نور نہیں ہیں بلکہ تم خود بے نور ہو۔اگر نابینا کو سورج کی روشنی نظر نہ آئے۔اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ سورج روشن نہیں ہے بلکہ یوں کہو کہ نابینا کے اندر بینائی نہیں ہے۔میرے آقا ﷺ اگر کسی کو نظر نہ آئیں تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ موجود نہیں ہیں یا نور نہیں ہیں بلکہ یہ کہو کہ دیکھنے والے کو وہ نور میسر نہیں ہے جو ان کا دیدار کر سکے کیونکہ "نور کے بغیر نور کا ادراک نہیں ہوا کرتا۔"

عزیزانِ محترم! فرشتوں کے نور ہونے میں تو کسی کو کوئی اختلاف نہیں ہے۔مسلم شریف کی صحیح حدیث ہے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے۔" **قال قال رسول اللہ ﷺ خلقت الملئکة من نور**" فرشتوں کو نور سے پیدا کیا گیا ہے۔" حالانکہ دائیں بائیں، آگے پیچھے نورانی فرشتے موجود ہیں۔اگر تم ذرا سی بتی جلا دو تو پورا کمرہ روشن ہو جاتا ہے اور تم سب کچھ دیکھ لیتے ہو۔مگر تمہارے ارد گرد فرشتے ہیں تمہیں تب بھی کچھ نظر نہیں آتا۔ارے اللہ کے فرشتے تو نور ہیں مگر تمہارے اندر ان کے نور کو دیکھنے کیلئے نور نہیں ہے۔میرے آقا ﷺ کے نور کا انکار کرنا دراصل حضور کے نور کا انکار کرنا نہیں بلکہ اپنی بے نوری کا اقرار کرنا ہے۔

آنکھ والا تیرے جلوے کا تماشا دیکھے
دیدہ کور کو کیا آئے نظر کیا دیکھے

آنکھ والے نے جمالِ مصطفیٰ کو دیکھا۔اب اگر واقعات آپ کے سامنے لاؤں تو

سنتے سنتے تھک جائیں گے مگر میں کہتے کہتے نہیں تھکوں گا۔ مگر کیا کروں، اتنا وقت کہاں سے لاؤں۔ حدیث کے حوالہ سے مختصر سی بات آپ کے سامنے بیان کرتا ہوں۔ ایک مرتبہ رسول اکرم ﷺ صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ طوافِ کعبہ فرمارہے تھے۔ حضور ﷺ نے سات چکر پورے کیے، آبِ زم زم نوش فرمایا پھر مقامِ ابراہیم پر کھڑے ہوگئے جیسے آپ کسی کا انتظار فرمارہے ہوں۔ صحابہ بھی طوافِ کعبہ کررہے ہیں، انھوں نے ایک اجنبی شخص کو دیکھا جو طوافِ کعبہ فرمارہا تھا چنانچہ وہ مقامِ ابراہیم پر حضور ﷺ سے ملے، سلام کیا، مصافحہ کیا اور چل دیے۔ صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ یہ کون تھے؟ سرکار ﷺ نے فرمایا ''کیا تم نے ان کو دیکھا'' صحابہ کرام علیہم الرضوان نے عرض کیا، ہاں، ہم نے ان کو دیکھا، سرکار ﷺ نے فرمایا ''یہ عیسیٰ بن مریم (علیہ السلام) مجھے سلام کرنے آئے تھے۔ ابن عدی نے اس حدیث کو روایت کیا اور انس بن مالک اس حدیث کے راوی ہیں۔ اس وقت تو یہ کتاب میرے پاس موجود نہیں ہے۔ لیکن تفسیر روح البیان تمہارے پاس ضرور ہوگی جو علامہ اسمٰعیل حقی حنفی رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیف ہے۔ یہ حدیث تفسیرِ روح البیان میں بھی آئی ہے۔ آپ یہ جانتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام آسمانوں پر ہیں اور آپ آسمان سے قربِ قیامت میں اتریں گے۔ یہ تمام باتیں احادیث سے ثابت ہیں۔'' اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا حضرت عیسیٰ علیہ السلام آسمانوں سے نہیں آئے تھے؟ یقیناً وہیں سے آئے تھے لیکن اس وقت بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام آسمانوں پر موجود تھے وہ اس لیے کہ ابھی آپ کے نزول کا وقت نہیں آیا۔ گویا آپ آسمان پر موجود تھے اور آسمانوں ہی سے آئے تھے تو پتہ چلا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام آسمانوں پر موجود ہیں اور زمین پر بھی موجود ہیں تو اگر عیسیٰ علیہ السلام آسمانوں پر اور زمینوں پر ایک ہی وقت میں موجود ہوسکتے ہیں۔ تو کیا میرے آقا، مومن کے دل میں اور باہر نہیں ہوسکتے؟ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کعبہ کا طواف کررہے ہیں پھر اسی وقت آسمانوں پر بھی جلوہ گر ہیں ...... اور پھر قلبِ مومن وہ کعبہ ہے کہ '' دل بدست آور کہ حجِ اکبر

است'' اس لیے میرے محبوب حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ قلبِ مومن کے اندر جلوہ گر ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ''**النبی اولیٰ بالمومنین من انفسھم**'' (پ ۲۱، الاحزاب، ۵) ''یہ نبی ایمان والوں کے ساتھ ان کی جانوں سے زیادہ قریب ہیں۔'' گویا نبی محترم ایمان والوں کے ساتھ ان کی جانوں سے زیادہ قریب ہیں۔ ایمان والو! تمہاری جانیں تم سے دور ہوسکتی ہیں مگر مصطفیٰ ﷺ تم سے دور نہیں ہوسکتے۔ دور ہونا ان کی شان ہی نہیں۔ اگر ہم دور ہوجائیں تو یہ ہماری بدبختی اور بدنصیبی ہے۔''

شبہ:

آپ دل میں سوچیں گے کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ کہ ہم دور ہوجائیں اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام ہم سے دور نہ ہوں؟

شبہ کا ازالہ:

''گرمیوں کے زمانہ میں جبکہ سورج اپنی تمازت کے ساتھ تمام چیزوں کو گرم کررہا ہوتا ہے تو اس وقت آپ نے شامیانہ لگایا اور اسکے نیچے بیٹھ گئے۔ تو سورج کی دھوپ جو کہ سورج کا غیر نہیں ہے۔ آپ پر نہیں پڑ رہی ہے کیونکہ آپ شامیانہ کا حجاب لگا کر خود سورج کی ضیاء سے دور ہوگئے ہیں۔ گویا ہم حجاب کی وجہ سے دور ہوگئے۔ گناہوں کے، غفلت کے معصیت کے اور بشریت کے تقاضوں کے حجابات ہمارے اور رسول کے درمیان حائل ہوگئے۔ حضور تو ہم سے جدا نہیں ہیں۔ ہم یہ حجابات ڈال کر خود حضور سے جدا ہوگئے ہیں۔''

شبہ:

کسی صاحب نے کہا کہ تم نبیوں کو شہیدوں اور ولیوں کو خدا تک پہنچنے کا وسیلہ قرار کیوں دیتے ہو؟ ایسا کرنا تو گویا خدا کو دنیا کے بادشاہوں پر قیاس کرنا ہے؟ تو تم نے خدا کی توہین کردی۔ کیونکہ خدا تک پہنچنے کیلئے کسی وسیلہ کی ضرورت نہیں ہے۔ اللہ

تعالیٰ فرماتا ہے'' **ونحن اقرب الیه من حبل الورید**'' اورہم اس کی شہ رگ سے زیادہ اسکے قریب ہیں۔'' وسیلہ تو صرف ایک چیز تک پہنچنے کیلئے اختیار کیا جاتا ہے جو دور ہو جیسے چھت پر پہنچنے کیلئے سیڑھی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لیے کہ ہم چھت سے دور ہیں اور چھت ہم سے دور ہے۔ بغیر سیڑھی کے ہم چھت کے قریب نہیں جا سکتے۔

شبہ کا ازالہ:

میں نے کہا کہ خدا کو کون دور کہتا ہے؟ خدا تو دور نہیں ہے لیکن ایک بات میں نے اور بھی کہہ دی کہ جو قریب ہوگا وہ قریب کی آواز سنے گا یا دور کی؟ وہ قریب ہی کی آواز سنے گا۔ دور کی آواز کون سنتا ہے جو دور ہو۔ تو پھر تمہارا یہ کہنا کہ'' دور کی آواز تو خدا ہی سنتا ہے'' اس کا مطلب یہ ہوا کہ خدا دور ہے جو دور کی آواز سنتا ہے تو یہاں تم'' **نحن اقرب الیه من حبل الورید**'' کیوں بھول گئے؟ خدا تو شہ رگ سے زیادہ قریب ہے۔ وہ تو دور ہے ہی نہیں تو پھر تم ہی دور کی آواز کس کو سنا رہے ہو؟ گویا تمہیں خدا کا قریب ہونا اس وقت یاد آتا ہے جب اللہ کے محبوب اور مقبول بندوں کی عظمت اور ان کے وسیلہ بننے کا بیان ہوتا ہے اور جب اللہ والوں کی سماعت کا ذکر ہوتا ہے کہ وہ دور سے بھی اپنے چاہنے والوں، ارادت مندوں کی پکار سن لیتے ہیں تو پھر تم اللہ کو دور لے جاتے ہو اور کہتے ہو کہ دور سے سننا یہ اللہ کی شان ہے۔ پتہ چلا کہ تمہیں اللہ کے قریب یا دور ہونے سے نہیں، اللہ والوں کی عظمت و شان کے انکار سے غرض ہے..... تو میں نے بتایا کہ خدا تو ہم سے دور نہیں لیکن ہم خدا سے دور ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم خدا کی بارگاہ میں رسائی کیلئے وسیلہ پکڑتے ہیں۔ یہ میں نہیں کہتا، خدا خود کہتا ہے۔'' **یا ایها الذین اٰمنو اتقو االله وابتغو الیه الوسیله**''
اے ایمان والو تقویٰ اختیار کرو اور وسیلہ ڈھونڈو۔''

اور مجھے بخاری شریف کی حدیث بھی یاد آرہی ہے کہ اے میرے صحابہ! تمہیں

اللہ تعالیٰ رزق دیتا ہے، باران رحمت دیتا ہے، دشمنوں پر فتح عطا فرماتا ہے۔ سرکار نے یہ تین باتیں فرمائیں۔ فرمایا'' **هل تنصرون وهل ترزقون وصل ترحمون الا بضعفائکم**'' کہ تم کو بارانِ رحمت اور فتح اور روزی نہیں ملتی مگر اپنے ناچار اور غریبوں کے سبب سے۔'' انہیں کے وسیلہ سے انہیں کے صدقہ سے رزق، بارانِ رحمت اور دشمنوں پر فتح حاصل ہوتی ہے۔'' اے مدینہ کے رہنے والو! اہلِ صفہ کو ذہن میں لاؤ جن پر منافقین آوازے کسا کرتے تھے۔ سرکار نے فرمایا'' تم یہ سمجھتے ہو کہ ہمارے لیے بارش ہوتی ہے ہمارے لیے رزق آتا ہے، ہمارے لیے اللہ تعالیٰ کی نعمتیں آتی ہیں۔ نہیں نہیں بلکہ انہیں کیلئے سب کچھ آتا ہے اور انہیں کے صدقے میں تم کو بھی مل جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت کی ہوائیں اپنے محبوبوں ولیوں کیلئے بھیجیں اور جو اُن کے قریب ہیں ان پر بھی وہی رحمت کی ہوائیں پہنچ جاتی ہیں۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ جب کھیتی باڑی ہوتی ہے تو آپ ان پودوں کو پانی دیتے ہیں جو پودے آپ اگاتے ہیں۔ خواہ وہ سبزیاں ہوں یا غلہ، پھل دار درخت ہوں یا غیر پھلدار مگر پانی خودرو پودوں کو بھی مل جاتا ہے۔ یہ حضرات اصل مقصد کائنات ہیں اس لیے فرمایا'' **بحق هل تنصرون، وهل ترزقون، وهل ترحمون الا بضعفائکم**'' ارے انہیں کے صدقہ میں تمہیں سب کچھ ملتا ہے۔''



70

بسم اللہ الرحمن الرحیم

باب نمبر 8

افکارِ کاظمی رحمۃ اللہ علیہ

غزالئ زماںؒ کا ایک فکر انگیز انٹرویو

سوال: مغربی مفکرین کی طرز پر بعض مسلم سیرت نگاروں میں بھی یہ رجحان پیدا ہو رہا ہے کہ حضور اکرم ﷺ کو اپنے جیسا ایک عام بشر متصور کرتے ہوئے سیرت نبوی ﷺ کا مطالعہ کیا جائے۔ آپ کا اس بارے میں کیا خیال ہے؟

جواب: دیکھئے اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے مقصد تخلیق کی تکمیل کیلئے انبیاء کرام علیہم السلام کو بھیجا اب وہ انبیاء بھی اگر اپنی بشری کمزوریوں میں مبتلا ہوں تو پھر ان کی نبوت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس لیے یہ بات طے شدہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی جسمانی قوت عام انسانی قوت سے بہت بلند و بالا اور انبیاء علیہم السلام قوی تر ہوتے ہیں۔ ان کی روحانیت بہت عظیم ہوتی ہے۔ ان کا علم بہت کامل ہوتا ہے۔ ان کے اخلاق، اخلاقِ عظیم ہوتے ہیں۔ ان کا ہر قول ان کا ہر فعل نبی اور رسول ہونے کی حیثیت سے شرع کی دلیل اور منجانب اللہ ہوتا ہے بلکہ مختصرا یوں کہئے کہ نبی اپنے علم کے اعتبار سے اپنے عمل کے اعتبار سے، اپنے اخلاق کے اعتبار سے ساری کائنات سے بلند ہوتا ہے۔

دوسری بات عرض کروں کہ جس طرح اللہ کے حکم پر تم کوئی دلیل طلب نہیں کر سکتے اسی طرح رسول ﷺ کے حکم پر بھی کوئی دلیل طلب نہیں کر سکتے۔ بغیر طلب دلیل تم پر واجب ہے کہ اللہ کی اطاعت کرو اور بغیر طلب دلیل کے تم پر واجب ہے کہ رسول کے حکم کی اطاعت کرو اور یہ اسی وقت ممکن ہے کہ جب رسول عام بشری کمزوریوں سے بالاتر ہو اگر اس کے اندر بشری کمزوریاں ہیں اور اگر وہ غلطی کرتا ہے۔ اگر وہ گنہگار ہو سکتا ہے تو پھر اس کی اطاعت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور اس کی اطاعت کا بلا طلب دلیل واجب الاتباع ہونا متصور ہی نہیں ہو سکتا۔

سوال: تمام افراد، ادارے اور تنظیمیں حضور ﷺ کی محبت کی مدعی ہیں ایسی صورت میں ہم کس گروہ کو حضور اکرم ﷺ کا محب قرار دے کر صحیح سمجھیں؟

جواب: اس کا جواب یہ ہے کہ محبت کا صحیح معیار نہ ملنے کی وجہ سے ہم اس مشکل کو

حل کرنے سے عاجز رہتے ہیں۔ آیئے دینِ متین کی روشنی میں محبت کا صحیح معیار پہلے تلاش کریں۔ ایک معیار تو نبی پاک ﷺ نے خود ارشاد فرما دیا "**حبك الشي يعمي ويصم**" کسی چیز کی محبت تجھے اندھا کر دیتی ہے، بہرا کر دیتی ہے، یعنی محبت محبوب کا عیب دیکھنے نہیں دیتی اور محبوب کا عیب سننے نہیں دیتی۔ مطلب یہ ہوا کہ اگر محبوب میں عیب موجود ہو تب بھی محبت اندھا بہرا کر دیتی ہے، اور اگر محبوب بے عیب ہو، اس میں سرے سے نقص پیدا ہی نہ ہوا ہو تو اس میں عیب دیکھنے بلکہ ڈھونڈنے والے تلاش کرنے والے اور اس خود تراشیدہ عیب کا چرچا کرنے والے دعویٔ محبت میں سچے کیسے ہو سکتے ہیں۔

سوال: آپ تحریکِ پاکستان کے ہراول دستے میں شامل تھے۔ براہِ کرم یہ ارشاد فرمائیں کہ تحریکِ پاکستان جن حالات میں شروع کی گئی اس کا پسِ منظر کیا تھا؟

جواب: قیامِ پاکستان کا محرک دراصل وہ جذبہ حریت تھا جو ہر مسلمان کے دل میں فطری طور پر پایا جاتا ہے۔ کوئی مسلمان اس بات کو گوارہ نہیں کر سکتا کہ وہ کافروں کے زیر اقتدار رہ کر زندگی بسر کرے۔ مسلمانوں کا یہی وہ جذبہ حریت تھا جس نے انہیں انگریزوں کے خلاف جہاد پر آمادہ کیا۔ عملی میدان میں قیامِ پاکستان کیلئے جو چیز محرک ثابت ہوئی وہ کانگریس کی اسلام دشمنی تھی۔ ہندوؤں کا پروگرام یہ تھا کہ وہ مسلمانوں کو اپنا آلہ کار بنا کر انگریز سے اقتدار حاصل کریں۔ ہندوؤں کی اس چال کو سب سے پہلے علماء اہلسنت نے بھانپا چنانچہ اعلیٰحضرت فاضلِ بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کی تحریریں اس سلسلے میں بڑی اہم ہیں جنھوں نے دو قومی نظریے کو عوام کے سامنے واضح کیا۔ دو قومی نظریے کے سلسلے میں اعلیٰحضرت رحمۃ اللہ علیہ کی خدمات جاننی ہوں تو ان کی کتاب "المحجۃ الموتمنہ فی آیۃ الممتحنہ" دیکھنی چاہیے اس کتاب کے مطالعے سے ان کی خدمات کا صحیح اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

سوال: کیا آپ تحریکِ پاکستان کے سلسلے میں علماء کے کردار پر روشنی ڈالنا پسند

فرمائیں گے؟

جواب: اصل بات یہ ہے کہ قیامِ پاکستان کے سلسلے میں ہمارے ملک کے علماء کرام اور مشائخ عظام نے بڑا نمایاں کردار ادا کیا اور ان کی یہ خدمات بنیادی حیثیت رکھتی ہیں ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں حضرت علامہ فضلِ حق خیر آبادی رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے رفقاء نے عملاً انگریز کے خلاف جہاد کا آغاز کیا اور یہ ایسی تاریخی حقیقت ہے جس سے کوئی شخص بھی انکار نہیں کر سکتا۔ پھر جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا۔ اعلیٰحضرت فاضلِ بریلوی رحمۃ اللہ علیہ نے ہندوؤں کے ساتھ موالات اور اشتراک عمل کی شدید مخالفت کی اور یہ مسلم قومیت کے نظریہ کو اجاگر کیا اور میں سمجھتا ہوں کہ اعلیٰحضرت رحمۃ اللہ علیہ کے اسی نظریے کی اساس پر پاکستان کی تعمیر و تشکیل کی خاطر علماء و مشائخ نے جدوجہد فرمائی۔

سوال: حضرت! تحریکِ پاکستان کے حوالے سے بنارس سنی کانفرنس کی آپ کے نزدیک کیا اہمیت ہے؟

جواب: اس فقیر نے تحریکِ پاکستان کے کئی مناظر اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں، پٹنہ کانفرنس اور اجمیر کانفرنس بھی اسی جدوجہد آزادی کی مظہر تھیں ان کانفرنسوں کا مقصد ہی مسلم قومیت کا تشخص پیدا کرنا اور ہندو لیڈروں کے دام ہم رنگ ذہن سے مسلمانوں کو بچانا تھا...... ۱۹۴۶ء میں منعقد ہونے والی آل انڈیا بنارس سنی کانفرنس کو ہم تحریکِ پاکستان کا سنگ میل قرار دے سکتے ہیں۔ اس کانفرنس کے بانی مبانی حضرت مولانا نعیم الدین مراد آبادی رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ اپریل ۱۹۴۶ء میں عین وسط ہند میں بنارس کے مقام پر امیرِ ملت پیر سید جماعت علی شاہ علی پوری رحمۃ اللہ علیہ کی زیرِ صدارت یہ کانفرنس منعقد ہوئی جس میں ہزاروں مشائخ اہلسنت تقریباً سات ہزار سے زائد علماء اور دو لاکھ سے زائد عوامِ اہلسنت نے شرکت کی۔

میں خود اس کانفرنس میں شریک تھا اس کانفرنس میں اس امر کی تجدید کی گئی کہ

اسلامی اصول کے مطابق پاکستان کے حصول کیلئے مسلم لیگ کی بھرپور حمایت کی جائے گی۔ اس کانفرنس میں تمام اہلسنت نے بالاتفاق قائدِ اعظم محمد علی جناح رحمۃ اللہ علیہ کو حصولِ پاکستان کے مقدمے کا وکیل منتخب کیا یہ وہ دور تھا جبکہ اہلسنت کے مخالف علماء وطن کو قومیت کی بنیاد قرار دے کر گاندھی اور نہرو کی حمایت میں خود مسلمانوں سے برسرِ پیکار تھے۔

سوال: حضرت پاکستان بقول آپ کے اسلامی نظام کے قیام کی خاطر قائم کیا گیا تھا۔ مگر کیا وجہ ہے کہ پاکستان بننے کے بعد اس اہم مقصد کو پسِ پشت ڈال دیا گیا؟

جواب: قائداعظم اسلام کے بارے میں قطعی مخلص تھے اور مرحوم لیاقت علی خان نے بھی جو قرارداد مقاصد منظور کی وہ اسلامی نظام کے سلسلے میں بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ اگر قائداعظم اور قائدِ ملت لیاقت علی خان کو موقع ملتا تو میرا حسنِ ظن یہ ہے کہ وہ اسلامی نظام نافذ کرنے کے سلسلے میں کسی حیل وحجت سے کام نہ لیتے۔ لیکن افسوس کہ ان کی وفات کے بعد مسلم لیگ کے وہ لوگ آگے آگئے جو مغربیت سے حد درجہ متاثر تھے۔ ان لوگوں نے فیشن کے طور پر اسلام کا نام تو لیا لیکن عملاً اس کیلئے کچھ بھی نہ کیا۔ اگر یہ لوگ مخلص ہوتے اور اخلاص کے ساتھ اس مقصد کی جانب توجہ دیتے تو یقیناً اب تک وطنِ عزیز میں نظام مصطفیٰ ﷺ نافذ ہو چکا ہوتا۔ میرے خیال میں پاکستان میں اسلامی نظام نافذ نہ ہونے کی تمام تر ذمہ داری انہی مغرب زدہ افراد پر عائد ہوتی ہے جن کے ہاتھ میں قائداعظم اور قائدملت کے بعد اس ملک کی زمام اقتدار رہی۔

سوال: آپ نے تحریکِ پاکستان میں نہایت سرگرمی سے حصہ لیا۔ اور مسلم لیگ کی قیادت کو بھی نہایت قریب سے دیکھنے کا آپ کو موقع ملا، یہ فرمائیے کہ بعض افراد کا یہ خیال کہ قائداعظم پاکستان کو ایک سیکولر ریاست بنانا چاہتے تھے۔ یہ کہاں تک درست ہے؟

جواب: میں پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ قائداعظم مرحوم کے ذہن میں

اس بنیادی نکتہ کی وہی تشریح تھی جس کو پہلے دن سے جمہوریت مسلمہ پیش کر رہی ہے۔ یعنی ہماری قومیت عین اسلام ہے اور اسلام عین قومیت۔ لہٰذا تسلیم کرنا پڑے گا کہ پاکستان کی بنیاد صرف اسلام ہے اور اس کا خالص نظام۔

اگر قائداعظم مرحوم آج دنیا میں موجود ہوتے تو اس حقیقت سے ہرگز انکار نہیں کر سکتے تھے۔ کیونکہ انھوں نے مطالبہ پاکستان پر ساری قوم کو اسلام ہی کے نام پر متفق کیا تھا اور قائدملت مرحوم کی زندگی میں ۲۱ ستمبر ۱۹۴۹ء کو سابق مجلس دستور پاکستان نے قرارداد مقاصد کو منظور کر کے میرے اس دعوٰی پر مہر تصدیق ثبت کر دی۔ ان ناقابلِ انکار حقیقتوں کی روشنی کا یہ مطالبہ بالکل درست ہے کہ دستور پاکستان وہی ہونا چاہیے جو کتاب وسنت کی رو سے اسلامی دستور ہو۔

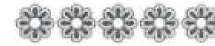
سوال: وطنِ عزیز میں نفاذ شریعت کے علمبردار ایک گروہ کا خیال ہے کہ قرآن و حدیث کو براہِ راست سمجھنا چاہیے اور اس کیلئے ایسی مستقل قوت اجتہادیہ درکار ہے جو مجتہدین سلف میں سے کسی ایک کے علوم ومنہاج کا پابند نہ ہو۔ اس گروہ کے خیال میں ایک صحیح اسلامی ریاست کسی متعین امام کی تقلید اور متعین فقہ کی پیروی کے اصول پر قائم ہوسکتی ہے۔ آپ کی اس بارے میں کیا رائے ہے؟

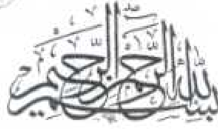
جواب: میرے خیال میں یہ مجموعہ ہائے قوانین جس کو ہم فقہ سے تعبیر کرتے ہیں کتاب وسنت سے علیحدہ کوئی چیز نہیں بلکہ جس طرح سنت، کتاب اللہ کا عطر ہے بالکل اسی طرح فقہ یعنی ائمہ اربعہ میں سے ہر ایک کا تدوین کردہ مجموعہ قوانین سنت کا ثمرہ ہے۔ یعنی ایسے مجتہدین جن کو قربِ زمانہ رسالت اور غایت تقوٰی وطہارت اور کمال نور فراست کے باعث یہ خدمت کرنے کا زیادہ حق تھا۔ انھوں نے کتاب وسنت کا خلاصہ فقہ کی صورت میں مرتب کیا ہے۔

ان مجموعہ ہائے قوانین میں عبادات، معاملات، امور سیاست غرض ہر قسم کے احکام کے جزیات ہیں جن کی روشنی میں ہر پیش آمدہ جدید سے جدید اور غریب سے

غریب مسئلہ کا حکم کتاب وسنت سے مستنبط کرلیا جاتا ہے۔ یہی امت وہ مقید اور غیر مستقل اجتہاد ہے جس کا دروازہ امت مسلمہ پر کبھی بند نہیں ہوا اور نہ آئندہ بند ہوگا۔ ہاں جدید مستقل اور اجتہاد مطلق کا دروازہ کھول کر فقہ متعین اور اصول ومنہاج ائمہ سے مستغنیٰ وبے نیاز ہوجانا یقیناً مذہب میں انتشار و پراگندگی پیدا کرنے کے مترادف ہوگا۔

یہ مجموعہ ہائے قوانین ایسا بیش بہا سرمایہ اور نسخہ ہائے حیات ہیں کہ اگر ہم نے اجتہاد کے شوق میں ان کو بالکل نظر انداز کردیا تو ہمارا یہ طرز عمل ساری قوم بلکہ قیامت تک آنے والی نسلوں کیلئے بھی بڑی بدقسمتی کا موجب ہوگا اور اتنا بڑا قومی و مذہبی نقصان ہوگا جس کا تدراک آئندہ رہتی دنیا تک محال نظر آتا ہے۔





باب نمبر 9

حضرت غزالئی زماں اور تحریکِ ختمِ نُبوت

از (ر) صوبیدار جلال الدین ڈیروی

ماہنامہ السعید امام اہل سنت نمبر ۲۰۰۱ صفحہ ۳۳ تا ۴۴

صوبیدار جلال الدین ڈیروی لکھتے ہیں کہ حضرت قبلہ کاظمی ﷫ کی شخصیت محتاج تعارف نہیں، انھوں نے زندگی بھر اسلام کی بھرپور خدمت کی، وہ بعض ابن الوقت اور زکوٰۃ خور مولویوں کی طرح ہوا کا رخ دیکھ کر اپنے اہداف کا تعین نہیں کرتے تھے، ان کا ظاہر و باطن یکساں تھا۔ وہ اسلام کے اصولوں پر کسی قسم کا سمجھوتہ کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے تھے۔ گمراہ فرقوں کے لوگوں نے تشدد سے بھی کام لیا اور خوشامد کا ہتھیار بھی استعمال کیا لیکن وہ انہیں اپنے مشن سے باز رکھنے میں کامیاب نہیں ہوئے، وہ جن عقائد ونظریات کو صحیح سمجھ کر قبول کر چکے تھے، زندگی کی آخری سانس تک ان پر نہ صرف کار بند رہے بلکہ دوسروں کو بھی وہی عقائد اپنانے کی تلقین کرتے تھے، یہی وجہ ہے کہ جس طرح انھوں نے دیگر بد مذہب جماعتوں کا ہر محاذ پر کامیاب مقابلہ کیا، اس سے بھی زیادہ شدت کے ساتھ قادیانیوں کے خلاف نبرد آزما رہے۔

قیامِ پاکستان کے فوراً بعد مرزائیوں نے حکومت کے مختلف شعبوں پر اپنی گرفت مضبوط کرنے کی کوشش کی اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ اپنے اس مشن میں کسی حد تک کامیاب بھی ہوگئے، حضرت قبلہ کاظمی رحمۃ اللہ علیہ اس صورتحال کو تشویش کی نگاہ سے دیکھتے تھے، اس لیے انھون نے ایک جانب سنی علماء ومشائخ کی قوت کو یکجا کرنے کیلئے ۱۹۴۸ء میں جمعیت علماء پاکستان کے نام سے ایک علیحدہ تنظیم قائم کی تو دوسری طرف مسلم لیگ میں اپنے بے پناہ اثر ورسوخ کو استعمال کرتے ہوئے قادیانیوں کی قوت پر کاری ضرب لگانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا، علاوہ ازیں انھوں نے اپنی مؤثر تحریروں کے ذریعے بھی مرزائیوں کا راستہ روکنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ اس طرح انھوں نے اس خطرناک فرقہ کو کیفر کردار تک پہنچانے کے سلسلہ میں جو بے مثال، ناقابلِ فراموش اور قابلِ تقلید کارگردگی کا مظاہرہ کیا وہ ہم سب کیلئے مشعلِ راہ ہے، اس کی ایک جھلک آئندہ سطور میں ملاحظہ فرمائیں۔

حضرت مفتی محمد ابراہیم القادری الرضوی رقمطراز ہیں ”غالباً یہ ۱۹۸۱ء کی بات ہے کہ

حضرت قبلہ کاظمی ﷫ سکھر میں جامع مسجد آدم شاہ کے افتتاح کیلئے تشریف لائے، آپ نے رات کے جلسہ میں قادیانیوں کے خلاف اپنی خدمات کے ضمن میں ایک دفعہ ارشاد فرمایا کہ میں کمسن تھا، ابھی میرے داڑھی نہیں اتری تھی کہ میں قادیان گیا اور قادیانی علماء سے مناظرہ کیا، میں نے ان سے پوچھا کہ بخاری شریف کی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ”میری اور گزشتہ انبیاء علیہم السلام کی مثال ایسی ہے جیسے کسی شخص نے ایک مکان بنایا، **فاکملھا فاحسنھا**، اس نے اسے مکمل اور حسین بنایا مگر اس میں ایک اینٹ کی جگہ چھوڑ دی، لوگ اس گھر میں داخل ہوتے ہیں اور اس کے حسنِ تعمیر پر تعجب کرتے ہیں اور کہتے ہیں کاش یہ اینٹ کی جگہ خالی نہ ہوتی، حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میں ہی وہ اینٹ ہوں۔

میں نے قادیانی علماء سے پوچھا کہ نبوت کی عمارت میں فقط ایک اینٹ کی گنجائش تھی جسے حضور سید عالم ﷺ نے پُر کر دیا۔ اب تم بتاؤ کہ مرزا غلام احمد قادیانی کو کہاں ڈالو گے؟ وہ سب سوچ میں پڑ گئے، پھر ان میں سے ایک بولا: عزیز! بات یہ ہے کہ جب عمارت بنائی جاتی ہے تو اس کا پلستر بھی کیا جاتا ہے تو ہم مرزا صاحب کا پلستر کر دیں گے۔ میں نے کہا تم مرزا صاحب کا پلستر بھی نہیں کر سکتے۔ سرکار نے فرمایا ”فاکملھا“ بنانے والے نے عمارت کو مکمل کر دیا اور پلستر کے بغیر عمارت مکمل نہیں ہو سکتی۔

پھر ایک اور نے ہمت کی۔ وہ کہنے لگا کہ دیکھو عزیز! ٹھیک ہے پلستر کے بغیر عمارت مکمل نہیں ہوتی عمارت کا رنگ و روغن بھی تو کیا جاتا ہے۔ ہم مرزا صاحب کا روغن کر دیں گے، آپ نے فرمایا تم مرزا صاحب کا روغن بھی نہیں کر سکتے، میرے آقا ﷺ نے فرما دیا ہے ”**فاحسنھا**“ بنانے والے نے عمارت کو حسین وجمیل بنایا اور عمارت کا حسن رنگ و روغن سے ہی ہوتا ہے، میرے استدلال نے ان کا ناطقہ بند کر دیا۔ ایک بار رات کے سناٹے میں قاضی شمس الدین رحمۃ اللہ علیہ کو بادشاہ (سلطان محمد تغلق) نے بلوایا، قاضی صاحب نے دیکھا کہ بادشاہ گھپ اندھیرے میں تنہا بیٹھا ہے، فرماتے ہیں کہ مجھ کو ڈر لگا کہ میرے کسی عزیز کو مارنے والا تو نہیں؟ کہ اچانک مجھ سے یوں مخاطب ہوا کہ ”اگر امروز کسے پیدا شود و

گویدکہ محمد ﷺ پیغامبر نہ بود است، منم، شماورا بکدام حجت ملزم کنید۔''

''آج اگر کوئی ایسا شخص پیدا ہو جائے جو یہ کہے کہ محمد ﷺ پیغمبر نہ تھے بلکہ میں پیغمبر ہوں تو تم اس کو کس دلیل سے ملزم ٹھہراؤ گے۔'' قاضی صاحب نے اس کے اشارے کو سمجھتے ہی فوراً جواب دیا کہ'' برائے آں حرامزادہ، دیوانہ واحمق، بدبخت و بے دولت راحجت چہ باشد، اقبال خوند عالم اسلام درشہر چناں قوت گرفتہ است کہ غلامان طباخان شہر فرزند عالم برغم پایچہ، بکشند۔'' (جوامع الکلم)

''ایسے حرامزادے، پاگل، بے عقل، بدنصیب اور کمینے، بے عزت کیلئے دلیل کی کیا حاجت ہے، آپ کا اقبال رہے کہ شہر میں اسلام نے ایسی قوت پکڑ لی ہے کہ بٹھیاروں کے غلام اس بدبخت کو پایچہ مار مار کر ہلاک کر دیں گے۔''

بجائے اپنی اصلاح کے (احقاق حق ابطال باطل کے سبب) سلطان علمائے حق ومشائخ اہلسنت سے بدظن ہونا شروع ہو گیا اور پھر تیسری جماعت (یزیدی گروہ) کا اثر اتنا رنگ لایا کہ سرِ مجلس ختمِ نبوت کے متعلق گستاخیاں شروع کر دیں، مثلاً ایک دن اس نے خواجہ شہاب الدین حق گو ؒ سے مطالبہ کیا کہ اس کو محمد عادل کہیں، انھوں نے جواباً فرمایا'' کہ میں ظالم کو عادل نہیں کہہ سکتا، پھر اس نے حضرت سے کہا کہ نبوت کے خاتمہ کو عقل تسلیم نہیں کرتی، اس فدائے نبوت نے فوراً اپنے پاؤں سے جوتی نکال کر سلطان کے منہ پر دے ماری جس کی سزا میں انہیں قلعے کے اوپر سے خندق میں ڈال دیا گیا۔

تاریخ کے صفحات میں اس قسم کے لاتعداد واقعات محفوظ ہیں جن کے مطالعہ سے سنی علماء ومشائخ کی یہ امتیازی حیثیت نکھر کر سامنے آتی ہے کہ انھوں نے ہر دور میں باطل قوتوں کا مردانہ وار مقابلہ کر کے مقامِ مصطفی ﷺ کے تحفظ کی خاطر اپنے خون کا آخری قطرہ تک بہادینے سے گریز نہیں کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی اسلام کے دشمن حضور ﷺ کی کسی قسم کی گستاخی کرنے سے قبل ہزار بار سوچتے ہیں کہ انہیں عظمتِ مصطفی

ﷺ کے محافظ کسی قیمت پر معاف نہیں کریں گے۔

دورِ غلامی میں جب مرزا غلام احمد قادیانی اور اس کے پیروکاروں نے مسلمانوں کو گمراہ کرنے اور ان میں انتشار پیدا کرنے کی مذموم کوشش کی تو سنی قائدین نے حکام وقت کی پرواہ کیے بغیر اس ٹولے کا ہر موڑ پر پیچھا کیا اور سادہ لوح مسلمانوں کو ان کے جال میں پھنسنے سے بچایا۔

تحریکِ پاکستان کی طرح تحریکِ ختمِ نبوت کے موضوع پر اہلسنت کے نقطہ نظر سے بہت کم لٹریچر دستیاب ہے۔ جس کی وجہ سے خوف خدا سے بے نیاز بعض مخالفین کو یہ بے بنیاد پروپیگنڈہ کرنے کا موقع ملا ہے کہ'' قیامِ پاکستان سے قبل تک قادیانیت کا مطالعہ کیجئے، آپ کو وہاں کوئی بریلوی نظر نہیں آئے گا۔'' (قاضی محمد اسلم سیف) مانا کہ جان بوجھ کر غلط بیانی سے کام لینا کوئی مستحسن اقدام نہیں لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ ان لوگوں کو تاریخ مسخ کرنے کا موقع کس نے فراہم کیا ہے؟ بات تلخ سہی لیکن اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ اس کے ذمہ دار خود سنی قائدین کے پڑھے لکھے مرید اور معتقدین ہیں۔ اگر وہ اپنے بزرگوں کے شاندار کارناموں کو جدید انداز میں مرتب کر کے منظرِ عام پر لاتے تو کسی کو اس قسم کی غلط بات لکھنے کی جرات نہ ہوتی، ضرورت اس امر کی ہے کہ قلم کی قوت کو تسلیم کرتے ہوئے اس اہم کام کی جانب بھرپور توجہ دی جائے اور اصل حقائق سامنے لائے جائیں۔

راقم تحریکِ ختم نبوت کے موضوع پر کام کر رہا ہے ظاہر ہے کہ اسے پایۂ تکمیل تک پہنچانے کیلئے کافی وقت درکار ہوگا۔ سردست محترم ولی محمد واجد صاحب'' مدیر ماہنامہ السعید'' ملتان کے بے حد اصرار پر تحریکِ ختمِ نبوت میں حضرت غزالئی زماں علامہ سید احمد سعید کاظمی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمات کا مختصر تذکرہ پیشِ خدمت ہے۔ حضرت صاحب کے چاہنے والوں سے معذرت خواہ ہوں کہ مواد کی کمی کی وجہ سے شایانِ شان مقالہ پیش نہ کر سکا، البتہ اگر کسی سچے عاشق نے مطلوبہ مواد فراہم کیا تو ان شاء اللہ یہ شکایت دور کر دی جائے گی۔ آئیے سب سے پہلے حضرت قبلہ کاظمی رحمۃ اللہ علیہ کے ہم مسلک علماء ومشائخ کی بے مثال طویل جدو

جہد پر ایک سرسری نظر ڈالتے ہیں۔

حضرت مولانا محمد منشاء تابش قصوری رقمطراز ہیں ”مرزا غلام احمد قادیانی ایک روز مولانا پیر حسن شاہ صاحب قادری کی خدمت میں حاضر ہوا تو حضرت نے اسے ہدایت فرمائی کہ عقیدہ اہلسنت و جماعت پر ثابت قدم رہنا اور خواہشاتِ نفسانیہ اور ہوائے شیطانہ کا غلام نہ بن جانا، جب یہ کلام حافظ عبدالوہاب صاحب (جو حضرت کے شاگرد اور مرید اور یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر تھے) نے سنا تو عرض کیا، حضور آپ نے اسے جس طرح ہدایت فرمائی ہے اس کی کیا وجہ ہے؟ ارشاد فرمایا کہ کچھ مدت بعد اس شخص (غلام احمد) کا دماغ خراب ہو جائے گا اور یہ نبوت کا دعویٰ کر دے گا کیونکہ مجھے اللہ تعالیٰ کی عطا سے معلوم ہوا ہے کہ قادیان سے قرن شیطان کا ظہور ہوگا اور وہ نبوت کا دعویٰ کرے گا۔ اس پیشن گوئی کے 36 سال بعد مرزا غلام احمد قادیانی نے مسیحت و نبوت کا دعویٰ اگل دیا۔“

حضرت مولانا غلام قادر بھیروی رحمۃ اللہ علیہ نے پنجاب میں سب سے پہلے مرزا غلام احمد قادیانی کو کافر و مرتد قرار دیا اور اس فتنہ کو بہت پہلے بھانپ لیا تھا، آپ نے فتویٰ جاری فرمایا کہ قادیانیوں کے ساتھ مسلمان مرد یا عورت کا نکاح حرام و ناجائز ہے۔

اسی دوران امام احمد رضا خان فاضلِ بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کے صاحبزادے مولانا حامد رضا خان رحمۃ اللہ علیہ نے مرزا کے خلاف قلم اٹھایا اور ۱۳۱۵ھ۔ ۱۸۹۷ء میں کانپور سے موصولہ ایک استفتاء کے جواب قادیانیوں کے خلاف ”الصارم الربانی علی اسراف القادیانی ۱۳۱۵ھ“ نامی رسالہ تصنیف فرمایا جو ماہنامہ حنفیہ (پٹنہ) کے کئی شماروں میں مسلسل شائع ہوا، پھر بریلی سے کتابی صورت میں شائع ہوا۔

امام اہلسنت حضرت مولانا احمد رضا خان فاضلِ بریلوی رحمۃ اللہ علیہ نے زندگی بھر گمراہ فرقوں کا علمی تعاقب کیا۔ آپ نے مرزا غلام احمد اور اسکے پیروکاروں کے خلاف کئی کتب تحریر فرمائیں جو سب کی سب شائع شدہ دستیاب ہیں۔ اپنی ایک تصنیف ”حسام الحرمین“ میں تحریر فرماتے ہیں ”ان میں سے ایک فرقہ مرزائیہ ہے اور ہم نے ان کا نام

غلامیہ رکھا ہے، غلام احمد قادیانی کی طرف نسبت، وہ ایک دجال ہے جو اس زمانہ میں پیدا ہوا کہ ابتداء مثیل مسیح ہونے کا دعویٰ کیا اور واللہ اس نے سچ کہا، وہ مسیح دجال کذاب کا مثیل ہے، پھر اسے اور اونچی چڑھی اور وحی کا ادعا کیا اور واللہ وہ اس میں بھی سچا ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ دربارہ شیاطین فرماتا ہے ”ایک ان کا دوسرے کو وحی کرتا ہے بناوٹ کی بات دھوکے کی“ رہا اس کا اپنی وحی کو اللہ سبحانہٗ کی طرف نسبت کرنا اور اپنی کتاب براہین غلامیہ کو اللہ تعالیٰ کی کتاب بتانا، یہ بھی شیاطین ہی کی وحی سے ہے کہ لے مجھ سے اور نسبت کر کر رب العلمین کی طرف پھر دعویٰ نبوت و رسالت کی صاف تصریح کر دی اور لکھ دیا کہ اللہ وہی ہے جس نے اپنا رسول قادیان میں بھیجا اور زعم کیا کہ ایک آیت اس پر یہ اتری ہے کہ ہم نے اسے قادیان میں اتارا اور حق کے ساتھ اترا اور زعم کیا کہ یہ وہی احمد ہے جن کی بشارت عیسیٰ علیہ السلام نے دی تھی اور ان کا یہ قول جو قرآن مجید میں مذکور ہے، میں بشارت دیتا آیا ہوں اس رسول کی جو میرے بعد تشریف لانے والے ہیں، جن کا نام پاک احمد ہے، اس سے میں ہی مراد ہوں اور زعم کیا کہ اللہ تعالیٰ نے اس سے کہا ہے کہ اس آیت کا مصداق تو ہی ہے کہ اللہ وہ ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور سچے دین کے ساتھ بھیجا تا کہ اسے سب دینوں پر غالب کرے، پھر اپنے نفس لئیم کو بہت سے انبیاء و مرسلین علیہم السلام سے افضل بتانا شروع کیا اور گروہِ انبیاء علیہم السلام سے کلمہ خدا و روح خدا اور رسول خدا عزوجل عیسیٰ علیہ السلام کو تنقیص شان کیلئے خاص کر کے کہا۔

ابنِ مریم کے ذکر کو چھوڑو
اس سے بہتر غلام احمد ہے

”اور جب کہ اس سے مواخذہ ہوا کہ تو اپنے آپ کو رسولِ خدا عیسیٰ علیہ السلام کا مثیل بتاتا ہے تو وہ عقل کو حیران کر دینے والے معجزے کہاں ہیں جو عیسیٰ علیہ السلام کیا کرتے تھے، جیسے مردوں کو زندہ کرنا اور پیدائشی اندھے اور بدن بگڑے کو اچھا کرنا اور

مٹی سے ایک پرند کی صورت بنانا پھر اس میں پھونک مارنا، پھر حکم خدا سے پرندہ ہو جانا تو اس کا یہ جواب دیا کہ عیسیٰ یہ باتیں مسمریزم سے کرتے تھے (کہ انگریزی میں ایک قسم کے شعبدے کا نام ہے) اور لکھا کہ میں ایسی باتوں کو مکروہ نہ جانتا تو میں بھی کر دکھاتا تو اور جب پیشن گوئی کرنے کی عادت اسے پڑی ہوئی ہے اور پیشن گوئیوں میں اس کا جھوٹ نہایت کثرت سے ظاہر ہوتا ہے تو اپنی اس بیماری کی یہ دوا نکالی کہ پیشن گوئیاں جھوٹی جانا کچھ نبوت کے منافی نہیں کہ پہلے چار سو انبیاء کی پیشن گوئیاں جھوٹی ہو چکی ہیں اور سب سے زیادہ جس کی پیشن گوئیاں جھوٹی ہوئیں وہ عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام ہیں...... ان کے سوا اس کے کفریات ملعونہ اور بہت ہیں۔''

سنی اہلِ قلم نے آنجہانی مرزا غلام احمد کا بڑے سادہ اور دلنشین انداز میں تعارف قلمبند کر کے شائع کروایا تا کہ مسلمان مرزا صاحب کا اصلی چہرہ دیکھ سکیں، صدر الافاضل حضرت مفتی محمد نعیم الدین مراد آبادی رحمۃ اللہ علیہ نے وضاحت فرمائی کہ ایک معمولی ملازم ہونے کے باوجود وہ سرمایہ دار کیسے بن گیا۔ جبکہ علامہ قاضی فضل احمد لدھیانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مضمون میں تحریر فرمایا کہ ''جب مرزا صاحب آنجہانی سیالکوٹ میں پندرہ روپے کی ملازمت پر فائز ہوئے اور اس میں ان کی ترقی نہ ہوئی تو انھوں نے مختاری وکالت کا امتحان بڑی سرگرمی و سر دردی سے دیا، قسمت کی خوبی اس میں فیل ہو گئے اور شرمساری کی وجہ سے اہلمدی سے استعفیٰ دے کر اپنے گھر قادیان میں آ گیا اور اپنے دوستوں کے مشورہ سے کتاب ''براہینِ احمدیہ'' کے لکھنے اور شائع کرنے کا ارادہ کیا اور اس تجارتی کاروائی کا بہت فائدہ اٹھایا، پہلی اصلاح تو یہ کی کہ اس کتاب میں تین سو دلائل اور تین سو جز کی کتاب ہوگی۔ اور ایک جلی قلم کا اشتہار بھی جاری کر دیا کہ یہ الہامی کتاب ہے، اگر کوئی شخص اس کو غلط ثابت کرے تو اس کو دس ہزار روپے انعام دیا جائے گا، آخر کتاب کی قیمت کا روپیہ وصول کر کے ہضم کیا اور صرف ۳۵ جز کی کتاب طبع کر کے لوگوں کے حوالے کی، اس میں ایک مسئلہ ''معرکۃ

الاراء'' لکھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام آسمان پر زندہ موجود ہیں اور اخیر زمانہ میں نزول فرمائیں گے اور تمام دنیا میں اسلام پھیلائیں گے اور غلبۂ اسلام ان کے وقت میں ہوگا ......لیکن اس کے بعد اس نے اپنا ''ازالہ اوہام'' شائع کیا تو اس میں اس نے اپنے تئیں عیسیٰ ہونے کا دعویٰ کر کے حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نسبت لکھ دیا کہ وہ مر گئے ہوئے ہیں اور ان کی جگہ میں عیسیٰ ہوں، ایسا لکھ کر مرزا صاحب نے اپنے ہاتھوں اپنی الہامی کتاب ''براہینِ احمدیہ'' کو غلط ثابت کر کے اپنے اشتہارِ جلی کو بھی جھوٹا قرار دے دیا اور جھوٹوں میں داخل ہو گیا۔

دوسرا جھوٹ یہ کہ تمام دنیا کی اصلاح کا کام شروع کر دیا لیکن افسوس پنجاب سے باہر قدم نہ رکھا حتیٰ کہ فریضۂ حج بھی ادا نہ کیا، سرحد افغانستان تک بھی نہ جا سکا، اعلیٰ حضرت پیر سید مہر علی شاہ صاحب گولڑوی رحمۃ اللہ علیہ کے مقابلہ و مناظرہ میں باوجود اقرار کرنے کے لاہور تک بھی نہ جا سکا......الخ۔

مرزا صاحب سستی شہرت حاصل کرنے کی خاطر بعض معروف علماء و مشائخ کو مناظرہ کرنے کی دعوت دیتا اور جواب میں انہیں بھی اسی قسم کے دعوت نامے موصول ہوتے لیکن وہ کسی مناظرہ میں عملی طور پر شریک ہونے سے ہچکچاتا تھا۔ مثلاً

❁ مرزا صاحب کی طرف سے حضرت پیر سید مہر علی شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو تحریری مناظرہ کی دعوت دی گئی ......مناظرہ کی تاریخ ۲۵ اگست ۱۹۰۰ء مقرر ہوئی، چنانچہ جب مناظرہ کی تاریخ قریب آئی تو ہزار ہا مسلمان ملک کے گوشے گوشے سے لاہور پہنچنے لگے، ہر طبقہ و فرقہ کے علماء و مشائخ اور اہل حق مسلمان دور و نزدیک سے جمع ہو گئے، اس مسئلہ میں تمام اسلامی فرقوں کے راہنما ایک صف میں کھڑے ہو گئے، سنی و اہل حدیث کے علاوہ شیعہ حضرات و مجتہدین نے بھی قادیانیت کے محاذ پر حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو اپنا نمائندہ و سربراہ ہونے کا اعلان کیا، ۲۴ اگست کو حضرت نے مرزا کو ایک تار کے ذریعے راولپنڈی اسٹیشن سے اپنی روانگی کی اطلاع دے دی۔

لاہور پہنچنے پر آپ کا بڑا والہانہ استقبال کیا گیا اور برکت علی اسلامیہ ہال میں آپ قیام پذیر ہوئے، مرزا غلام احمد کو جب یہ معلوم ہوا کہ حضرت شاہ صاحب لاہور تشریف لا چکے ہیں تو اس نے لاہور آنے سے انکار کر دیا۔

قادیانی جماعت کے بعض بااثر مرزائیوں نے مرزا صاحب کو لاہور لانے کی بے حد تگ و دو کی مگر ناکام رہے، جب قادیانی جماعت کا آخری وفد قادیان سے ناکام لوٹا تو اس جماعت میں انتہائی مایوسی اور انتشار پیدا ہو گیا، بے شمار لوگوں نے اسی وقت تائب ہونے کا اعلان کر دیا۔

❁ مرزا قادیانی کا مقابلہ ہر وقت علماء ظواہر کے ساتھ رہتا تھا، اگرچہ وہ ان سے بھی ہر وقت شکست کھاتا اور ذلیل ہوتا رہتا تھا مگر ۲۷ اکتوبر ۱۹۰۴ء کو سیالکوٹ میں حضرت امیرِ ملت محدث علی پوری رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ مناظرہ کا ارادہ کیا لیکن جب یہ مردِ حق سامنے آیا تو مرزا بھاگ کھڑا ہوا اور جس قدر لوگ اس کی بیعت کیلئے تیار تھے، اسکی ذلت و رسوائی دیکھ کر بدظن ہو گئے اور حضرت امیرِ ملتؒ کے حلقۂ بگوش ہو گئے۔

❁ علامہ ابوالفیض محمد حسن فیضی رحمۃ اللہ علیہ نے ۹ مئی ۱۸۹۹ء کو سراج الاخبار میں ایک اشتہار شائع کیا جس میں کھلے لفظوں میں مرزا صاحب کو چیلنج کیا "اخیر پر میں مرزا صاحب کو اشتہار دیتا ہوں کہ اگر وہ اپنے عقائد میں سچے ہوں تو آئیں، صدر جہلم میں کسی مقام پر مجھ سے مباحثہ کریں! میں حاضر ہوں! تحریری کریں یا تقریری، اگر تحریر ہو تو نثر میں کریں یا نظم میں، عربی ہو یا فارسی یا اردو، آیئے، سنئے اور سنایئے!!!

مگر مرزا صاحب نے کچھ جواب نہ دیا اور اس طرح چپ سادھی کہ کروٹ نہ بدلی، بعد ازاں پھر مرزا صاحب کو ایک مکتوب ارسال کیا جو ۱۳ اگست ۱۹۰۰ء کو سراج الاخبار میں شائع ہوا، اس میں آپ نے پھر مرزا صاحب کو دعوتِ مقابلہ دی اور واضح طور پر لکھا کہ "میں آپ کے ساتھ ہر ایک مناسب شرط پر عربی نظم و نثر لکھنے کو تیار ہوں، تاریخ کا تقرر آپ ہی کر دیجئے اور اطلاع کر دیجئے کہ میں آپ کے سامنے اپنے آپ

کو حاضر کر دوں۔"

اس دفعہ آپ نے جہلم کی قید بھی حذف کر دی اور مرزا صاحب کو اختیار دیا کہ جہاں چاہیں، مقابلے کیلئے آ جائیں لیکن "**هل من مبارز**" کا بیانگ دہل اعلان کرنے والے مرزا صاحب اس چیلنج کو بھی حسبِ سابق پی گئے اور منقار زیرِ پر رہنے میں عافیت سمجھی۔

اہلسنت کے قابلِ احترام بزرگوں نے کانگرسی مولویوں کی طرح آنجہانی مرزا غلام احمد قادیانی کو بھی سکون سے کام کرنے نہیں دیا، وہ انہیں جہاں مل جاتے گھیر کر علمی شکست سے دو چار کر لیتے، یہی وجہ ہے کہ جس طرح متحدہ ہندوستان میں پاکستان کے نام پر ہونے والے ۴۶-۱۹۴۵ء کے عام انتخابات میں قوم پرست مولویوں کے نامزد امیدواروں کی ضمانتیں ضبط ہو گئیں تھیں، بالکل اسی طرح مرزا صاحب کو عام مسلمانوں میں مقبولیت حاصل نہ ہو سکی، درج ذیل واقعات سے ہمارے اس دعویٰ کی تصدیق ہوتی ہے۔

❁ مولوی اسد علی خان مرحوم (جو امام احمد رضا اور ان کے ہم مسلک علماء کرام کی تقاریر سن کر قادیانیت سے تائب ہوئے تھے) قادیان گئے تھے اور مرزائے قادیان سے ملے تھے، مرزا نے بیک وقت مسیح موعود اور کرشن کے اوتار ہونے کا بھی دعویٰ کیا تھا، مولوی اسد علی خان نے مرزا سے پوچھا تھا کہ اگر آپ کی موت واقع ہو جائے تو آپ کا کریہ کرم کرشن کے اوتار کے طریقے پر ہوگا یا مسیح موعود کے انداز پر، مرزا یہ سن کر لاجواب ہو گیا، وہ یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ مرزا کی نبوت کا سارا کھیل حکیم نور الدین بھیروی اور مولوی محمد احسن امروہوی کے علم و فضل کا کرشمہ تھا۔

❁ حضرت مولانا نواب الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ جب ہفتے عشرے کے بعد مرزا غلام احمد و حکیم نور الدین وغیرہ سے مناظرہ کرنے قادیان تشریف لے جاتے تھے تو لوگ کام چھوڑ کر جلوس کی صورت میں دلچسپ علمی معرکہ کو سننے کیلئے بڑی بے تابی

اور شوق سے ساتھ ساتھ چلتے، وہاں جا کر مرزا قادیانی و حکیم نور الدین کو علمی طور پر زبردست پے در پے شکستیں دینے کے علاوہ بے حد مطعون بھی کرتے تھے...... ایک دن جب علامہ مولانا نواب الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ قادیان تشریف لے جارہے تھے تو راستے میں دیکھا کہ مسیلمہ قادیان، حکیم نور الدین و دیگر ساتھیوں کے سامنے مثنوی مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ کے اشعار پڑھ رہا تھا اور مولانا روم کی تعریف کر رہا تھا تو اس پر علامہ نواب الدین رحمۃ اللہ علیہ نے مرزا کو کہا کہ مولانا روم تو حیاتِ مسیح کے قائل ہیں چنانچہ فرماتے ہیں کہ''

عیسیٰ و ادریس چوں ایں راز یافت
برفراز گنبد چارم شناخت
عیسیٰ و ادریس برگردوں شدند
زاں کہ از جنس ملائک آمدند

تو یہ سن کر مرزا نے جھٹ کہا یہ مولانا روم کی انفرادی رائے ہے تو اس پر علامہ نواب الدین رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ کیا تمہاری رائے انفرادی نہیں؟ اجماعی ہے کیا؟ تو لاجواب ہو کر مرزا نے جھٹ حکیم نور الدین سے کہا کہ بھئی مولانا کو چائے پلاؤ مگر مولانا نواب الدین نے نہایت حقارت سے اس پیشکش کو رد فرمایا۔

❁ علامہ ابوالفیض محمد حسن فیضی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ علمی کارنامہ ناقابلِ فراموش ہے کہ آپ نے اعجاز و نبوت کے مدعی، تفسیرِ قرآن اور عربی نویسی میں ''انا ولا غیری'' (ہیچو ما دیگرے نیست) کا ڈھنڈورا پیٹنے والے مرزا غلام احمد قادیانی کو وہ شکست فاش دی کہ مرزا صاحب کے بلند بانگ دعویٰ الہامات کے پرزور اعلانات سن کر علامہ فیضی ۱۳ فروری ۱۸۹۹ء کو مسجد حکیم حسام الدین (سیالکوٹ) میں بنفسِ نفیس تشریف لے گئے اور اپنا ایک بے نقط عربی قصیدہ (بلا ترجمہ) مرزا صاحب کو دکھایا جس میں لکھا تھا کہ اگر آپ کو الہام ہوتا ہے تو مجھے آپ کے الہام کی تصدیق کیلئے یہی کافی ہے کہ اس

قصیدہ کا مطلب حاضرین کو سنا دیں...... مرزا صاحب اس کو کافی دیر دیکھنے کے بعد جب کچھ بھی پتہ نہ چلا تو اپنے ایک فاضل حواری کو دے دیا مگر اس کے پلے بھی کچھ نہ پڑا، مقابلہ و معارضہ تو کجا انہیں تو مطلب بھی سمجھ نہ آیا اور نہ ہی قصیدے کو صحیح طور پر پڑھ سکے، آخر یہ کہہ کر قصیدہ واپس کر دیا کہ ہمیں تو اس کا کچھ پتہ نہیں چلتا، آپ ترجمہ کر دیں۔

مرزا قادیانی نے جب اپنے باطل دعاوی کا سلسلہ شروع کیا تو مولانا ابوالفضل محمد کرم الدین دبیر رحمۃ اللہ علیہ اس فتنہ کی سرکوبی کیلئے میدانِ عمل میں کود پڑے، آپ کے دستِ راست مولانا فقیر محمد جہلمی رحمۃ اللہ علیہ نے ان دنوں جہلم سے ہفتہ وار پرچہ'' سراج الاخبار'' جاری کر رکھا تھا، انھوں نے سراج الاخبار کو ردِ قادیانیت کیلئے وقف فرماتے ہوئے مولانا محمد کرم الدین صاحب کو اس کا ایڈیٹر مقرر کر دیا اور قادیانی کذاب کا نہایت مدلل اور ٹھوس مضامین میں تعاقب شروع فرمایا۔ جس کی تاب نہ لاتے ہوئے مرزا اور اس کے حواری اوچھے ہتھکنڈوں پر اتر آئے اور خفت مٹانے کیلئے اپنی پشت پناہ گورنمنٹ برطانیہ کا دروازہ کھٹکھٹایا، آپ کی ناقابلِ جواب تحریرات کو بہانہ بنا کر مقدمات کی ابتداء کر دی، پہلا مقدمہ مرزا کے حواری حکیم فضل دین بھیروی کی طرف سے ۱۴ نومبر ۱۹۰۲ء کو زیرِ دفعہ ۱۴۷ تعزیرات ہند گورداس پور میں دائر ہوا، اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے مولانا ابوالفضل کو اس مقدمہ میں باعزت طور پر بری فرمایا حالانکہ اس مقدمہ کی نسبت مرزا قادیانی نے اپنی فتح کے الہامات متواتر شائع کیے تھے۔

دوسرا مقدمہ بھی حکیم فضل دین بھیروی ہی نے ۲۹ جون ۱۹۰۳ء کو مولانا کے خلاف گورداس پور میں دائر کیا، اس میں بھی آپ کامیابی سے ہمکنار ہوئے اور مرزائیوں کی خوب درگت بنی اور مقدمہ خارج ہو گیا، پھر تیسرا مقدمہ شیخ یعقوب علی تراب ایڈیٹر اخبار الحکم قادیان کی طرف سے مولانا ابوالفضل اور مولانا فقیر محمد صاحب

جہلم کے خلاف دائر ہوا جس میں ہر دو مستغاثہ علیہما پر ۵۴ روپے جرمانہ ہوا جو ادا کر دیا گیا، اس لیے کہ حقیری رقم کی خاطر اپیل کرنا غیر مناسب تھا، ۱۷ جنوری ۱۹۰۳ء کو جہلم میں مرزا کی مطبوعہ کتاب مواہب الرحمٰن تقسیم کی گئی جس میں مولانا ابوالفضل کے خلاف سخت توہین آمیز کلمات استعمال کیے گئے تھے، چونکہ مقدمات کی ابتداء مرزائیوں کی طرف سے ہو چکی تھی، اس لیے مولانا ابوالفضل نے بھی مرزا غلام احمد قادیانی اور حکیم فضل دین بھیروی کے خلاف استغاثہ دائر کر دیا اور یہ مقدمہ حق و باطل کے درمیان عظیم الشان معرکہ کی صورت اختیار کر گیا، اہل حق کی طرف سے شہادت میں بڑے بڑے فضلائے کرام پیش ہو رہے تھے اور فریقِ مخالف کی طرف سے حکیم نور الدین بھیروی، خواجہ کمال الدین لاہوری اور اس کے حواری ایڑی چوٹی کا زور لگاتے رہے، روپیہ پانی کی طرح بہایا، الہامات کے ذریعے اپنے حواریوں کی حوصلہ افزائی کی گئی مگر یہ سب حربے مٹی کے گھروندے ثابت ہوئے اور مقدمہ مرزا کیلئے سوہانِ روح بن گیا، مولانا ابوالفضل نہایت استقلال اور ثابت قدمی سے مقابلہ کرتے رہے، عدالت میں جرح کے دوران کئی کئی گھنٹے اتنی زبردست تقریریں کیں کہ مخالفین تلملا اُٹھے، خواجہ کمال الدین وکیل مرزا بے ساختہ پکار اُٹھا کہ مولانا کرم الدین کے دلائل کا جواب نہیں، مقابلہ میں مرزا صاحب کو عدالت میں دو لفظ بولنے کی بھی جرأت نہ ہو سکی بلکہ چھ چھ گھنٹے مرزا غلام احمد کو مجرموں کے کٹہرے میں دست بستہ کھڑا ہونا پڑا .....آخر ۱۸، اکتوبر ۱۹۰۴ء عدم ادائیگی کی صورت میں چھ ماہ قید محض کی سزا ہوئی جبکہ اس کے حواری حکیم فضل دین کو دوصد روپے جرمانہ یا پانچ ماہ قید کی سزا سنائی گئی، اس مقدمہ میں مرزا قادیانی اور اس کے حواریوں کو عبرتناک شکست اور سخت ذلت کا سامنا کرنا پڑا۔

جب مرزا ایک مقدمے میں ماخوذ ہو کر گورداس پور کی کچہری میں آیا تو مولانا نواب الدین چشتی ؒ بھاگم بھاگ کچہری پہنچ گئے اور مرزا کے گرد لوگوں کا حلقہ توڑ کر

مرزا کا بازو پکڑ لیا، بازو کو ایک شدید جھٹکا دے کر فرمانے لگے کہ مردود! نبوت اگر جاری ہوتی اور اللہ تعالیٰ اس علاقے میں کوئی نبی بھیجتا تو بتا کہ مجھ جیسے وجیہہ انسان بھیجتا یا تجھ جیسے بجوکو؟ یہ سن کر حاضرین کے انبوہ سے ایک قہقہہ بلند ہوا اور مرزا پر سکتے کا عالم طاری ہو گیا۔

حضرت امیرِ ملت پیر سید جماعت علی شاہ محدث علی پوری ؒ نے مرزا غلام احمد قادیانی کی موت کی پیشن گوئی کی جو حرف بحرف پوری ہوئی، بقول جناب عبدالمجید سالک ابوالکلام آزاد اس ’’سانحہ‘‘ سے بہت متاثر ہوئے، سالک صاحب نے لکھا ہے۔’’جن دنوں مولانا (ابوالکلام آزاد) امرتسر کے اخبار ’’وکیل‘‘ کی ادارت پر مامور تھے اور مرزا صاحب کا انتقال انہی دنوں ہوا تو مولانا نے مرزا صاحب کی خدمات اسلامی پر ایک شاندار شذرہ لکھا، امرتسر سے لاہور آئے اور یہاں سے مرزا صاحب کے جنازے کے ساتھ بٹالہ تک گئے۔‘‘

نوٹ: کہا جاتا ہے کہ ایک مخصوص مکتبہ فکر کے دباؤ پر دوسرے ایڈیشن میں یہ عبارت حذف کر دی گئی ہے۔ (مکتبہ)

اہلسنت کے سرکردہ راہنما قادیانیوں سے بچ کر رہنے کی تلقین کرتے اور ان سے اتحاد کو خارج از امکان قرار دیتے تھے۔

❁ دورِ حاضر میں مسلمانوں کیلئے زیادہ خطرناک فرقہ مرزائی قادیانی ہے کیونکہ یہ فرقہ ظاہر میں اسلام کا مدعی ہے مگر فی الحقیقت دینِ محمدی ﷺ اور اسلام قدیم کے دشمن نیا مذہب احمدی (مرزائی قادیانی) قائم کر کے بہکا رہا ہے، جملہ برادرانِ اسلام سے عاجزانہ درخواست ہے کہ ان گمراہ فرقوں (اہل حدیث، اہلِ قرآن، وہابی، مرزائی، نیچری وغیرہم) کے شیطانی عقائد سے خود بھی بچیں اور عامۃ الناس کو مرزائیوں کے فعل سے بچائیں۔ (محمد شفیع بڈھن)

❁ آج کل مرزائی عیاریاں کر رہے ہیں، کبھی تو وہ سیرت الرسول کے نام سے جلسے

کرتے ہیں اور مسلمانوں کو مغالطہ دیتے ہیں کہ سیرت رسول کا جلسہ ہے (ﷺ) یہ تو ایک مشترک امر ہے، کوئی نزاعی بات نہیں ہے، اس میں سب کو شریک ہونا چاہیے، مسلمانون کو اسلامی اتحاد دکھا دینا چاہیے، اظہار تو یہ ہے اور حقیقت میں مقصد یہ کہ مجمع ہو جائے، عوام کے سامنے تقریر کرنے کا موقع ملے، ان کو مرزائیوں کی تقریر سننے کا عادی بنالیا جائے، منافرت جاتی رہے تو بہکانے اور گمراہ کرنے کا موقع ہاتھ آجائے اور اسی طرح انھوں نے لوگوں کو گمراہ کیا ہے، سادہ لوح مسلمان دھوکہ میں آجاتے ہیں، وہ اس کو فریب نہیں سمجھتے، ان کے جلسوں میں جاتے ہیں، ان کی شوکت بڑھاتے ہیں، ناواقف لوگ دام تزویر میں مبتلا ہوتے ہیں اور بے دین بھی ہوجاتے ہیں، اتنا شعور نہیں ہوتا کہ جو دین سے منحرف ہے، وہ کیا دین کی حمایت کرے گا؟ ان سے کہہ دیں کہ ہمیں تمہارے جلسے سے کیا سروکار، سیرت رسول ﷺ کے جلسے ہم کرتے ہیں، ہمارے علماء جو سیرت پاک کے خوب اچھی طرح جاننے والے اور فرمانبردار ہیں، ہم ان سے سیرت اقدس سن لیتے ہیں، ہمیں تمہارا کیا اعتبار، سیرت پاک ہی کے تو تم دشمن ہو، ختم نبوت ہی میں تمہیں کلام ہے، حضور ﷺ کے بعد دوسرا نبی تم مانتے ہو، مرزا کو رسول کہتے ہو تو کیا تم سیرت رسول بیان کرسکو گے، سیرت رسول بیان کرنے کے قابل ہوتے تو مرزائی نہ ہوتے، جاؤ ہم تمہارے جلسہ میں شریک نہیں ہوتے۔

اگر سنی ان کی مجالس میں شرکت نہ کریں، اگر سنی ان کے حوصلے نہ بڑھائیں، اگر سنی ان کی کتابوں کو نہ دیکھیں، ان کے اشتہاروں کو نہ پڑھیں، تو وہ پسپا ہو جائیں اور بے دینی کی رفتار بہت سست ہوجائے، وہ ہماری عوام سے کہتے ہیں کہ ہم اختلافی کوئی مسئلہ نہیں بیان کریں گے، ہماری عوام کو ان سے کہہ دینا چاہیے کہ ہمیں اتفاقی مسئلہ بھی آپ سے سننے کی حاجت نہیں، ہمارے مسائل بتانے والے بفضلِ الٰہی موجود ہیں، ہمیں تجھ سے کچھ سننا نہیں، یہی نسخہ ہر ایک بد دین اور بد مذہب کیلئے اختیار کرنا چاہیے تو بد دینی کو رواج نہ ہوسکے۔ (صدر الافاضل مفتی محمد نعیم الدین مرادآبادی رحمۃ اللہ علیہ)

❁ مرزائی جو مرزا غلام احمد کے پیرو ہیں، وہ ختم نبوت کے قائل نہیں ہیں، اسی طرح وہ حضور ﷺ کے مدارج رسالت ونبوت میں کمی کرنے والے ہیں، یہ حضور ﷺ کے مدارج مرزا غلام احمد کیلئے مانتے ہیں، پھر ان سے اہلسنت و جماعت کس طرح اتفاق کرسکتے ہیں؟ ہم نے ان کو نہیں چھوڑا بلکہ وہ خود ہم سے علیحدہ ہو کر گمراہ ہوگئے۔

نہایت حیرت واستعجاب کی بات ہے کہ مرزائی خود سرکار دو عالم ﷺ کی غلامی کو چھوڑ کر کسی اور کی غلامی اختیار کریں، اس پر بھی ان کو مسلمان سمجھا جائے! نفاق تو وہ خود کتے ہیں، جماعت ناجیہ کو خود انھوں نے چھوڑا، بموجب فتوائے اہلسنت و جماعت ''وہ خود (مرزائی) دین اسلام سے منحرف ہو کر مرتد ہوگئے اور چاہ ضلالت میں جاگرے ہیں'' بے وفائی تو انھوں نے خود کی جو راہِ راست سے پھسل گئے، طوقِ غلامی نبی آخر الزماں ﷺ طرہ یہ ہے کہ بعض ناداں دوست ہم کو کہتے ہیں کہ ان سے اتفاق کرو نا اتفاقی کے مرتکب وہ ہیں اور شکایت الٹی ہماری! (حضرت امیرِ ملت محدث علی پوری رحمۃ اللہ علیہ)

مشہور دیوبندی مولانا عبید اللہ سندھی نے فرمایا کہ ''میں مولوی نور الدین کو واقعی بڑا آدمی سمجھتا ہوں میں ان کے تفقہ فی الدین خلوص، ایثار، بے غرض خدمتِ دین اور سب سے بڑھ کر ان کا اپنے آپ کو ایک مقصد کیلئے وقف کردینا، ان چیزوں کا میں بڑا معترف ہوں۔''

اس کے برعکس سنی علماء ومشائخ نے حکیم نور الدین کی پرزور مخالفت کی اور اسے قادیانیت کی تبلیغ نہ کرنے دی۔

❁ مرزا نے جب نبوت کا دعویٰ کیا اور حکیم نور الدین نے اس کی تائید کی تو حضرت مولانا غلام قادر بھیروی رحمۃ اللہ علیہ نے حکیم نورلادین کا ایسا ناطقہ بند کیا کہ آپ کی موجودگی میں اسے کبھی بھیرہ میں داخل ہونے کی جرأت نہ ہوئی۔

❁ حکیم نور الدین نے نارووال ضلع سیالکوٹ میں اپنا تبلیغی کیمپ لگایا اور سادہ لوح لوگ اس کے دام فریب میں پھنسنے لگے تو حضرت امیرِ ملت پیر سید جماعت علی شاہ

محدث علی پوری رحمۃ اللہ علیہ اس وقت صاحبِ فراش تھے، چارپائی سے اُٹھا نہیں جاتا تھا لیکن آپ نے حکم دیا کہ میری چارپائی نارووال اُٹھا کر لے چلو کہ میں اس فتنہ کی سرکوبی میں اپنا فرض ادا کرسکوں، اور آپ خطبۂ جمعہ میں مرزائی عقائد کا تارو پود بکھیرتے رہے، ناچار حکیم نورالدین کو راستہ ناپنا پڑا۔

سنی قائدین نے اندرون و بیرونِ ملک قادیانیوں کو پھلنے پھولنے سے روکنے کی ہر ممکن کوشش کی، جہاں کہیں ان کے اثرات دیکھتے وہاں پہنچ کر مسلمانوں کو صراطِ مستقیم پر قائم رہنے کی تقلین کرتے۔

❁ ۱۹۰۴-۵ء میں شیوخ کلال خاندان میں بعض نوجوان قادیانی تحریک سے متاثر ہوگئے جن میں خان بہادر، حکیم معظم علی خان عرف مکہ میاں ابن واحد علی خان، ابن حکیم سعادت علی خان خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں، ایک اور بزرگ مولوی اسد علی خان (ف ۱۹۵۶ء) کا رجحان بھی ادھر ہوگیا تھا اور اس حلقہ کو وسعت ہونے لگی، چنانچہ اس موقع پر قصبہ آنولہ کے بعض اہل الرائے حضرات نے ایک عظیم الشان جلسہ کا انعقاد کیا جس میں بدایوں سے مولانا عبدالمقتدر بدایونی (ف ۱۹۱۵ء) امروہی، پیلی بھیت سے مولانا وصی احمد محدث سورتی اور بریلی سے مولانا احمد رضا خان تشریف لائے، علمائے کرام کی تقریریں ہوئیں، اس میں فاضلِ بریلوی اور محدث امروہوی کی تقاریر حاصلِ جلسہ تھیں، علمائے کرام کے سامنے حکیم معظم علی خان عرف مکہ میاں اور مولوی اسد علی خان خاص طور سے پیش ہوئے، انھوں نے توبہ کی اور اس طرح یہ فتنہ ہمیشہ ہمیشہ کیلئے اس قصبہ سے ختم ہوگیا۔

❁ امام احمد رضا فاضلِ بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ مبلغِ اسلام علامہ محمد عبدالعلیم صدیقی میرٹھی رحمۃ اللہ علیہ نے مرزائیوں، یہودیوں اور خصوصاً عیسائی پادریوں سے بہت سے مناظرے کیے اور قادیانیوں کی بیخ کنی کیلئے ابتداء سے آخر تک افریقہ، ملائشیا، سیلون، یورپ اور امریکہ کی سرزمین پر ہمیشہ لوگوں کو اس فتنہ سے آگاہ کیا، آپ کی

انگریزی زبان میں تصنیف ''the mrror'' کے نام سے موجود ہے جو کئی پبلی کیشنز نے شائع کی اور اردو زبان میں ''مرزائی حقیقت کا اظہار'' اور عربی زبان میں مصر کی چھپی ہوئی ''المرآۃ'' تصنیف کتاب کا ترجمہ موجود ہے، انڈونیشی زبان میں بھی ''مرزائی حقیقت کا اظہار'' کتاب کا ترجمہ ہوا اور اس کی اشاعت کے بعد ملائشیا میں زبر دست تحریک اُٹھی، یہاں تک کہ آپ کی کوششوں سے ملائشیا میں مرزائیوں کا داخلہ ممنوع ہوگیا تھا۔

آخر میں دو فتوے پیشِ خدمت ہیں، پہلا فتویٰ تو متفق علیہ ہے لیکن دوسرا فتویٰ جو ایک فاضلِ دیوبند کا ہے اور مولوی ابوالحسن ندوی کا تصدیق شدہ ہے اس کے متعلق مفتی حضرات ہی کچھ کہہ سکتے ہیں، پہلے صدرالافاضل حضرت مفتی محمد نعیم الدین مراد آبادی رحمۃ اللہ علیہ کا فتویٰ ملاحظہ فرمائیں'' قادیانی مرزا کی نبوت کا قائل، ختمِ نبوت کے معنیٰ متواتر کا منکر ہے اور اس وجہ سے کافر ہے، اب اگر وہ بہائی ہوگیا تو اس وجہ سے اس کا کفر اٹھ نہ گیا جب تک وہ اپنے کفر سے توبہ نہ کرے اور ختمِ نبوت کے معنیٰ متواتر کو تسلیم نہ کرے، حضور ﷺ کی نبوت کے بعد کسی نبی جدید کے آنے کے خیال سے تائب نہ ہوا اور تمام کفریات سے بیزاری کرکے از سرِ نو اسلام نہ لائے، مسلمان نہیں ہوسکتا......

مرزا نے جس قسم کا دین ایجاد کیا اور ضلالت کی جو راہیں اختیار کیں وہ سب اس کی طبع زاد نہیں، اس نے اپنے زمانہ سے قبل کے بے دینوں، دجالوں سے بہت کچھ اخذ کیا اور ان سے کا پس خوردہ جمع کرکے ایک دکان لگائی۔

وہ شخص قادیانی تھا، جب بھی کافر تھا اور بہائی ہوا، اب بھی کافر ہے، اس کے ساتھ مسلمہ کا نکاح نہیں ہوسکتا، ہمیشہ حرام ہوگا۔''

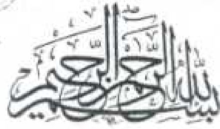
'' قادیانی سے نکاح'' کے ذیلی عنوان کے تحت مولوی خالد سیف اللہ رحمانی (فاضلِ دیوبند) نے لکھا ہے کہ ''فقہی احکام کے لحاظ سے قادیانی دو طرح کے ہیں، ایک وہ جو خود مسلمان تھا اور پھر قادیانیت قبول کرلی، ان کا حکم مرتدین کا ہوگا، نہ ایسے

مردوں سے نکاح درست ہوگا نہ عورتوں سے...... دوسرے وہ لوگ ہیں جن کے آباؤ اجداد قادیانی تھے، اس لیے وہ پیدائشی طور پر قادیانی تھے، قرآن مجید پر ایمان رکھنے کی وجہ سے اس کا حکم ''اہلِ کتاب'' کا ہوگا، مسلمانوں کیلئے ان کی عورتوں سے نکاح درست ہوگا، مسلمان عورتوں سے ان کے مردوں کا نکاح قطعاً جائز نہ ہوگا، مفتی کفایت اللہ صاحب (دیوبندی) کی بھی یہی رائے ہے۔

عیسائی اور یہودیوں اور دوسرے غیر مسلم جو قادیانیت قبول کرلیں وہ بھی اہلِ کتاب ہی کے زمرہ میں ہوں گے۔''

کافی کوشش کے باوجود اکابرین کی جدوجہد کا تذکرہ ضرورت سے کچھ زیادہ ہی طویل ہوگیا، اس کی وجہ یہ ہے ایک تو جناب قاضی محمد اسلم سیف اور اس قبیل کے دوسرے لوگوں کی معلومات میں اضافہ ہوجائے بشرطیکہ وہ جان بوجھ کر یہ نہ کہہ رہے ہوں کہ قیامِ پاکستان تک کسی سنی بریلوی عالمِ دین نے قادیانیت کے رد میں کوئی حصہ نہیں لیا ہے، دوسرے یہ حضرت علامہ سید احمد سعید کاظمی رحمۃ اللہ علیہ بھی اپنے اکابرین کی طرح قادیانیوں کے شدید ترین مخالف تھے، اس لیے قارئین اس طوالت کا برا نہیں مانیں گے بلکہ اُمید یہی کی جاسکتی ہے کہ اگر چند صفحات کا مزید اضافہ بھی ہوجاتا تو اس حقیر کوشش کو سراہتے۔''





باب نمبر 10

خود بدلتے نہیں

مودودی صاحب کی کجروی

از علامہ سید احمد سعید کاظمی رحمۃ اللہ علیہ

ماہنامہ السعید امامِ اہلِ سنت نمبر ۲۰۰۱ صفحہ ۵۳ تا ۵۸

قال اللہ تعالیٰ ھوا الذی انزل علیک الکتاب منہ آیات محکمات ھن ام الکتاب وا آخر متشابھات فاماالذین فی قلوبھم زیغ فیتبعون ماتشابہ منہ ابتغاء الفتنة وابتغاء تاویلہ وما یعلم تاویلہ الا اللہ والراسخون فی العلم یقولون امنا بہ کل من عند ربنا وما یذکر الا اولو الاباب، ربنا لا تزغ قلوبنا بعد از ھدیتنا وھب لنا من لدنك رحمه انك انت الوهاب۔ (پ ۳ آل عمران)

اس آیت کے تحت صاحبِ تفسیرات احمدیہ فرماتے ہیں، آیت کے معنیٰ یہ ہیں کہ کتاب اللہ دوقسم کی آیت پر مشتمل ہے۔ محکمات اور متشابہات، آیات محکمات وہ ہیں جو احتمال اور اشتباہ سے محفوظ ہیں اور وہ اصل کتاب ہیں۔ اور متشابہات وہ ہیں جن میں اشتباہ پایا جاتا ہے۔ ایسی آیات کو محکمات پر حمل کیا جائے گا اور محکمات کی طرف متشابہات کو لوٹایا جائے گا مثلاً ''**الرحمٰن علی العرش** میں احتمال اور اشتباہ پایا جاتا ہے اور اس کے ظاہر معنیٰ کی بناء پر اللہ تعالیٰ کے لیے جہت اور مکان ثابت ہوتا ہے لیکن ہم اس کے محکم کی طرف لوٹائیں گے اور اسی پر عمل کریں گے اور وہ آیت محکمہ اللہ تعالیٰ کا قول **لیس کمثلہ شئی** ہے جس میں کوئی اشتباہ اور احتمال نہیں پایا جاتا ایسا کرنے سے ہم کسی شبہ میں مبتلا نہیں ہونگے اور اسی حقیقت کو سمجھنے میں کہ **استوٰی علی العرش** بمعنٰی جلوس نہیں بلکہ بمعنٰی غلبہ اور استیلا ہے کیوں کہ بیٹھنا اجسام کی صفت ہے اور اللہ تعالیٰ کی شان **لیس کمثلہ شئی** ہے اس آیت قرآنیہ مین اللہ تعالیٰ نے یہ بھی فرمادیا کہ متشابھات کا علم واستقلال صرف اللہ تعالیٰ کو ہے نیز یہ کہ اہل زیغ فتنہ اٹھانے کے لیے آیات متشابھات کے پیچھے لگتے ہیں اس لیے اہل حق آیات متشابھات کے پیچھے کبھی نہیں پڑھتے اور انہیں محکمات کی طرف لوٹادیتے ہیں (تفسیرات احمدیہ صفہ نمبر ۱۴۶

لیکن امتِ مسلمہ کیلئے یہ کتنا عظیم المیہ ہے کہ اس زمانے میں لوگ الٹی گنگا بہانے لگے، محکمات کو متشابہات کی طرف لوٹانے لگے، بلکہ محکم کو متشابہ قرار دینے لگے۔ یہ حقیقت اظہر من الشّمس ہے کہ محکمات قرآن ہی ام الکتاب ہیں اور وہ ایسے واضح ہیں کہ ان مین کسی قسم کے احتمال اور اشتباہ کی گنجائش نہیں۔ خصوصاً وہ امور جنھیں قرآن کے بنیادی اصول ہونے کی حیثیت حاصل ہوا گر وہ بھی متشبہ اور محتمل قرار پائیں تو اسلام اور قرآن میں محکم کا وجود ہی باقی نہ رہے گا۔ حالانکہ کتاب اللہ کی اصل اور دین کی بنیاد صرف محکمات ہیں۔ اب جو شخص محکمات میں اشتباہ اور غلط فہمی کے وقوع کا مدعی ہے، درحقیقت وہ قرآن اور اسلام کی بنیادوں کو منہدم کرنے کے درپے ہے۔ مولانا مودودی صاحب نے قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں ذکر کیں اور چاروں کے متعلق علماء اسلام نے جو وضاحتیں اور تشریحات فرمائی ہین ان پر کڑی تنقید کرتے ہوئے کہا کہ ''لفظ'' (الہ) کو قریب قریب بتوں اور دیوتاؤں کا ہم معنیٰ بنادیا گیا۔ ''رب'' کو پالنے اور پوسنے والے یا پروردگار کا مترادف ٹھہرایا گیا۔ ''عبادت'' کے معنیٰ پوجا اور پرستش کے کیے گئے ہیں۔ دین کو دھرم اور مذہب ...... کے مقابلہ کا لفظ قرار دیا گیا۔ طاغوت کا ترجمہ بت یا شیطان کیا جانے لگا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ قرآن کا اصل مدعا ہی سمجھنا لوگوں کیلئے مشکل ہوگیا'' مودودی صاحب آگے چل کر غلط فہمی کے نتائج کا عنوان قائم کر کے لکھتے ہیں ''پس یہ حقیقت ہے کہ محض ان چار بنیادی اصطلاحوں کے مفہوم پر پردہ پڑ جانے کی بدولت قرآن کی تین چوتھائی سے زیادہ تعلیم بلکہ اسکی حقیقی روح نگاہوں سے مستور ہوگئی ہے۔''

(قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں از ابوالاعلیٰ مودودی طبع پنجم جولائی ۶۱ ص۱۲، ۱۳)

مودودی صاحب کو معلوم ہونا چاہیے کہ قرآن کی بنیادیں آیات محکمات ہیں۔ جن چیزوں کو وہ قرآن کی بنیادی اصطلاحیں قرار دے رہے ہیں وہ سب ام الکتاب ہونے کی حیثیت سے محکمات ہیں۔ اور محکم میں کسی اشتباہ اور غلط فہمی کیلئے گنجائش

نہیں۔ یہ ان کی کجروی ہے کہ محکمات کو متشابہات قرار دے رہے ہیں۔ مودودی صاحب کے نزدیک ان الفاظ کے ایسے تراجم کیے گئے کہ ان اصطلاحوں کے مفہوم پر پردہ پڑ گیا جس کی بدولت قرآن کی تین چوتھائی سے زیادہ تعلیم بلکہ اس کی حقیقی روح لوگوں کی نگاہوں سے مستور ہو کر رہ گئی۔

کیا مودودی صاحب جانتے ہیں کہ لفظِ رب کا ترجمہ پالنے پوسنے والا یا پروردگار، اسی طرح لفظ عبادت کے معنیٰ پوجا کا اور پرستش اور طاغوت کا ترجمہ بت یا شیطان کرنے والے کون لوگ ہیں کیا وہ ان جلیل القدر نامور ہستیوں کا نام لے کر ایسی تنقید کرنے کی جسارت کر سکتے ہیں۔ انشاء اللہ تعالیٰ ہم آگے چل کر اس حقیقت کو واضح کریں گے اور بتائیں گے کہ مودودی صاحب نے عہدِ فاروقی ہی سے روحِ قرآن کا صفایا کر دیا۔ سرِ دست ہم انہیں یہ بتانا چاہتے ہیں کہ انھوں نے قرآن کی بنیادی اصطلاحوں کے متعلق طویل مضمون میں جو کچھ کہا ہے وہ کوئی نئی بات نہیں۔ رب، عبادت اور دین کے متعلق جتنی آیات مودودی صاحب نے لکھ کر اپنے مضمون کو طویل کیا ہے ان سب کا خلاصہ یہ ہے کہ حاکمِ حقیقی، مالکِ حقیقی اور مطاعِ حقیقی اللہ کے سوا کوئی نہیں۔ کوئی بھی مسلمان جس نے اصطلاحی کلمات اربعہ کے تراجم مودودی صاحب کے نظریہ کے خلاف کیے ہیں اس بات کا قائل نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی حقیقی حاکم یا مالک و مطاعِ حقیقی موجود ہے۔ بلکہ امتِ مسلمہ کا ہر فرد اعتقاداً اور عملاً اللہ تعالیٰ ہی کو حاکم، مالک و مطاعِ حقیقی جانتا اور مانتا ہے اور کسی مسلمان سے یہ حقیقت مخفی نہیں کہ ’’ **لا طاعة لمخلوق فی معصیت الخالق۔** ‘‘

رہا معصیت کا صدور تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس نے محکمات قرآن میں کسی اشتباہ یا احتمال کی بناء پر کسی غلط فہمی میں مبتلا ہو کر معصیت کا ارتکاب کیا ہو۔ بلکہ بشری کمزوریوں کی بناء پر اس سے معصیت کا صدور ہوا جسے قرآن کے بارے میں غلط فہمی پر محمول کرنا انتہائی غلط فہمی کی دلیل ہے۔

مودودی صاحب کی نظر میں فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کی لاعلمی:

اب ہم اس تلخ حقیقت کو مودودی صاحب پر واضح کرنا چاہتے ہیں، کہ رب کا ترجمہ پروردگار یا پالنے والا اور اسی طرح عبادت کے معنیٰ پرستش اور بندگی اور طاغوت کا ترجمہ بت اور شیطان کرنے والے ان کے مقتدا اور پیشوا شاہ ولی اللہ محدثِ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ شاہ رفیع الدین دہلوی رحمۃ اللہ علیہ اور مولوی محمود الحسن دیوبندی ہیں۔ ملاحظہ ہوں ان کے تراجم، صرف یہی نہیں بلکہ سیدنا فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے طاغوت کا ترجمہ شیطان کیا ہے۔ (دیکھئے بخاری جلد دوم ص (۶۵۹) قال عمر الجبت السحر الطاغوت الشیطان

حوالہ جات منقولہ بالخصوص سیدنا فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کے قول کو سامنے رکھ کر یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ مودودی صاحب کے نزدیک فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ ہی کے دور میں قرآن مجید کی تین چاتھائی سے زیادہ تعلیم بلکہ اس کی حقیقی روح لوگوں کی نگاہوں سے مستور ہو چکی تھی۔ جو چودہ سو برس کے بعد اب مودودی صاحب کو نظر آئی ہے۔

(فاعتبروا یا اولی الابصار)



بسم اللہ الرحمن الرحیم

باب نمبر 11

تلاشِ راہِ حق

امامِ اہلسنت حضرت

از علامہ سید احمد سعید کاظمی رحمۃ اللہ علیہ

ماہنامہ السعید امام اہل سنت نمبر ۲۰۰۲ صفحہ ۱۷ تا ۲۵

عزیز طلبا! اکابرِ اہلسنت، قابل قدر لائق تحسین حاضرینِ محفل، انجمن طلباء اسلام کے اراکین و عہدیداران...... دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اپنے مقاصدِ حسنہ میں کامیابی عطا فرمائے، حقیقت یہ ہے کہ انجمن طلباء اسلام کے طلباء کی مساعی جمیلہ نہایت قابلِ تحسین ہیں، گویا ان طلباء نے اہلسنت کی لاج رکھ لی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو ہر مرحلہ میں کامیابی و کامرانی عطا فرمائے۔

میرے دوستوں نے تقاضا کیا ہے کہ راہِ حق اور اس کی صعوبتوں پر گفتگو کروں۔ اب میں اس مختصر وقت میں اس عنوان کو تفصیل کے ساتھ تو پیش نہ کر سکوں گا۔ بہر حال چند گزارشات پیشِ خدمت ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں سورۃ والعصر نازل فرمائی اس سورۃ مبارکہ کے مضامین بہت وسیع ہیں اور ان کی تفصیل بیان کرنے کیلئے بہت وقت کی ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے **"ان الانسان لفی خسر، الا الذین آمنوا وعملوا الصٰلحٰت وتوا صو بالحق واتوا بالصبر۔"** **(پ ۳۰، العصر ۲،۳)**

"یقیناً آدمی ضرور خسارے میں ہے، مگر جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک کام کیے اور آپس میں ایک دوسرے کو دینِ حق کی وصیت کی اور ایک دوسرے کو صبر کی نصیحت کی۔"

بے شک تمام انسان جو انسان کہلاتے ہیں جن کو انسان کہا جاتا ہے، جن کو دنیا والے انسان کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں، خسارے میں ہیں، سب نقصان میں ہیں" **الا الذین آمنوا وعملو لصٰلحت"** مگر جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک کام کیے، یعنی وہ لوگ گھاٹے میں نہیں ہیں جو ایمان لائے اور نیک کام کیے" **وتواصوا بالحق۔ وتوابالصبر۔** "اور آپس میں ایک دوسرے کو دینِ حق کی وصیت کی اور ایک دوسرے کو صبر کی نصیحت کی"، یعنی ایک دوسرے کو حق کی بات

کہتے اور صبر کی تلقین کرتے چلے آئے۔ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے حق پر قائم رہنے اور صبر کرنے کی توفیق عطا فرمائی۔ وہ، وہ لوگ ہیں جن کو نقصان ہے اور نہ کوئی گھاٹا، کسی نقصان سے ان کا تعلق نہیں ہے، اللہ تعالیٰ جل مجدہ نے اس مقام پر حق کے ساتھ صبر کی بات فرمائی '' **وتواصو بالحق۔ واتوابالصبر** '' اس کی وجہ یہ ہے کہ حق کی راہ میں مصائب و آلام پیش آتے ہیں۔ گویا جب کوئی حق کی راہ کو اختیار کرتا ہے تو لازمی طور پر اسے مصائب و آلام سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ پھر وہ حق کی راہ میں کامیاب کب ہوتا ہے؟ جب وہ ان مصائب و آلام کو برداشت کرتا ہے ان مصائب پر کوئی شکوہ نہیں کرتا اور یہ کام صبر کے بغیر ممکن نہیں ہے ..... حق کی راہ پر چلنا، حق کی حمایت کیلئے قدم اُٹھانا، مصائب و آلام کا پیش آنا اور پھر اس پر صبر کرنا، یہ نقصان سے بچنے کا ذریعہ ہے۔ یعنی وہی لوگ نقصان سے محفوظ ہیں جنھوں نے راہِ حق کو اختیار کیا اور اس کے نتیجہ میں پیش آمدہ مصائب و آلام پر صبر کیا۔

اب میں اس کی تفصیل میں کیا عرض کروں؟ میں اتنی بات بتانا چاہتا ہوں کہ رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ مقدسہ وہ ہے کہ جس نے ہمیں ہمیشہ حدیٰ، امن و سکون اور کامیابی کے تمام مراحل دکھائے اور اللہ نے اعلان فرمایا کہ '' **لقد کان لکم فی رسول الله اسوۀ حسنه** '' یعنی رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ مقدسہ ہی میں اور آپ کی سیرتِ طیبہ کی اتباع ہی میں تمہارے لیے فلاح، بہتری اور خیر ہے۔

جب ہم سیرتِ رسول ﷺ پر نظر ڈالتے ہیں تو پہلے تو ہمیں آپ کی تیرہ سالہ مکی زندگی نظر آتی ہے۔ یہ تیرہ سالہ زندگی مصائب و مشکلات سے عبارت ہے۔ اعلانِ نبوت کے بعد جھوٹے خداؤں کے انکار اور وحدہ لاشریک کی الوہیت کے اقرار کے بعد مشرکینِ مکہ نے حضور ﷺ اور آپ کے نام لیواؤں کیلئے جو مشکلات پیدا کیں سب پر عیاں ہیں۔ آپ کے راستے میں کانٹے بچھائے گئے، آپ پر کوڑا کرکٹ پھینکا گیا۔ آپ پر سنگ باری کی گئی، آوازے کسے گئے، قتل کی سازشیں تیار کی گئیں، آپ کا

معاشرتی مقاطعہ (سوشل بائیکاٹ) کیا گیا۔ آپ پر عرصہ حیات اس قدر تنگ کیا گیا کہ آپ کو اپنا وطن ترک کرنا پڑا اور مدینے کی طرف ہجرت کرنا پڑی۔

مکۃ المکرّمہ میں آپ نے جو صعوبتیں برداشت کیں ان کا گویا پھل مدنی زندگی میں نظر آیا اور مکہ کی مشکلات کے بعد مدینہ منورہ میں صورتِ حال بہت خوشگوار اور سازگار رہی۔ اگر چہ وہاں بھی جہدِ مسلسل کا سماں تھا۔ یہودیوں کی سازشیں تھیں اور کفارِ مکہ کی یورشیں تھیں۔ اس کے باوجود عمومی صورتِ حال بہت موافق تھی۔

اس مقام پر یہ بات مزید قابلِ ذکر ہے کہ زندگی کے سفر میں آزمائشوں اور امتحان سے گزرنا، دشواریوں کا سامنا کرنا، بادِ مخالف کے سامنے ڈٹ جانا ممکن نہیں ہوتا جب تک انسان عشق سے سرشار نہ ہو، یہ عشق اللہ سے ہو، اسکے رسولوں سے ہو، اپنے مشن سے ہو، یا دنیا سے ہو، اقتدار سے ہو، مال سے ہو، اس دنیاوی زندگی سے ہو، شہرت سے ہو، زمین جائیداد سے ہو یا آل اولاد سے ہو، بہر حال شدید جذباتی وابستگی اور عشق کی گرمی ہوتی ہے جو کسی بھی انسان کو زندگی کے ناہموار راستوں پر استقامت بخشتی ہے۔

اگر وہ محبت اعلیٰ ہستیوں سے ہو اور اعلیٰ مقاصد کی خاطر ہو تو لائقِ تحسین ہوتی ہے اور اگر ادنیٰ چیزوں سے اور بے وقعت اشیاء کی خاطر ہو تو باعثِ شرم ہوتی ہے۔

ہم نے دیکھا کہ حضور تاجدارِ مدینہ ﷺ نے تیرہ سالہ مکی زندگی میں صحابہ کے اندر جو جوہر بھر دیا تھا'' **والله بالله ثم تالله** '' اس کے نتائج مدینے میں یعنی بدر کے میدان میں، احد کی پہاڑی میں، حنین کے مقام میں اور ان تمام غزوات اور جہادوں میں ظاہر ہوئے جو مسلمانوں کو پیش آئے اور پھر میں سچ کہتا ہوں کہ وہ تمام جوہر خلافتِ صدیقی میں، خلافتِ فاروقی میں، خلافتِ عثمانی میں اور خلافتِ مرتضوی میں ظاہر ہوئے۔ ہماری اسلامی تاریخ اس بات کی گواہی دے رہی ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ نے مشکلات پر قابو پانے کا جو جذبہ صحابہ کے اندر رکھ دیا تھا۔ **والله بالله ثم**

تاللہ۔ وہی جذبہ آج ہم تک پہنچا ہے۔ اگر وہ جذبہ مسلمانوں میں نہ ہوتا تو آج شاید ہم دین وایمان کی اس نعمت سے محروم ہوتے۔

انجمن طلباء اسلام اور عشقِ مصطفےٰ ﷺ:

انجمن طلباء اسلام ایک ایسی پیاری جماعت ہے کہ جنھوں نے عشقِ مصطفیٰ ﷺ، محبتِ مصطفیٰ ﷺ کو اپنا مطمعِ نظر اور پنا نصب العین بنایا ہے...... اور یہ طلباء کیا ہیں؟ در حقیقت یہ ہماری قوم کا ایک اہم سرمایہ ہیں۔ یہ ہماری قوم کا ایک خلاصہ اور عطر ہیں بشرطیکہ ہم نے ان کے ذہنوں کو، ان کے قلوب کو، ان کے باطنوں کو اور ان کے ظاہر کو درست کرلیا اور ان کے دلوں میں حضور ﷺ کی محبت کو درست کرلیا اور ان کے دلوں میں حضور ﷺ کی محبت پیدا ہوگئی...... تو پھر ان کا راہِ حق کی طرف قدم اُٹھانا اور کسی مشکل کے سامنے نہ گھبرانا اور ہر مشکل کے سامنے، حق کی حمایت کیلئے ڈٹ جاتے ہیں اور ملک کی بہتری کیلئے، ملک کے تحفظ کیلئے انھوں نے وہ کام کیے جو ہمارے لیے باعثِ فخر ہیں۔ انجمن طلباء اسلام ہماری ترجمانی کررہی ہے۔ جو کام مجھے اور آپ نے مل کر کرنا تھا، وہی کام، انجمن طلباء اسلام کررہی ہے اور یہ ہماری، اہلسنت کی جماعت ہے۔ ہم بحیثیتِ اہلسنت اکثریت کے مدعی ہیں اور حقیقت بھی یہی ہے کہ اکثریت ہماری ہے۔

عزیزانِ محترم! دوسری جماعتیں جس تنظیم کے ساتھ، جس استحکام کے ساتھ منظم اور مستحکم ہیں، اسی قوت، تنظیم اور استحکام کے ساتھ میں انجمن طلباء اسلام کو آگے بڑھتا ہوا دیکھنا چاہتا ہوں انجمن طلباء اسلام میں بظاہر وہ قوت، تنظیم اور استحکام موجود نہیں تو اس کی وجہ ہم اہلسنت کی غفلت اور بے توجہی ہے۔ حالانکہ ہم تو سب سے زیادہ ہیں۔ اس لیے ہمیں تنظیمی طاقتوں میں سے زیادہ طاقتور ہونا چاہیے اور یہ جبھی ہوسکتا ہے کہ جب تمام اہلسنت اپنے اندر یہ احساس پیدا کرلیں کہ یہ جماعت کتنی قیمتی ہے اور اس کا وجود کتنا ضروری ہے۔ اس کے بغیر ہمارا ہونا نہ ہونے کے برابر ہے،

چھوٹے چھوٹے گروہ اپنے گروہوں کو سکولوں میں، کالجوں میں اور یونیورسٹیوں میں منظم کرکے مختلف حربوں سے مختلف طریقے اختیار کرکے بے حد تقویت دے رہے ہیں...... لیکن اہلسنت بالکل خاموش ہیں۔ انہیں بالکل خبر ہی نہیں کہ ہماری جماعت کا کیا حال ہے؟ کسی کا ہاتھ ان پر نہیں ہے۔ کوئی بھی ان کی سرپرستی کرنے کو تیار نہیں ہے۔ حالانکہ ان کا قدم راہِ حق کیطرف ہے۔ اور قدم قدم پر ان کیلئے مشکلات ہیں۔ یقیناً یہ (A.T.I) اپنی ہمت سے آگے بڑھ رہے ہیں۔ اور انشاءاللہ آگے بڑھتے رہیں گے۔ لیکن ہمارا اور آپ کا بھی کوئی فرض ہے کہ ہم راہِ حق میں ان کی پیش آمدہ مشکلات میں ان کے ساتھ تعاون کریں۔

عزیزانِ محترم! میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ راہِ حق میں یہ قدم اٹھانے والی جماعت انجمن طلباء اسلام ہے۔ ان کو جو مشکلات آرہی ہیں ان مشکلات کا ان کے پاس کوئی مداوا ہے اور نہ کوئی تدراک۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم ان کے ساتھ ہر طرح کا تعاون کریں۔ ان کے اندر حضور ﷺ کی محبت کا، حضور ﷺ کے عشق کا، ملک کی محبت کا ایک جذبہ ہے اور یہ جذبہ محبت اتنی بڑی نعمت ہے کہ اس نعمت پر ساری نعمتوں کو قربان کردوں۔ یہ جذبہ محبت اور یہ عشقِ رسول ﷺ خدا کی قسم دین کی جان، اسلام کی جان، ایمان کی جان اور جہاد کی روح ہے۔ جب تک یہ نہ ہو، جہاد کا جذبہ پیدا ہو ہی نہیں سکتا۔ اور جہاں میں، جان ومال، سب قربان کرنا پڑتا ہے...... آج کوئی شخص اپنی جیب سے کسی کو سو روپے دینے کیلئے تیار نہیں ہوتا۔ جب تک کہ کہیں اس کی محبت کا تعلق نہ ہو۔ اگر بیٹا یا بیوی کوئی فرمائش کرے تو فوراً پوری ہوجاتی ہے کیونکہ ان کی محبت اس کی دل میں ہے لیکن کوئی فقیر بے نوا اس سے دس روپے مانگے تو وہ دینے کو تیار نہیں ہوتا کیونکہ اس کے دل میں اس کی کوئی محبت نہیں۔

عزیزانِ محترم! اگر آپ چار پیسے بغیر محبت کے نہیں نکال سکتے تو سر بغیر محبت کے کون کٹاتا ہے؟ یہ محبت کا جذبہ ہے کہ جس نے صحابہ کرام کو بدر کے میدان میں، اُحد کی

پہاڑی میں، حنین کے میدان میں، علی ہذا القیاس تمام غزوات میں قربانی کیلئے تیار کیا۔ آپ کو معلوم ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے انہیں وارفتگارن محبت کو میدانِ بدر میں جمع فرمایا اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عرض کیا کہ اے مولا! اگر یہ تین سو تیرہ ہلاک ہو گئے تو تیری عبادت نہیں کی جائے گی۔ (اللہ اکبر) کیا شانِ محبوبانہ تھی؟ لیکن میں آپ سے عرض کروں؟ صحابہ کرام سے پوچھئے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم محبت کا کس قدر جذبہ رکھتے تھے؟ چھوٹے چھوٹے بچے ایڑیوں کے بل کھڑے ہو جاتے تھے کہ جوان نظر آئیں اور پھر ہمیں بھی کسی طرح مجاہدین میں شامل کر لیا جائے، ان میں یہ عشق و محبت کا جذبہ تھا۔ اس مقام پر ایک آدھ شبہ بھی دور کرتا چلوں۔

سوال: جنگِ اُحد کے موقع پر ستر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی شہادت پر لوگ اعتراض کرتے ہیں اور اسے ایک طرح مسلمانوں کی شکست گردانتے ہیں؟

جواب: میں عرض کروں گا ایسا نہیں، یہ محض مغالطہ ہے، اس ضمن میں دو باتیں ہیں، ایک بات تو یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے یہ بتایا کہ میرے محبوب ﷺ کے فرمان پر اگر تم نے عمل نہ کیا تو تمہیں کوئی کامیابی نصیب نہیں ہوگی اور میرا یہی عقیدہ ہے کہ جن صحابہ کرام کو اس درہ پر متعین فرمایا گیا تھا، انھوں نے معاذ اللہ، معاذ اللہ! معصیت کے ارادے سے ہرگز کوئی قدم نہیں اٹھایا، کسی میں حضور ﷺ کی نافرمانی کے جذبہ کا تصور تک نہ تھا، باقی بتقاضائے بشریت، ان سے بھول ہو گئی، اور درہ کو چھوڑ دیا، دشمنوں نے بھاگتے ہوئے پیچھے اس درہ سے مسلمانوں پر حملہ کر دیا اور ستر صحابۂ کرام علیہم الرضوان شہید ہو گئے اور خود حضور سرورِ دو عالم ﷺ کو بھی بہت سے زخم آئے اور دو دندان مبارک کے کنارے بھی شہید ہوئے۔ یہ سب کچھ ہوا، بتانا یہ تھا کہ اے میرے محبوب کے صحابیو! اگر چہ تم میرے نزدیک بے حد عزت و مرتبے کے حامل ہو لیکن یہ سب کچھ تو میرے محبوب کے صدقے میں تم کو ملا ہے۔ اگر تم صحابۂ رسول ہو کر بھی میرے محبوب کے فرمان کے برعکس کوئی کام کرو گے تو پھر اس کا نتیجہ تمہارے حق میں

تکلیف کے سوا کچھ نہیں ہوگا تو اس طرح اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کی عظمت کا اعلان فرمایا اور پھر یہ بھی بتایا کہ تم میں جو شہید ہوئے ہیں وہ بھی اللہ کے نزدیک بہت عظمت والے ہیں، بدر کے میدان میں تیرہ مہاجر اور سات انصاری شہید ہوئے تو لوگوں نے کہا کہ وہ دنیا کی نعمتوں سے محروم ہو گئے اور مر گئے تو ان کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا'' **ولا تقولو لمن یقتل فی سبیل الله اموات**' 'ترجمہ: اور جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل کیے جاتے ہیں، انہیں مردہ نہ کہو۔'' **بل احیاء ولکن لا تشعرون**'' بلکہ وہ زندہ ہیں، تمہیں شعور نہیں۔'' (پ۲، سورہ البقرۃ ۱۵۴)

تو میں عرض کر رہا تھا کہ اللہ تعالیٰ جل جلالہٗ، وعم نوالہ نے ہر ''عسر کے بعد یسر'' کو رکھا ہے اور ہر تکلیف کے دامن میں راحت کو رکھا ہے۔ اس لیے فرمایا'' **فان مع العسر یسرا۔**'' بے شک ہر دشواری کے ساتھ (عظیم) آسانی ہے۔'' **ان مع العسر یسرا**'' یقیناً ہر دشواری کے ساتھ (بہت بڑی) آسانی ہے۔'' (النشراح ۵،۶) یعنی ہر عسر کے ساتھ ایک نہیں بلکہ دو یسر ہیں گویا ہر تکلیف میں راحت کو چھپایا بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ موت کے اندر حیات کو مضمر فرمایا ہے اور قرآن نے بار بار ہم کو فرمایا ہے'' **ومالکم لا تقاتلون فی سبیل الله والمستضعفین من الرجال والنساء والولدان الذین یقولون ربنا اخرجنا من هذا لقریة الظالم اهلها واجعل لنا من لدنك ولیا۔ وجعل لنا من لدنك نصیرا۔'' (النساء ۷۵)**

اور (مسلمانوں) تمہیں کیا ہے کہ نہ لڑو اللہ کی راہ میں حالانکہ بے بس کمزور مردوں، عورتوں اور بچوں میں سے وہ ہیں جو دعا کر رہے ہیں کہ اے ہمارے رب ہمیں اس بستی سے نکال جس کے لوگ ظالم ہیں اور اپنے پاس سے ہمارے لیے کوئی کارساز بنادے۔ اور کردے کسی کو اپنی طرف سے ہمارا مددگار۔''

یہ خطاب عہدِ رسالت کے انصار مومنین (مدینے والوں) کو ہے کہ "**ومالکم لا تقاتلون فی سبیل اللہ**" (مسلمانو) تمہیں کیا ہے کہ نہ لڑو اللہ کی راہ میں" **والمستضعفین من الرجال والنساء والولدان**" حالانکہ بے بس کمزور مردوں، عورتوں اور بچوں میں سے وہ ہیں۔

یعنی وہ لوگ کمزور نہ تھے مگر انہیں دبا دیا گیا تھا اور انہیں کمزور کر دیا گیا تھا اور وہ کون ہیں؟ **من الرجال** مرد بھی، **والنساء** عورتیں بھی ہیں **والولدان** اور بچے بھی ہیں ان کا کیا حال ہے؟ ان کا حال یہ ہے کہ وہ مکہ کے اندر ان ظالموں کے ظلم و ستم سے دوچار ہوئے ہیں۔ "**الذین یقولون**" اور وہ رات دن یہ گریہ کرتے ہیں کہ" **ربنا اخرجنا من ھذہ القریۃ**" اے ہمارے رب ہمیں اس بستی سے نکال دے یعنی اس مکہ سے ہمیں نکال دے۔ "**الظالم اھلھا**" جس کے لوگ ظالم ہیں، یعنی" **واجعل لنا من لدنک ولیا**" اور اپنے پاس سے ہمارے لیے کوئی کارساز بنا دے" **واجعل لنا من لدنک نصیرا**" اور کردے کسی کو اپنی طرف سے ہمارا مددگار۔"

سوال: شاید آپ یہ کہیں کہ مدینے کے مسلمانوں نے قتال نہیں کیا تو ہم کیوں کریں؟

جواب: یہ غلط ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو حکم دیا اور مدینہ کے مسلمانوں نے عمل کیا۔ مکہ کو فتح کیا۔ انصار مومنین نے مکہ کے ظالموں سے مظلوم مسلمانوں کو آزاد کرا دیا پھر آپ کو معلوم ہوا ہے کہ مکہ کے رہنے والے کافروں کو قرآن نے ظالم کہا ہے اور اس مکہ کے اندر اللہ تعالیٰ نے انقلاب پیدا کیا؟ کہ پھر جاہلیت کو ہمیشہ کیلئے ختم کر دیا گیا۔ کفر اور بُت پرستی کو ختم کر کے توحید کے پرچم لہرائے گے اور قیامت تک لہراتے رہیں گے۔

یہ الگ بات ہے کہ وہاں کسی قسم کا کوئی ایسا معاملہ درمیان میں آ جائے کہ جو

ہمارے لیے اور آپ کیلئے تکلیف کا باعث ہو کچھ بھی ہو، مگر "**لاالہ الا اللہ محمد رسول اللہ**" کے خلاف وہاں کوئی آواز نہیں اٹھ سکتی، اور یہ توحید کا پرچم تا قیامت لہراتا رہے گا۔

میں عرض کر رہا تھا کہ مدینے کے مسلمانوں نے قرآن پر عمل کیا، جہاد کیا، قتال کیا، ہر قسم کی قربانیاں دیں، یہی حق کی راہ تھی جن پر انھوں نے مشکلات کو برداشت کیا۔ یقین کیجئے کہ تیرہ سالہ مکی زندگی میں مسلمان یہی کرتے رہے، اور پھر مدینے میں آنے کے بعد بدر میں انھوں نے حق کی راہ میں مشکلات کا سامنا کیا اور مشکلات کو عبور کیا اور اسی طرح تمام اسلامی غزوات میں ہوا، خلافتِ راشدہ میں کیا ہوا؟ کہ جب صدیق اکبر ؓ تختِ خلاف پر جلوہ گر ہوئے تو ارتداد کا فتنہ کھڑا ہوا۔ ارتداد کے فتنہ کو حضرت صدیق اکبر ؓ نے فرو کیا۔ یہ راہِ حق میں کتنی بڑی مشکل تھی؟ مگر آپ نہیں گھبرائے، اس زمانہ میں مسلیمہ کذاب نے نبوت کا دعویٰ کیا ہوا تھا اور وہ ایک بہت بڑا فتنہ تھا۔ اس کی سرکوبی کیلئے وہاں مسلمانوں کی ایک بہت بڑی فوج لڑ رہی تھی۔ اس میں جلیل القدر حفاظ صحابہ کرام شہید ہو رہے تھے، حضرت عمر ؓ یہ دیکھ کر گھبرا گئے کہ کہیں ہم قرآن کے ایک عظیم حصہ سے محروم نہ ہو جائیں کیونکہ حضور نبی کریم ﷺ نے قرآن مجید کو کتابی شکل میں مرتب نہیں فرمایا تھا اور قرآن کریم حفاظ کے سینوں میں مرتب تھا اور وہ شہید ہو رہے تھے، حضرت عمر ؓ گھبرائے ہوئے حضرت صدیق اکبر ؓ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے صورت حال سے آگاہ کیا اور عرض کیا کہ ابھی ابھی قرآن مجید کو جمع کیا جائے۔

پہلے تو یہ بات کہوں گا کہ حضرت عمر ؓ کے دل میں یہ جذبہ پیدا ہوا ہوگا کہ قرآن مجید جمع ہو جائے۔ ایمان سے کہنا یہ ایمان کا تقاضا ہے یا نہیں ہے؟ میں حضرت فاروق اعظم ؓ کے ایمان کو سلام کرتا ہوں۔ یہ کمالِ ایمانی کی دلیل ہے۔ آپ نے دیکھا کہ ایسا نہ ہو کہ ہم قرآن مجید کے ایک بڑے حصہ سے محروم ہو جائیں تو گھبرا کر

جمع قرآن کیلئے حضرت ابو بکر صدیق ؓ سے عرض کیا تو حضرت صدیق اکبر ؓ نے کہا کہ (میں وہ کام کیسے کروں جو رسول اللہ ﷺ نے نہیں کیا) کیونکہ حضرت صدیق اکبر ؓ، حضور نبی کریم ﷺ کی سنت کے سانچے میں ڈھلے ہوئے تھے، سنتِ رسول کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے، تو اس لیے کہا کہ اے عمر! ''وہ کام میں کیسے کروں جو رسول اللہ ﷺ نے نہیں کیا''، یعنی کتابی شکل میں قرآن مجید کو جمع نہیں فرمایا تو جو کام سرکار ﷺ کی سنت کے خلاف ہو، طریقے اور عمل کے خلاف ہو، میں وہ کام کیسے کراوں۔ حضرت صدیق اکبر ؓ کو فاروق اعظم ؓ نے یہ جواب دیا کہ ''ہو خیر'' کہ ''اس میں بہتری اور بھلائی کا پہلو ہوا، لہٰذا اس کو کیجئے، صدیق اکبر ؓ نے پھر یہی کہا، حضرت عمر ؓ نے پھر وہی جواب دیا، کئی دفعہ تکرار کے بعد حضرت صدیق اکبر ؓ فرماتے ہیں ''اللہ تعالیٰ نے میرے سینے کو اس چیز کیلئے کھول دیا جس کیلئے عمر کے سینے کو کھولا تھا'' اور پھر زید بن ثابت انصاری کو بلایا اور فرمایا کہ جنگ یمامہ سخت ہوگئی ہے، حفاظ اور قراء شہید ہورہے ہیں، خدا کیلئے ابھی ابھی قرآن مجید کو جمع کیجئے تو زید بن ثابت انصاری نے وہی جواب دیا جو صدیق اکبر ؓ نے فاروق اعظم کو دیا تھا اور صدیق اکبر ؓ نے وہی جواب دیا جو حضرت عمر نے صدیق اکبر کو دیا تھا کہ'' **ہو خیر** '' کہ اس میں خیر کا پہلو ہے، مطلب یہ تھا کہ بیشک یہ کام حضور ﷺ نے نہیں کیا لیکن سرکار نے منع بھی تو نہیں فرمایا اور اس میں خیر کا پہلو ہے لہٰذا اس کو کر لینا چاہیے، کئی دفعہ مراجعات کلام کے بعد زید بن ثابت نے فرمایا'' یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے میرے سینے کو بھی کھول دیا جس کیلئے ابوبکر و عمر ؓ کے سینے کو کھولا تھا۔''

میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ راہِ حق میں یہ کتنی بڑی مشکلات تھیں جو پیش آئیں مگر جن کے دلوں میں عشقِ مصطفیٰ ﷺ تھا انھوں نے راہِ حق میں قدم رکھا اور ان مشکلات کا مردانہ وار مقابلہ کیا، اور پھر قرآن پاک جمع ہوا۔

میں یہ بات عرض کرتا ہوں کہ یہ بات طے ہوگئی کہ ''جو کام سرکار ﷺ نے نہیں

کیا اس سے منع بھی نہیں فرمایا اور اس میں خیر کا پہلو بھی ہے تو اس کام کو کر لینا چاہیے'' یہ نقطہ واضح ہوگیا کہ نہیں ہوگیا، اللہ اللہ اللہ! صدیق اکبر ؓ نے فاروق اعظم ؓ کی توجہ دلانے سے، اس نقطہ کو قبول کرلیا، زید بن ثابت انصاری نے بھی شیخین کی توجہ دلانے سے اس نقطہ کو قبول کرلیا لیکن آج ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو اس نقطے کو قبول کرلینے کو تیار نہیں ہیں، یہ کیسی عجیب بات ہے؟

بہر حال! جہاں اور مشکلات ہیں وہاں راہِ حق میں ایک یہ بھی مشکل ہے، لیکن اگر آپ نے ہمت کے ساتھ راہِ حق اٹھایا ہے تو انشاء اللہ آپ ہر مشکل کو عبور کرتے جائیں گے۔ بدر کے میدان میں مشکل عبور ہوگئی، احد پہاڑی کی مشکل عبور ہوگئی، حنین کے میدان میں مشکل عبور ہوگئی اور وہی مشکلات خلافتِ راشدہ میں پیش آئیں، کیا فاروق اعظم ؓ کے زمانے میں مشکلات پیش نہیں آئیں؟ اللہ اکبر! کیسے کیسے معرکے ہوئے اور پھر فاروق اعظم ؓ کو ان کے ساتھ جہاد کرنا پڑا، اور اس جہاد کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک ایک مہینے میں چوراسی چوراسی شہر فتح ہوئے۔ اور دنیا میں فاروق اعظم کی فتوحات کا ڈنکا بج گیا۔ پھر حضرت عثمان غنی ؓ کے زمانے میں اس قسم کی مشکلات پیش آئیں اور ان حضرات نے دنیا کو بتا دیا کہ مسلمان جب حق کیلئے قدم اٹھاتا ہے تو کوئی مشکل اس کے درمیان حائل نہیں ہوسکتی اور وہ اس کو مشکل نہیں سمجھتا، وہ اس کو روندتا ہوا اور پامال کرتا ہوا چلا جاتا ہے، ہمیں امام حسین ؓ نے یہی سبق پڑھایا، جو مشکلات تھیں ان میں آپ ثابت قدم رہے، لوگ کہیں گے یزید کامیاب ہوا، خدا کی قسم یزید کامیاب نہیں ہوا، حضرت امام حسین ؓ کامیاب ہوئے۔ کیونکہ وہ ثابت قدم رہے۔''

سوال: لوگ کہا کرتے ہیں کہ کیا حضرت علی مشکل کشا ہیں؟ حضرت ﷺ بھی مدد فرمانے والے ہیں تو جب خاندانِ نبوت پر مصائب و آلام آئے تو حضرت علی نے مشکل آسان فرمائی اور نہ حضور ﷺ نے۔

جواب: ٹھیک ہے تمہارے نزدیک ان کی مدد نہیں ہوئی۔ اچھا یہ بتاؤ قرآن کیا کہتا ہے؟ قرآن کہتا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ”مومنین کی مدد اللہ تعالیٰ پر حق ہے۔“

انجمن طلباء اسلام کے عزیز بچو! میں تمہیں خوشخبری دیتا ہوں کہ حق کے میدان میں، حق کی راہ میں، جونہی تم نے قدم اٹھایا، اللہ تعالیٰ کی نصرت ضرور تمہارا ساتھ دے گی، مشکلات آئیں گی، مگر محبت سے ان کو پامال کرتے جاؤ اور روندے چلے جاؤ کسی مشکل کی پرواہ بھی نہ کرو کہ کوئی مشکل ہے۔ انشاء اللہ! تمہاری راہ میں کوئی رکاوٹ، رکاوٹ ثابت نہ ہوگی، تم ہر رکاوٹ کو پامال کرکے، انشاء اللہ منزل مقصود کو پالو گے۔ میں تم سے پوچھتا ہوں کہ جب قرآن نے وعدہ کیا کہ ”ایمان والوں کی مدد ہم پر حق ہے“ یہ قرآن کی آیت ہے، یہ حدیث نہیں کہ جس کو تم ضعیف کہہ دو، تو ستر صحابہ جو احد میں شہید ہوئے کیا وہ مومن نہیں تھے؟ اور اللہ تعالیٰ تو مشکل کشا ہے، اللہ تعالیٰ ان کو قتل ہونے سے بچالیتا، اگر وہ مومن تھے تو پھر وہ کیوں شہید ہوئے؟ معلوم ہوا کہ شہید ہونا مدد ہونے کے منافی نہیں ہے، چلو تم حضرت علی رضی اللہ عنہ اور سرورِ دو عالم ﷺ کی مدد کے قائل نہیں ہو تو ہم بھی ان کو کوئی مستقل مددگار نہیں مانتے، ہم کسی کی عون کے مستقلاً قائل نہیں ہیں۔ ہمارا تو ایمان یہ ہے کہ تمام محبوبین مقدسین مظاہر عون الٰہیہ ہیں، اور مدد کرنے والا، عنایت فرمانے والا اللہ ہے، اللہ ہے، اللہ ہے، اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی حقیقتاً مددگار نہیں، کوئی معاون اور معین نہیں، وہ ایک ہی معین ہے، لیکن آپ سے پوچھتا ہوں کہ جب اللہ کا وعدہ تھا، تو یہ قیاس کرنے والے مجھے بتائیں کہ کربلا کے میدان میں حضرت امام حسین اور ان کے ساتھی، مومن تھے یا نہیں، وہ مومن تھے، اگر وہ مومن نہیں تھے تو تم کہاں سے مومن نکل آئے اور معلوم ہوا کہ تم نے اس آیت کا مفہوم غلط سمجھا ہے، میں کہتا ہوں کہ مومن کی مدد کرنا اللہ کا وعدہ ہے، شہید ہوجانا اگر نصرت کے خلاف ہے تو قرآن معاذ اللہ غلط ہوتا ہے؟ قرآن غلط ہو نہیں سکتا، لہٰذا تم اپنی غلطی کو تسلیم کرلو۔ اگر تم مجھ سے پوچھتے ہو تو میں یہی کہوں گا کہ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ نے راہِ حق کی

طرف قدم اٹھایا، بھوک، پیاس، ہیں زخمی، ساتھیوں کا مقتول ہونا اور اللہ کی راہ میں خود جان دینا، یہ سب مشکلات سامنے آئیں، مگر کوئی مشکل ان کے قدم ڈگمگا نہ سکی، واللہ، باللہ ثم تاللہ، یہ اللہ کی نصرت تھی کہ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ آخر تک حق پر قائم رہے اور یزید کی بیعت نہ فرمائی، اللہ تعالیٰ نے اپنی مدد حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کے شاملِ حال کردی کہ دنیا کی کوئی مصیبت، کوئی مشکل تیرے قدموں کو ڈگمگا نہ سکے گی۔ یہاں تک کہ تو شہادت کی منزل کو پہنچ جائے گا ”**كان حقا علينا نصر المؤمنين**“ یہی اللہ تعالیٰ کی مدد اور نصرت تھی جو آپ کو شہادت کے مقام تک لے گئی۔“

آپ اپنے بچہ کو روزہ رکھواتے ہیں، آپ کے گھر میں اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتیں بے شمار ہیں، مشروبات رکھے ہیں، کھانے پینے کی اعلیٰ سے اعلیٰ چیزیں گھر میں موجود ہیں، لیکن بچہ رونے کی وجہ سے بھوکا، پیاسا ہے، بے چین و بے قرار ہے مگر آپ اسے کھانا دیتے ہیں نہ پانی بلکہ آپ اس کی ہمت بندھاتے ہیں، اسے بہلاتے ہیں کہ ابھی دن غروب ہونے والا ہے ذرا صبر کرو، تسلی کرو، ابھی افطاری کا وقت آتا ہے، ذرا صبر کرو یہ تسلی دینا، یہی بچے کی مدد ہے، ہمارا ایمان ہے کہ اگر امام حسین رضی اللہ عنہ پانی کیلئے زمین پر پاؤں مارتے تو پانی کے چشمے پھوٹ پڑتے، آپ اشارہ فرماتے تو نظامِ کائنات درہم برہم ہوجاتا، لیکن بات یہ تھی کہ یہ جیسے آپ اس بچہ کو تسلی دے کر روزے افطار کے وقت تک لے جاتے ہیں اسی طرح اللہ تعالیٰ نے حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کو شہادت کی منزل تک پہنچایا۔ یہی اللہ تعالیٰ کی مدد ہے۔

سوال: کسی نے مجھ سے پوچھا کہ قتلِ حسین (رضی اللہ عنہ) سے پہلے یزید اور اس کے ساتھی مومن تھے یا نہیں؟

جواب: یزید کے ایمان و کفر پر تو بہت کچھ کلام موجود ہے۔ ہمارے امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ نے اس مسئلہ میں توقف فرمایا ہے، لیکن اس فسق و فجور اور اس کی بداعمالیوں پر تو سبھی اہلِ علم متفق ہیں، ہم فاسق کو بھی ایمان سے خارج نہیں کہتے اور میں یہ سمجھتا ہوں

کہ یزید قتلِ حسین (رضی اللہ عنہ) سے پہلے بھی فاسق تھا اور قتلِ حسین (رضی اللہ عنہ) کے بعد بھی۔

اگر سوال کرنے والے کی نیت یہ ہے کہ جب یزید بھی مومن تھا اور قرآن کی روشنی میں اللہ کی طرف سے مدد مومن کیلئے حق ہے تو مومن یزید بھی ہے۔ تو میں عرض کروں گا کہ اس مقام پر ایمان کے مراتب و مدارج اور مدد کی کیفیات کی ایک طویل بحث چھڑ سکتی ہے، میں اس طوالت میں جائے بغیر اتنی گزارش کروں گا کہ جو ایمان کے بلند مرتبے پر فائز ہیں، جو اللہ اور رسول ﷺ کی رضا کے حصول میں کوشاں ہیں اور اس مقصد کیلئے سختیوں اور مظالم کا سامنا کر رہے ہیں جو قربانی اور ایثار کے راستے پر چل رہے ہیں اور جن کیلئے جنت کے نواجوانی کی سرداری کا وعدہ ہے یقیناً اللہ کی مدد اور نصرت کے وہی زیادہ حق دار ہیں۔ خاص طور پر اس صورت میں جبکہ ان کا حریف، مدمقابل، فاسق و فاجر ہو ظالم و جابر ہو، اگر کوئی حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے متعلق غلط فہمی میں مبتلا ہو تو وہ اجتہادی غلطی کی بنا پر ہوا۔ اللہ تعالیٰ ان کو معاف فرمائے۔ جب ان کی موت کا وقت قریب آیا تو انھوں نے وصیت کی کہ رسول اللہ ﷺ کے تبرکات شریفہ یعنی ناخن مبارک کے تراشے، میرے سینے پر رکھ دینا اور مجھے میرے رب کے حوالے کر دینا، میں حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے خلاف ایک لفظ بھی تصور میں نہیں لا سکتا اور نہ زبان سے کہنا جائز سمجھتا ہوں، وہ صحابی رسول ﷺ ہیں، حضور ﷺ کی صحابیت کی عظمت ایک ایسی چیز ہے جو ان کو ہر لغزش کے اوپر غالب ہے، لیکن جہاں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا مقابلہ آئے گا تو میں کبھی نہیں کہوں گا کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ حق پر ہیں۔ حق پر حضرت علی ہیں! حق پر حضرت علی ہیں! حق پر حضرت علی ہیں۔''

عزیزانِ محترم! میں یہ عرض کر رہا تھا کہ ہر سختی کے بعد آسانی ہے، پھر ایک نہیں دو آسانیاں ہیں، لہٰذا یہی سختی تو وہی مشکلات ہیں۔ یہ مشکلات حق کی راہ میں قدم اُٹھانے والوں کو پیش آتی ہیں، اگر وہی مشکلات اہلِ حق کو پیش آ جائیں تو وہ ان کو روندتے ہوئے چلے جاتے ہیں مگر یہ کب ہوگا؟ جب آپ کے سینے میں عشقِ مصطفیٰ

ﷺ ہوگا۔

یہ جہاد جہاد کا نعرہ لگانے والو! سوچ لو کہ جہاد کا نعرہ وہ لگا سکتا ہے جو حضور ﷺ کے عشق و محبت کا قائل ہو کیونکہ عشق و محبت کے بغیر جہاد نہیں ہوتا...... منافقین جہاد میں جاتے تھے مگر عشقِ مصطفیٰ ﷺ سے عاری تھے۔ ذلیل و خوار واپس آ جاتے تھے اور مومنوں کیلئے عشقِ مصطفیٰ ﷺ کی شمع فروزاں تھی۔ ان کے دلوں میں سرکار ﷺ کی محبت کے جلوہ گر تھی۔



بسم اللہ الرحمن الرحیم

باب نمبر 12

فقیہ العصر، مُحدثِ اعظم

از مولانا مشیر احمد دہلوی

کراچی

ماہنامہ السعید امام اہل سنت نمبر ۲۰۰۲ صفحہ ۵۷ تا ۶۰

موت و حیات قانونِ فطرت ہے جو اس دنیا میں آیا ہے اسے ایک دن ضرور جانا ہے لیکن بعض شخصیتیں ایسی ہوتی ہیں جب وہ اس جہانِ گل سے رخصت ہو کر عالمِ آخرت کی طرف پرواز کرتی ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ قلب و دماغ کی دنیا میں ایک زلزلہ آ گیا اور ہم سے ہماری متاعِ عزیز کوئی چھین کر لے گیا۔

علامہ کاظمی رحمۃ اللہ علیہ کی رحلت سے علم و عرفان کی وہ شمع بجھ گئی جس سے ذہنوں کے فانوس روشن اور علم کی تحقیق کی فضا منور تھی جن کی تقریر روح کو گرما دیتی جن کا درس ذہنوں کو جلا بخشتا تھا ان کی جدائی کا کرب ہر دل محسوس کر رہا ہے یہی وہ شخصیتیں ہیں جن کی وفات پر نطقِ ربانی کے لفظوں میں آسمان و زمین روتے ہیں اور ان کی وفات عربی کے اس شعر کے مصداق ہوتی ہے۔

وما كان قيس هلكه هلك واحد
ولكنه بنيان قوم تهلما

وہ غزالیِ زماں تھے، رازیِ دوراں تھے، وہ فقیہ العصر تھے، محدثِ اعظم تھے، وہ بحر العلوم تھے، وہ ایسے مردِ حق مردِ مومن تھے، جو بیک وقت مفسر بھی، محقق بھی، مناظر بھی، مبلغ بھی، مدبر بھی، پیکرِ خلوص و محبت بھی، مرشدِ کامل بھی، سچے عاشقِ رسول بھی، پروردگارِ عالم نے اتنے کمالات و فضائل علمی اور اوصاف حسنہ سے نوازا تھا جن کو احاطہ تحریر میں نہیں لایا جا سکتا، آپ ہمہ صفت ہمہ گیر شخصیت تھے۔ مجھے یہ فخر حاصل ہے کہ چند سال حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں رہ کر آپ کے فیوض و برکات سے مستفیض ہونے کا شرف حاصل رہا آپ کے اخلاق اور شفقت و محبت کا یہ عالم رہا کہ باوجود ہماری کوتاہیوں کے اور نالائقی کے حضرت کبھی ناراض نہ ہوئے۔

کراچی تا خیبر اکثر جلسوں میں آپ مدعو ہوتے علماء کرام خاص طور پر حضرت کی تقریر کیلئے تشریف فرما رہتے۔ عوام الناس اتنے مشتاق رہتے کہ حضرت کب تقریر فرمائیں گے۔ کہیں وہ حضرت کی تقریر سے محروم نہ رہ جائیں، جو الجھنیں وہ اپنے دل

میں پاتے ان کا حل حضرت کی تقریر میں ان کو مل جاتا مشکل مسئلہ کو اتنی آسانی سے حل فرمادیتے کہ محفل دنگ رہ جاتی۔ آپ کا انداز انتہائی منطقی، علمی اور اتنا آسان ہوتا کہ سمجھنے میں کوئی دقت پیش نہ آتی۔

حضرت کو مناظرہ میں بھی ید طولیٰ حاصل تھا تقسیم ہند سے قبل آریہ سماج تنظیمیں مسلمانوں کو مرتد کرنے اور عقائد اسلام میں شک وشبہ پیدا کرنے کے درپے تھیں، ان کا مشہور مناظر رام چند جس کو قرآن وحدیث پر بہت عبور تھا آیاتِ قرآنی حفظ پڑھتا تھا اور احادیث از بر تھیں، وہ اس عقیدے کا مذاق اڑاتا تھا کہ اس عالم کے بعد ایک عالم بھی ہے جو اس سے بہت بڑا ہے۔ وہ کہتا تھا کہ یہ دنیا اتنی بڑی ہے کہ اس سے بڑھ کر کسی اور عالم کے ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اس زمانے میں مناظرہ کا بہت زور تھا حضرت نے وہ عمر رسیدہ شخص تھا لوگ حیران تھے یہ نوجوان اس سے کیا مناظرہ کرے گا، حضرت نے راستہ میں گولر خرید لیے یہ ایک گول سا پھل ہوتا ہے، ہندوستان میں بکثرت پایا جاتا ہے اس کو جب دبا کر دو حصے کرتے ہیں تو اس میں سے چھوٹے مچھر کی طرح بنگے نکلتے ہیں۔

حضرت وہ گولر لے کر وقت مقررہ پر تشریف لے گئے مناظرہ شروع ہوا اس نے اعتراض کیا کہ مسلمانوں کا یہ عقیدہ غلط ہے کہ اس عالم کے بعد اور عالم بھی ہے جو اس سے بہت بڑا ہے عالمِ آخرت، عالمِ برزخ، کوئی چیز نہیں یہ دنیا سب سے بڑی ہے اس سے بڑھ کر کوئی عالم نہیں۔

حضرت قبلہ غزالیٔ زماں علیہ الرحمہ نے فرمایا، لالہ جی! میرے ہاتھ میں کیا ہے؟ رام چند نے جواب دیا گولر، آپ نے فرمایا "یہ گولہ میرے ہاتھ میں ہے میں اس کرسی پر ہوں یہ کرسی اس کمرے میں یہ کمرہ اس عمارت کا ایک حصہ ہے، یہ عمارت اس شہر کا ایک چھوٹا سا حصہ ہے اور یہ شہر ایک دنیا کا ایک حصہ ہے، آپ نے فرمایا اب سمجھو یہ گولر کتنی چھوٹی جگہ میں ہے مگر اس گولر میں جو مخلوق رہتی ہے سمجھتی ہے کہ ہم جس دنیا میں

رہتے ہیں یعنی گولر میں یہی سب سے بڑی دنیا ہے اس سے بڑھ کر کوئی دنیا نہیں آپ نے یہ کہہ کر گولہ توڑا اس کے اندر سے بنگے نکل کر اُڑ گئے، آپ نے فرمایا لالہ جی یہی کیفیت آپ کی ہے آپ بھی اس عالم کو بڑا خیال کرتے ہیں جس طرح یہ پرندے نکل کر دوسرے عالم میں آئیں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ایک عالم اور بھی ہے اور وہ اس سے بہت بڑا ہے۔

سارا ہال نعرۂ تکبیر سے گونج اُٹھا، یہ حضرت کے ابتدائی دور کا واقعہ تھا مشکل سے مشکل مسئلہ اتنی آسانی سے حل کر دینا یہ حضرت کا انداز تھا۔ حاضر جوابی، باریک بینی، نکتہ سنجی حضرت کی خصوصیت تھی۔

ایک مرتبہ مدرسہ انوار العلوم کے جلسہ کے موقع پر دن کی نشست میں حضرت محدثِ کچھوچھوی علیہ الرحمہ مدعو تھے۔ محدث صاحب موصوف نے اپنی تقریر کا آغاز کرتے ہوئے ہی بے تکلفانہ انداز میں فرمادیا کہ علامہ کاظمی صاحب (علیہ الرحمہ) نے آج مجھے معراج کے موضوع پر تقریر کرنے کا فرمادیا ہے حالانکہ معراج تو رات کو ہوئی تھی اور علامہ صاحب اس کا بیان دن کو کرارہے ہیں، حضرت علیہ الرحمہ اس وقت سٹیج پر تشریف فرما تھے۔ آپ نے محدث صاحب کی یہ بات سن کر فوراً فرمایا۔ صاحب! معراج تو رات کو ہوئی تھی، اس سے انکار نہیں مگر اس کا تذکرہ دن ہی کو ہوا تھا، محدث صاحب آپ کے برجستہ جواب سے بہت محظوظ ہوئے اور آپ کو دعائیں دیں۔ اور وہ ادباً آپ کا نام نہیں لیتے تھے بلکہ آپ کو "علامہ کاظمی صاحب" کہہ کر یاد فرماتے تھے۔"

یہ یاد رہے کہ مدرسہ انوار العلوم کے جلسے صبح سہ پہر اور رات تینوں وقت ہوتے ہیں، پھر بھی بہت سے علماء تقریر کرنے سے رہ جاتے تھے۔ حضرت علامہ کو علومِ متداولہ پر اتنا عبور تھا اور یہ اندازہ نہ ہوتا تھا کہ کسی پر اتنا عبور ہے۔ قرآن، حدیث، منطق، فلسفہ، فقہ، اصولِ فقہ، ان علوم کی کچھ نہ کچھ واقفیت تو ہر ایک کو ہوتی ہے کسی ایک پر عبور بھی ہوتا ہے لیکن ان سب پر اتنا عبور اور اس کی تدریس وہ بھی علماء کو اور وہ

بھی اس طرح کہ پڑھنے والا سننے والا مطمئن ہو جائے یہ حضرت ہی کی خصوصیت تھی۔

حضرت غزالی زماں رحمۃ اللہ علیہ دورۂ حدیث پڑھایا کرتے تھے خصوصاً بخاری شریف و مسلم و ترمذی۔ اول الذکر یعنی بخاری شریف تو حضرت ہی پڑھایا کرتے تھے، اکثر ایسا ہوتا کہ حضرت تبلیغی دورے پر رات گئے یا علی الصبح تشریف لاتے غسل فرماتے اور دار الحدیث میں تشریف لے آتے طلباء منتظر ہوتے حضرت فرماتے ہاں بھئی شروع کرو اور پھر حضرت کا درسِ حدیث تشریح، راوی کا مقام، روایت کی نوعیت، ان کا حل غرض کہ علم و عرفان کی ایک بارش ہوئی جو سیراب کرتی چلی جاتی اس دوران طلباء کی جانب سے بے شمار سوالات کیے جاتے اور حضرت تسلی بخش جوابات سے تشفی فرماتے۔ یہ حدیث اکثر پڑھی اور سنی ہے کہ حضور اکرم ﷺ تشریف لے جا رہے تھے۔ دو قبروں پر آپ ﷺ کا گزر ہوا، آپ ﷺ نے فرمایا'' ان اہلِ قبر پر عذاب ہو رہا ہے ایک غیبت کرتا تھا دوسرا پیشاب کی چھینٹوں سے نہیں بچتا تھا۔ آپ نے ایک لکڑی لی اور ان دونوں قبروں پر اس کا ایک ایک ٹکڑا رکھ دیا اور فرمایا کہ جب تک یہ ہری رہے گی عذاب میں تخفیف رہے گی۔'' اس سے بہت سے مسائل معلوم ہوئے'' مثلاً'' غیبت اور پیشاب کی چھینٹ سے نہ بچنا عذابِ الٰہی کا سبب ہے لہٰذا اس سے بچنا چاہیے کہ کسی ہری چیز کا قبر پر رکھنا عذاب میں تخفیف کا سبب ہوتا ہے۔''

اس حدیث کو جب علامہ کاظمی رحمۃ اللہ علیہ بیان کرتے ہیں تو کتنی گہرائی میں جاتے ہیں اور کتنے نکات بیان فرماتے ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

آپ نے فرمایا اس حدیث مبارکہ سے بہت سی باتیں معلوم ہوئیں۔

۱) اس سے یہ بات ثابت ہے کہ نگاہِ نبوت ﷺ عالمِ دنیا سے عالمِ برزخ کا مشاہدہ کر سکتی ہے، بلکہ کر رہی ہے، حضور ﷺ نے عذابِ قبر کو دیکھا۔

۲) جس وجہ سے عذابِ قبر ہو رہا ہے آپ اس کے سبب سے بھی واقف ہیں۔

۳) آپ ﷺ صاحبِ قبر کے کام بھی آ رہے ہیں کیونکہ آپ نے شاخ رکھی اور

ارشاد فرمایا جب تک ہری رہیں گی عذاب میں تخفیف رہے گی۔

اس سے یہ مسئلہ بھی حل ہو گیا کہ آپ عالمِ دنیا میں رہتے ہوئے عالمِ برزخ سے واقف ہیں اور اس کے کام بھی آ رہے ہیں اس طرح جب آپ عالمِ برزخ میں ہوں گے تو دنیا والوں کے کام آئیں گے۔ وہاں رہتے ہوئے یہاں سے باخبر ہوں گے اور کام آئیں گے وغیرہ وغیرہ۔ (۴۹)

ہم یہاں سے پکاریں وہاں وہ سنیں
حضور کی سماعت پہ لاکھوں سلام
(ﷺ)

حضرت علامہ کاظمی رحمۃ اللہ علیہ کا درسِ آگہی علم و عرفان کا ذریعہ ہوتا تھا۔ اکثر ایسا ہوتا حضرت درسِ حدیث سے فارغ ہوتے تو کچھ طلباء فارغ نظر آتے آپ یہ برداشت نہیں کرتے تھے کہ طلباء وقت ضائع کریں بلکہ آپ دریافت فرماتے، آپ کیوں فارغ پھر رہے ہیں؟

طلباء عرض کرتے حضرت فلاں مدرس صاحب آج تشریف نہیں لائے اس لیے فارغ ہیں۔

حضرت فرماتے کون سی کتاب ہے؟

طلباء عرض کرتے بیضاوی شریف ہے۔ حضرت ان سب کو بلا لیتے اور فرماتے کہاں سے پڑھنا ہے شروع کرو، طلباء عبارت پڑھتے اس کے بعد حضرت تقریر فرماتے قرآن پاک کے رموز و نکات صاحبِ بیضاوی کا اپنا اسلوب اور ان کے انداز پر سیر حاصل بحث فرماتے، عقل حیران ہوتی۔ ابھی یہ شخصیت حدیث پر اس انداز میں درس دے رہی تھی اندازہ ہو رہا تھا کہ اس پائے کا محدث شاذ و نادر ہو۔ اب تفسیر کے درس کی یہ کیفیت ہے کہ ایک بحرِ بیکراں ہے جو رواں دواں ہے یہ کیفیت ان دو علوم کے ساتھ ہی نہ تھی بلکہ فلسفہ، منطق، علمِ معانی، ادبِ عربی جو کتاب پڑھاتے اس کی

بلندیوں اور اس کی گہرائیوں سے اتنے واقف ہوتے شاید ہی کوئی اس مقام پر نظر آ سکے۔

عجز و انکسار:

اتنے علم و فضل کے باوجود طبیعت میں تکبر کا شائبہ تک نہ تھا، محبت، خلوص اور عجز و انکسار اتنا تھا کہ فی زمانہ کہیں نظر نہیں آتا۔ حضرت دوسروں کی عزت کر کے خوش ہوتے ہر آنے والے سے خندہ پیشانی سے پیش آتے جب رخصت کرتے تو بصد خلوص...... لباس میں سادگی گفتار میں شائستگی، رفتار میں آہستگی، دن "**قال الله قال الرسول**" میں گزرتا، راتیں اللہ اور اس کے پیارے حبیب ﷺ کے ذکر و فکر میں بیت جاتیں۔ یوں کہہ لیجئے "**والذین یبیتون لربھم سجدا وقیاما**" کی تفسیر "**یمشون علی الارض ھونا**" کا مظہر تھا۔

حقیقت یہ ہے عصرِ زمانہ کا یہ امام روشنی کا یہ مینار علم و فضل کا یہ منبع نگاہوں سے کہاں او جھل ہوا ہر طرف تاریکی، خلا ہی خلا ہے۔

وہ جن کے ہوتے ہیں خورشید آستینوں میں
انہیں کہیں سے بلا لو بڑا اندھیرا ہے



125

بسم اللہ الرحمن الرحیم

باب نمبر 13

ایصالِ ثواب

امامِ اہلسنت

از علامہ سید احمد سعید کاظمی رحمۃ اللہ علیہ

یوں گویا ہوتے ہیں

امامِ اہلسنت علامہ سید احمد سعید کاظمی رحمۃ اللہ علیہ یوں گویا ہوتے ہیں مکرم ومحترم گرامی جاہ حضرت شاہ صاحب مدظلہ العالی السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

سوال: قائد" رجب المرجب ۱۳۶۹ھ کے باب الاستفسار میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے مجیب محترم نے زیرِ ترجمہ وتفسیر آیہ کریمہ " **لیس للانسان الا ما سعٰی**" تحریر فرمایا ہے کہ" آیہ مبارکہ باعتبار اپنے مرادی معنیٰ کے دارِ آخرت سے متعلق ہے، اور مطلب یہ کہ آخرت میں انسان کو انہی نیکیوں کا ثواب ملے گا جو اس نے بذاتِ خود کی ہیں یہ نہیں ہوسکتا کہ نیکیاں کسی کی ہوں اور بدلہ دوسرے کو مل جائے، ہاں، یہ علیحدہ امر ہے کہ کوئی شخص اپنی نیکیوں کا ثواب کسی دوسرے کو ہبہ کردے اور اس کے ہبہ کرنے کی وجہ سے دوسرے کو اس کی نیکیوں کا ثواب پہنچ جائے، یعنی نیکی کرنے والے کی اجازت کے بغیر کسی کو اس کی نیکی کا ثواب نہیں پہنچ سکتا۔"

آیہ شریفہ کے متعلق باقی تصریحات جیسا کہ ظاہر ہے بالکل موجبِ اطمینان ہیں۔ لیکن اس وقت جس چیز سے اشکال کی صورت پیدا ہوکر مجبوراً چند معروضات خدمت والا میں پیش کرنے کی ضرورت لاحق ہوئی ہے وہ ایک مسلمان کا اپنی نیکیوں کا ثواب دوسرے کو ہبہ کردینے سے متعلق ہے یعنی ایک مسلمان اپنی حیات مستعار میں کوئی کام تو خود کرے اور اللہ تعالیٰ سے عرض کرے کہ میں نے جو نیک کام کیا ہے اس کا ثواب جو مجھ کو ملنا چاہیے وہ فلاں شخص کو ملے، یا کوئی مسلمان کوئی نیک کام کرے اس نیت سے اور اللہ تعالیٰ سے یہ کہہ کر کہ میں یہ کام فلاں مسلمان کی طرف سے کررہا ہوں اس لیے اس کا ثواب اسی کو ملے۔

ان دونوں طریقوں سے ایصالِ ثواب کے متعلق جو چند شبہات وتردد قلب پر وارد ہوئے ہیں چند لفظوں میں عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہوں تاکہ اگر یہ خیالات غلط فہمی پر مبنی ہوں تو اصلاح ہوجائے۔

سوال یہ ہے کہ عبادات نماز، روزہ، تلاوت، حج، زکوٰۃ، صدقات، قربانی وغیرہ

اعمالِ صالحہ سے غرض نفس کو پاک کرنا ہے یا نہیں؟ کیونکہ آخرت کی کامیابی نفس کی پاکیزگی پر موقوف ہے" **قد افلح من تزکّٰی**" اور امرِ الٰہیہ کی بجا آوری اور نواہی سے بچنا سن بلوغ سے مرتے دم تک ہر مسلمان کیلئے حتی الواسع لازمی چیز ہے۔

اب جو مسلمان اپنی مدتِ عمر میں اپنے صحیح عقائد کے ساتھ اگر نیک عمل کرتا رہا اور دنیا سے با ایما اُٹھا" **الاعتبار بالخوتیم**" تو یا تو وہ مقربوں سے ہے، یعنی" **السابقون الاولون من المهاجرين والابصار والذين اتبعوهم باحسان**" میں ہے اور" **رضی الله عنهم ورضوعنه**" والی جماعت میں شامل ہے یا اصحاب الیمین میں ہے یعنی" **واٰخرون اعترفوا بذنوبهم خلطو عملا صالحا واٰخر سيئا**" تو ان کیلئے بھی وعدۂ الٰہی ہے کہ" **عسى الله ان يتوب عليهم ان الله غفور رحيم**" اہل جنت اور نیکوکار لوگوں کی یہی تقسیم ہے۔ اس کے ساتھ قرآن حکیم کی تعلیم یہ بھی ہے کہ" **وان ليس للانسان الا مع سعٰى**" (النجم، ۳۹) اور" **من عمل صالحا فلنفسه**" (الحم السجدہ، ۴۶) اور" **كل امرئی بما كسب رهين**" (الطور، ۲۱) ان تین آیتوں سے تین باتیں صاف ثابت ہورہی ہیں۔

۱) انسان کا حق اپنی ہی کوشش اور عمل پر ہے دوسرے کی کوشش اور عمل پر نہیں۔

۲) جو شخص بھی نیک عمل کرتا ہے اس کا نفع اسی کرنے والے کو حاصل ہوسکتا ہے، کسی دوسرے کو نہیں۔

۳) ہر شخص اپنے کسب وعمل میں رہن ہے۔

نتیجہ یہ نکلا کہ ہماری نماز ہمیں برائی اور بے حیائی سے روک سکتی ہے ہمارے روزے ہم ہی میں تقویٰ پیدا کرسکتے ہیں، اور ہماری تلاوتِ قرآن ہمارے ہی دل کو اللہ کی یاد کی طرف لگا کر ہمارے ہی ایمان میں زیادتی پیدا کرسکتی ہے اسی طرح دیگر نیک عمل جو ہم کرتے ہیں اس سے ہمارا ہی تزکیۂ نفس ہوتا ہے جو ہم کو رضا ورحمتِ الٰہی

کے قریب لے جا کر مستحقِ فلاح ونجات ٹھہراتا ہے۔

غرضیکہ نفس کا پاک ہونا عبادت کے صحیح ہونے پر موقوف ہے اور عبادت کا صحیح ہونا نفس کے پاک ہونے کے بغیر معتبر نہیں کہا جاتا ہے کہ کتنے لوگوں کی نمازیں اور روزے قیامت میں ان کے منہ پر پھینک دیے جائیں گے یعنی قبول نہ ہوں گے۔ کیونکہ ان کے اثر سے نفس کو پاکیزگی حاصل نہیں ہوئی تھی۔ جو اصل مقصد تھا اور ان کے سب عمل دکھاوے کے تھے۔ (فالعیاذ باللہ)

اب اگر ہم یہ چاہیں کہ برائی یا بے حیائی سے رُک کر جو پاکیزگی ہم میں پیدا ہوئی ہے، یا جو تقویٰ ہم میں آ گیا ہے، خدا کا خوف یا ایمان کی زیادتی جو ہم کو حاصل ہوئی ہے، ان چیزوں کو کسی دوسرے کی طرف کسی طرح پہنچا دیں تو یہ دعائے محال ہے اور ناممکن بات کی دعا بالکل منع ہے۔ خصوصاً جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا دیا کہ انسان کا حق اپنی ہی کوشش وعمل پر ہے اور جو شخص بھی کوئی نیک عمل کرتا ہے اس کا نفع اسی کو حاصل ہوتا ہے۔ دوسرے کو نہیں اور یہ کہ ہر شخص اپنی کمائی میں گرہ ہے اللہ تعالیٰ ہی اپنے بیان کردہ قرآنی اصول کے مطابق اس گروہ کو توڑ سکتا ہے کوئی شخص بطور خود ایسے طریقے سے جو اللہ تعالیٰ نے نہیں بتایا اسکو نہیں توڑ سکتا۔ قرآن پاک میں جس طرح عام مرے ہوئے مسلمانوں کیلئے دعائے مغفرت کی تعلیم فرمائی گئی ہے کیا اسی طرح اپنی نیکیوں کا ثواب ہبہ کر دینے کی تعلیم موجود ہے۔ عام مسلمانوں کو تو کم از کم عزیز رشتہ داروں اور والدین کیلئے ثواب پہنچانے کا حکم ہے؟ دعائے رحمت ومغفرت جو بارگاہِ الٰہی میں ایک سفارش ہے اسمیں اور اجر وثواب منتقل یا ہبہ کرنے میں کوئی فرق ہے؟

براہِ کرم اس مسئلہ میں ہماری راہنمائی فرمایئے اگر استدلال قرآن حکیم کی روشنی میں ہو تو اصولی طور پر زیادہ اطمینان کا باعث ہوگا" **بینوا وتوجرو رحکم اللہ تعالیٰ**" قائد چند ماہ سے باقاعدہ نظرِ مطالعہ سے گزر رہا ہے۔ دعا ہے کہ اس کی پرخلوص خدماتِ ملک وملت کیلئے مفید ثابت ہوں اور قائد اپنے نیک مقاصد میں

کامیاب ہو۔

غریضہ زیر نظر ایک استفتاء ہے۔ بہتر یہی ہوگا کہ "قائد" کی تازہ اشاعت میں اسے باب الاستفسار میں جگہ دے کر جواب سے سرفراز فرمائیں۔ **(فجزا کم اللہ تعالیٰ احسن الجزا)**

مخلص:

احقر العباد العبد الراجی الیٰ رحمۃ اللہ محبوب احمد عافاہ مولاہ وارضاہ۔

جواب: از سید احمد سعید کاظمی امروہوی (مدیر مسئول)

آپ کا گرامی نامہ دیر سے پہنچا۔ شعبان کا پرچہ مکمل ومرتب ہو کر کاتب کے پاس پہنچ چکا تھا اور اس میں گنجائش باقی نہ تھی اس لیے آئندہ اشاعت پر ملتوی کر دیا گیا۔ امید ہے آپ زحمتِ انتظار فرمائیں گے۔

آپ کے سوال کا منشا اور مبنی یہ ہے کہ ہر عبادت تقویٰ، طہارت اور تمام نیکیوں کا ثواب اور ان کے نتائج واثرات اسی شخص کیلئے مخصوص ہیں جو ان کا عامل یعنی کرنے والا غیر عامل کیلئے بغیر کچھ کیے کسی نیکی کا ثواب یا اسکے فوائد کا حصول کسی طرح ممکن نہیں اس دعوے کے ثبوت میں آپ نے تین آیتیں لکھی ہیں" **وان لیس للانسان الا ما سعٰی**" اور" **من عمل صالحا فلنفسه**" اور" **کل امرئی بماکسب رهین**" آپ نے لکھا ہے ان تین آیتوں سے تین باتیں صاف ثابت ہو رہی ہیں۔

۱) انسان کا حق اپنی ہی کوشش اور عمل پر ہے دوسرے کی کوشش اور عمل پر نہیں۔

۲) جو شخص بھی نیک عمل کرتا ہے اس کا نفع اسی کرنے والے کو حاصل ہو سکتا ہے کسی دوسرے کو نہیں۔

۳) ہر شخص اپنے کسب وعمل میں رہین ہے۔

نتیجہ یہ نکلا کہ کسی کی نیکی اور کوشش دوسرے کو فائدہ نہیں پہنچا سکتی (اس لیے

ایصالِ ثواب بھی ممکن نہیں) میں عرض کروں گا کہ ان آیتوں سے جو نتیجہ آیات بینات اور بے شمار احادیثِ صحیحہ کے خلاف ہے ملاحظہ فرمائیے۔

آیت نمبر (1) **"من ذالذی یشفع عندہ الا باذنہ"**

(پ۳، البقرہ، ع۳۴)

ترجمہ "وہ کون ہے جو بارگاہِ ایزدی میں اس کے اذن کے بغیر شفاعت کرے" معلوم ہوا کہ اذن والے شفاعت کریں گے اور وہ انبیاء علیہم السلام، ملائکہ کرام اور مؤمنین عظام ہیں ظاہر ہے کہ شفاعت بھی ایک عمل ہے اور شفاعت کے ذریعے ان لوگوں کو فائدہ بھی ضرور پہنچے گا جن کے حق میں شفاعت ہوگی ورنہ شفاعت لغو اور بے سود قرار پائے گی (نعوذ باللہ) اس آیت سے ثابت ہوگیا کہ عالمِ آخرت میں ایک کے عمل سے دوسرے کو ضرور نفع پہنچے گا۔

آیت نمبر (2) **"ومن الاعراب من یومن باللہ والیوم الاخر ویتخذ ماینفق قربت عنداللہ وصلواۃ الرسول الانھا قربۃ لھم فی دخلھم اللہ فی رحمتہ ان اللہ غفور رحیم"**

(پ۱۱، التوبہ، ع۱۲)

ترجمہ "کچھ گاؤں والے جو اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں، اور جو کچھ خرچ کرتے ہیں اسے اللہ کی نزدیکیوں اور رسول ﷺ سے دعائیں لینے کا ذریعہ سمجھتے ہیں خبردار ہو جاؤ وہ ان کیلئے باعثِ قرب ہے اور اللہ جلد انہیں اپنی رحمت میں داخل کرے گا بے شک اللہ بخشنے والا بے حد حکم فرمانے والا ہے" "اعراب" جو کچھ خرچ کرتے تھے اسے اللہ تعالیٰ کی نزدیکیوں اور رسول ﷺ سے دعائیں لینے کا ذریعہ بناتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے فعل کو مقامِ مدح میں بیان فرما کر اس کے جواز پر نص فرمائی ہر شخص جانتا ہے کہ دعائیں بھی عمل ہیں۔ اور اگر وہ دعائیں ان کے حق میں مفید نہ ہوتیں تو ان

کو حاصل کرنے کیلئے ذریعہ تلاش کرنا عبث تھا۔ اور فعل لغو اور عبث مدح کے قابل نہیں حالانکہ اللہ تعالیٰ اسکی مدح و ستائش فرما رہا ہے معلوم ہوا کہ وہ لغو و عبث نہیں بلکہ مفید ہے لہٰذا ثابت ہوا کہ ایک کا عمل دوسرے کو فائدہ پہنچا سکتا ہے۔

آیت نمبر (3) **"وصل علیھم ان صلوتك سکن لھم"**

(پ۱۱، التوبہ، ع۱۳)

ترجمہ "پیارے حبیب (ﷺ) ان کیلئے دعائے خیر فرمائیے بے شک آپ کی دعا ان کیلئے سکون ہے۔"

اگر ایک کا عمل دوسرے کیلئے مفید نہ ہو سکے تو حضور ﷺ کی دعائے مبارک آپ کے غلاموں کے حق میں مطلقاً سکون و اطمینان کا موجب کیونکر ہو سکتی ہیں؟

آیت نمبر (4) **"ربنا اغفرلی ولوالدی وللمومنین یوم یقوم الحساب"**

(پ۱۳، الابراہیم، ع۶)

ترجمہ "اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا نقل فرمائی ابراہیم علیہ السلام بارگاہِ صمدی میں عرض کرتے ہیں اے اللہ میرے اور میرے والدین کی اور ایمان والوں کی مغفرت فرما جس دن حساب قائم ہو"

دعا عمل ہے اور ظاہر ہے کہ مومنین کے حق میں دعائے مغفرت خصوصاً حضراتِ انبیاء علیہم السلام کی ضرور مقبول ہے اور اس دعا کے مقبول ہونے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ مومنین کی مغفرت ہو اس دعا سے انہیں فائدہ پہنچے۔ ثابت ہوا کہ ایک کا عمل دوسرے کو فائدہ پہنچا سکتا ہے۔

آیت نمبر (6) **"وکان تحتہ کنزلھما وکان ابوھما صالحا"**

(پ۱۶، الکہف، ع۱۰)

ترجمہ "اور دیوار کے نیچے ان (دونوں یتیم بچوں) کا خزانہ تھا اور ان کا باپ مردِ صالح

تھا۔" حضرت خضر علیہ السلام کا دو یتیم بچوں کا خزانہ کی حفاظت کیلئے دیوار کو سیدھا کرنا ان کے باپ کے صالح ہونے کی وجہ سے تھا، ورنہ جملہ" **وکان ابوھما صالحا**" بالکل بے معنیٰ ہو کر رہ جائے گا۔ (العیاذ باللہ) معلوم ہوا کہ ایک کے اعمالِ صالحہ دوسرے کے حق میں مفید ہو سکتے ہیں اسی واسطے حضرت محمد بن مکندر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اولاد کو اور اس کے کنبہ والوں کو اور اس کے محلّہ داروں کو اپنی حفاظت میں رکھتا ہے۔

آیت نمبر(**6**) "**الذین یحملون العرش ومن حوله یسبحون بحمد ربهم ویومنون به ویستغفرون للذین اٰمنوا**"

(پ۲۴، المومن، ع۱)

ترجمہ" وہ (فرشتے) جو عرش اُٹھائے ہیں اور جو اس کے آس پاس ہیں اپنے رب کی تعریف کے ساتھ اس کی پاکی بولتے ہیں اور اس پر ایمان لائے اور مسلمانوں کی مغفرت مانگتے ہیں۔"

فرشتے معصوم ہیں وہ جو کچھ کرتے ہیں امرِ الٰہی سے کرتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کے متعلق فرماتا ہے" ویفعلون مایومرون" یعنی فرشتے وہ کام کرتے ہیں جس کا انہیں حکم دیا جاتا ہے معلوم ہوا کہ امرِ الٰہی سے وہ مومنین کیلئے دعائے مغفرت کرتے ہیں۔ دعا فرشتوں کا عمل اور ایمان والوں میں یقیناً مفید ہے ثابت ہوا کہ ایک کا عمل دوسرے کیلئے مفید ثابت ہو سکتا ہے۔

آیت نمبر(**7**) "**والذین جاؤا من بعدهم یقولون ربنا اغفر لنا ولا خواننا الذین سبقونا بالایمان**"

(پ۲۸، الحشر، ع۱)

ترجمہ" وہ لوگ جو ان کے بعد آئے کہتے ہیں اے رب ہمیں بخش دے اور ہمارے بھائیوں کو جو ہم سے پہلے ایمان لائے۔"

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے مہاجرین وانصار کے بعد آنے والے مومن داخل ہیں۔ ان سب کی دعائیں اپنے سے پہلے مسلمانوں کے حق میں وارد ہیں اور وہ ان کیلئے یقیناً مفید ہیں یہ بات بار ہا بتائی جا چکی ہے کہ دعا بھی عمل ہے لہٰذا اس آیہ مبارکہ سے بھی روزِ روشن کی طرح واضح ہو گیا ہے کہ ایک کا عمل دوسرے کو فائدہ پہنچا سکتا ہے۔

بخوفِ طوالت صرف سات آیتوں پر اکتفا کرتا ہوں ورنہ قرآن مجید میں اور آیتیں بھی اس مضمون پر بکثرت موجود ہیں۔

عملِ غیر سے فائدہ پہنچنے کے ثبوت میں حدیثیں بھی تحریر کرتا ہوں تا کہ مسئلہ اچھی طرح واضح ہو جائے۔

حدیث نمبر(1) "**عن عائشه قالت ان رجلا قال للنبی ﷺ ان امی افتلت نفسها واظنها لو تکلمت تصدقت فهل لها اجر ان تصدقت عنها قال نعم**"

(متفق علیہ)

ترجمہ" حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ایک شخص نے حضور ﷺ سے عرض کیا حضور میری والدہ کا انتقال اچانک ہو گیا میرا گمان ہے کہ اگر وہ بولتی تو صدقہ کرتی، تو کیا اس کیلئے اجر ہے اگر میں اس کی طرف سے صدقہ کر دوں؟ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا ہاں، یہ حدیث بخاری و مسلم کی متفق علیہ ہے۔"

مطلب واضح کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ مضمون حدیثِ اثباتِ مدعا میں آفتاب سے زیادہ روشن ہے۔

حدیث نمبر(**2**) "**عن عائشه ان رسول الله ﷺ قال یا عائشه هلمی المدیة ثم قال اشحذیها بحجر ففعلت ثم اخذها واخذ الکمبش فاضجعه ثم ذبحه ثم قال بسم الله اللهم**

تقبل من محمد وآل محمد ومن امة محمد ثم ضحی به رواه مسلم"

ترجمہ" حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے عائشہ! چھری لاؤ پھر فرمایا کہ اسے پتھر سے تیز کرو میں نے ایسا ہی کیا، پھر حضور ﷺ نے چھری لی اور مینڈھے کو پکڑ کے لٹایا پھر اسے ذبح فرمایا اور فرمایا" **بسم الله اللهم تقبل من محمد و آل محمد ومن امة محمد"** اللہ کے نام سے ذبح کرتا ہوں اے اللہ محمد (ﷺ) اور آلِ محمد وامۃ محمد (ﷺ) کی طرف سے قبول کر۔ اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے۔"

اگر ہر شخص اپنے ہی عمل کی جزا میں...... مقید ہے اور کسی کو کسی کے نیک عمل سے کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا تو حضور اکرم ﷺ نے اپنی قربانی کے متعلق یہ کیوں فرمایا کہ اے اللہ قبول کر محمد ﷺ اور آلِ محمد وامۃ محمد (ﷺ) کی طرف سے۔

حدیث نمبر (3) **" وفی روایة احمد وابی داؤد الترمذی اللهم هذا عنی ومن لم یضح من امتی"**

ترجمہ" امام محمد، ابوداؤد اور ترمذی کی ایک روایت میں ہے کہ اے اللہ یہ قربانی میری طرف سے ہے، اور میری امت کے ان لوگوں کی طرف سے جنھوں نے قربانی نہیں کی۔

حدیث نمبر (4) **" عن ابن عباس ان رجلا قال لرسول الله ﷺ ان مه توفیت اینفعها ان تصدقت عنها قال نعم رواه البخاری"**

ترجمہ" حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ! میری ماں فوت ہوگئی اگر میں اس کی طرف سے صدقہ کروں تو کیا وہ اس کو نفع دے گا؟ سرکارِ دو عالم ﷺ نے فرمایا، ہاں نفع دے گا۔" اس

حدیث کو بخاری نے روایت کیا ہے۔

معلوم ہوا کہ ایک مسلمان کی نیکی کا ثواب دوسرے مسلمان کو پہنچتا ہے اور مسلمانوں کیلئے جائز ہے کہ وہ اپنے مردوں کو ثواب پہنچائیں۔

حدیث نمبر (5) **" عن عثمان قال کان النبی ﷺ اذا فرغ من دفن المیت وقف علیه فقال استغفرو الاخیکم ثم سلو اله التثبت فانه الان سئل رواه ابو داؤد"**

ترجمہ" حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب دفنِ میت سے فارغ ہوتے تو ٹھہر جاتے اور صحابہ کرام سے فرماتے اپنے بھائی کیلئے طلبِ مغفرت کرو پھر اس کیلئے ثابت قدم رہنے کی دعا کرو کیونکہ ابھی اس سے سوال کیا جائے گا۔"

اس حدیث کو ابوداؤد نے روایت کیا۔

اگر کسی مسلمان کو کسی دوسرے مسلمان کے عمل سے کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا تو رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام کو میت کیلئے استغفار اور دعا کا حکم کیوں دیا؟

حدیث نمبر (6) **" روی الدار قطنی ان رجلا ساله علیه الصلوٰة والسلام فقال کان لی ابون ابرهما حال حیا تهما فکیف ابرابهما بعد موتها فقال ﷺ ان من البر بعد الموت ان تصلی لهما مع صلوتك وان تصوم لهما مع صومك"**

ترجمہ" دارقطنی نے روایت کی ہے کہ حضور ﷺ نے ایک شخص سے حال دریافت فرمایا تو اس نے کہا کہ حضور میرے والدین تھے میں ان کی زندگی میں ان کے ساتھ نیکی کیا کرتا تھا، اب ان کے مرنے کے بعد کس طرح ان کے ساتھ نیکی کروں؟ سرکار ﷺ نے ارشاد فرمایا" موت کے بعد نیکی یہ ہے کہ اپنی نماز کے ساتھ ان کیلئے نماز پڑھ اور اپنے روزے کے ساتھ ان کیلئے روزہ رکھ۔ یہ حدیث دارقطنی کی ہے۔ (شامی ج ۲

ص ۳۲ سے نقل کی گئی)''

حدیث نمبر(**7**) **'' عن انس قال یا رسول الله ﷺ ان نتصدق عن موتانا ونحج عنهم وندعو الهم فهل یصل ذالك لهم قال نعم انه لیصل الیهم وانهم لیفرحون به کما یفرح احدکم بالطبق اذا هدی الیه رواه ابو حفص العکبری''**

ترجمہ'' حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انھوں نے بارگاہِ رسالت میں عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ ہم اپنے مردوں کی طرف سے خیرات کرتے ہیں اوران کی طرف سے حج کرتے ہیں اوران کیلئے دعائیں مانگتے ہیں حضور، کیا یہ سب کچھ انہیں پہنچتا ہے؟ سرکار ﷺ نے فرمایا ہاں بے شک وہ انہیں ضرور پہنچتا ہے، اور وہ اس کے ساتھ اسی طرح خوش ہوتے ہیں جیسے تمہاری طرف جب کوئی طبق ہدیہ کیا جائے اورتم اس سے خوش ہوتے ہو۔'' اس حدیث کوابوحفص العکبری نے روایت کیا اریہ شامی جلد۲، صفحہ ۳۲۵ سے نقل کی گئی۔

ہمارے دعوے پر بکثرت دلائل موجود ہیں مگر بخوفِ طوالت صرف سات حدیثوں پر اکتفا کیا گیا، اس سلسلہ میں ایک یہ بات بھی عرض کردوں کہ اگر یہ نظریہ درست تسلیم کر لیا جائے کہ ایک کے عمل سے دوسرے کو فائدہ نہیں پہنچ سکتا اور کسی کی نیکی سے کسی دوسرے کو نفع حاصل نہیں ہوسکتا تو مسلمانوں کے وہ ناسمجھ اور شیر خوار بچے جو بچپن میں فوت ہوجاتے ہیں ان میں سے ایک بھی جنت میں نہیں جاسکتا، کیونکہ نہ وہ ایمان لائے نہ انھوں نے نیک عمل کیے اگر کہا جائے کہ انھوں نے گناہ نہیں کیے اس لیے وہ جنتی قرار پائے، تو میں عرض کروں گا کہ کفار ومشرکین کے بچوں نے بھی گناہ نہیں کیے لہٰذا ان پر بھی اسلام کے احکام جاری ہونے چاہییں مگر ایسا نہیں معلوم ہوا کہ مسلمانوں کے بچوں پر جو بچپن میں فوت ہوجاتے ہیں احکامِ اسلام کا جاری ہونا اوران

کا جنت میں جانا ان کے والدین یا دونوں میں سے ایک کے ایمان واسلام کی وجہ سے ہے، ثابت ہوا کہ ایک کی نیکی دوسرے کیلئے مفید ہے۔ آپ دریافت فرماتے ہیں کہ دعائے مغفرت اور ایصالِ ثواب میں کچھ فرق تو ظاہر ہے کہ دعائے مغفرت میں صرف دعا ہے اور ایصالِ ثواب میں دعا کے ساتھ ثواب بھی۔ لیکن اصولی طور پر کوئی فرق نہیں اور اصل مسئلہ پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا، کیونکہ آیہ کریمہ **'' ان لیس للانسان الا ماسعٰی ''** سے آپ نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ ہر شخص کیلئے اسی کی کوشش اور نیکی کا فائدہ ہے، دوسرے کی کوشش اور عمل کا فائدہ کسی کو نہیں پہنچ سکتا۔

اب غور فرمائیے کہ ایک مسلمان کی دعائے مغفرت دوسرے مسلمان کے حق میں جو ہوتی ہے وہ کس کی کوشش اور کس کا عمل ہے ظاہر ہے کہ '' دعا '' کو دعا کرنے والے ہی کا عمل اور اسی کی کوشش کہا جاسکتا ہے جب اس کا فائدہ دوسرے کو پہنچا تو آپ کا نتیجہ غلط ہوا یا نہیں؟

پھر آپ فرماتے ہیں کہ قرآن مجید میں ایصالِ ثواب کا حکم ہے یا نہیں؟ جواباً عرض ہے کہ ایصالِ ثواب کی حقیقت یہ کہ ایک مسلمان دوسرے کو اپنی نیکی اور اپنے عمل سے فائدہ پہنچاتا ہے اور یہ بات قرآن مجید سے ہم ثابت کرچکے ہیں اس سے معلوم ہوا کہ ایصالِ ثواب کی اصل تو قرآن مجید میں موجود ہے، رہا یہ امر کہ ایصالِ ثواب کا تفصیلی بیان قرآن مجید میں نہیں ہے، تو اس کے متعلق میں عرض کروں گا کہ قرآن مجید میں نماز کا تفصیلی بیان موجود نہیں، حالانکہ نماز افضل العبادات اور عماد الدین ہے،'' خمس صلوٰۃ'' کا لفظ قرآن میں کہیں نہیں آیا اوقاتِ صلوٰۃ کی مکمل تفصیل وارد نہیں ہوئی، تعدادِ رکعات کا کوئی ذکر قرآن مجید میں موجود نہیں بے شمار مسائل دین کی توضیع وتشریح تمام تفصیل کے ساتھ کتاب اللہ میں نہیں پائی جاتی لیکن اس کا مطلب نہیں کہ جس مسئلہ کی تفصیل قرآن مجید میں نہ ہو وہ غلط ہے اگر تمام تفصیلات قرآن پاک میں ہوتیں تو سنتِ نبوی اور احادیثِ مبارکہ کی کیا ضرورت تھی؟ اس میں شک نہیں کہ دینِ متین

تمام قرآن مجید میں ہے قرآن کریم ایسی جامع اور کامل کتاب ہے، جس میں ذرہ بھر کسی بات کی کمی نہیں پھر وہ تمام علومِ قرآنیہ نگاہِ رسالت کے سامنے تفصیلاً موجود ہیں لیکن ہم بیان اور وضاحت کے محتاج ہیں۔

آپ نے فرمایا کہ ہماری نماز ہماری عبادت ہمارا تقویٰ اور ہماری طہارت ہمیں فائدہ پہنچاتے ہیں ہماری نیکیوں سے ہمارے ہی نفس کا تزکیہ ہوتا ہے ایسا نہیں ہوسکتا کہ ہماری عبادت اور نیکیوں سے دوسروں کا تزکیۂ قلب ہوجائے۔

اس کے متعلق عرض ہے کہ تزکیۂ نفس اور چیز ہے اور ثوابِ اخروی دوسری چیز ہے، دیکھئے قرآن مجید میں لیلۃ القدر کی فضیلت رب تعالیٰ نے بیان فرمائی "**لیلة القدر خیر من الف شهر**" تمام امت کا اس پر اجماع ہے کہ لیلۃ القدر میں عبادت کرنے سے ایک ہزار مہینوں کی عبادت سے زیادہ ثواب ملتا ہے اب آپ خود غور فرمائیے کہ ایک رات کی عبادت سے تزکیۂ نفس زیادہ ہوگا یا ہزار ماہ کی عبادت سے؟...... اگر ہزار ماہ کی عبادت سے تزکیۂ نفس زیادہ ہوگا تو پھر ایک رات کا ثواب اس سے بڑھ کر کیسے ہے؟

مسجدِ حرام میں ایک نماز کا ثواب ایک لاکھ نمازوں کے برابر ہے، ظاہر ہے کہ جو تزکیہ ایک لاکھ نمازوں سے ہوگا وہ ایک نماز سے نہیں ہوگا، لیکن اس ایک نماز کا ثواب ایک لاکھ نمازوں جتنا ہونے میں خود آپ کو بھی شبہ نہ ہوگا، اسی قسم کی دیگر بے شمار مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں اور ان کے بیان کا مفاد دراصل یہ بتانا ہے کہ ثواب اور تزکیۂ نفس دو مختلف چیزیں ہیں آپ کے اعتراض یا شبہ کی بنیاد یہ مغالطہ بنا کہ آپ نے ثواب اور تزکیہ کو لازم وملزوم یا مترادفات میں تصور کیا، اگر ہماری عبادت کسی دوسرے کا تزکیۂ نفس نہیں ہوتا تو اس سے یہ کب لازم آیا کہ ہماری نیکیوں کا فائدہ بھی کسی کو نہیں پہنچ سکتا۔

اب اگر ان آیات پر کلام کرتا ہوں جن کی وجہ سے آپ کو یہ شکوک وشبہات پیدا

ہوئے، اور اس سے پہلے ایک مختصری تمہید پیش کرتا ہوں جس کو غور سے پڑھنے کے بعد آیات کے مطالب اچھی طرح واضح ہوجائیں۔

عقلِ سلیم کے نزدیک شہنشاہ عادل وحکیم کی شان یہ ہونی چاہیے کہ وہ حق دار کے حق کو تلف ہونے سے بچائے اور غیر مستحق کو اس بات کا موقع نہ دے کہ وہ کسی کے حق پر دست درازی کر سکے، نیز یہ کہ جس شخص نے کوئی جرم کیا ہے، اس کی سزا اسی کو دے اور اس بات کا پورا لحاظ رکھے کہ کسی جرم کی پاداش میں کوئی بے گناہ نہ پکڑا جائے۔ جس بادشاہ کی یہ شان نہیں اس کی سلطنت کا نظام کبھی درست نہیں رہ سکتا اگر لوگوں کی حق تلفی شروع ہوجائے اور بے گناہوں کو سزائیں ہونے لگیں تو ملک میں شدید بے چینی اور بد نظمی پیدا ہوجائے اور ایک آن کیلئے امن وسکون باقی نہ رہے، مثلاً سرکاری کاموں کی انجام دہی کے صلہ میں جو تنخواہیں خزانۂ عامرہ سے دی جاتی ہیں شاہی قانون کے مطابق ان کے حق دار وہی لوگ ہیں جنھوں نے وہ کام کیے ہوں جن لوگوں نے وہ کام نہیں کیے انہیں کوئی حق نہیں کہ خزانۂ عامرہ سے کام کرنے والوں کی تنخواہیں برآمد کرا کے خود برد کرلیں اور کام کرنے والے حق دار منہ تکتے رہ جائیں، اسی حقیقت کو واضح کرنے کیلئے اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے "**لیس للانسان الا ماسعٰی**"، نہیں ہے انسان کیلئے مگر وہ جو اس نے کوشش کی" مطلب یہ ہے کہ جو لوگ صلہ اور انعام کے بھی حق دار نہیں۔

نیز ارشاد فرمایا کہ "**من عمل صالحا فلنفسه**" جس نے کوئی نیک کام کیا وہ اس کی ذات کیلئے ہے یہ نہیں ہوسکتا کہ اس کی کارکردگی کا صلہ دوسرے لیے اُڑیں لیکن یاد رہے کہ حق دار اپنا حق اپنی خوشی سے کسی کے نام منتقل کردے تو یہ قانون اس کو ایسا کرنے سے ہرگز نہیں روکتا اگر کوئی سرکاری ملازم اپنی تنخواہ اپنی خوشی سے اپنے کسی رشتہ دار یا دوست کے نام منتقل کردے تو اس قانون کی رو سے اس کیلئے کوئی رکاوٹ نہیں فرق اتنا ہے کہ وہ ملازم اپنی تنخواہ خود وصول کرے تو وہ اس کا حق قرار

پائے گی اور اس کی اجازت سے اس کا رشتہ دار یا دوست وصول کرے گا تو اس کیلئے ایک قسم کا ہدیہ یا تحفہ ہوگا۔ ان دنوں آیتوں سے امرِ اول کی وضاحت ہوگئی اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے امرِ دوم کو واضح فرمانے کیلئے ارشاد فرمایا ’’**ولاتزر وازرة وزر اخریٰ**‘‘ کوئی شخص کسی دوسرے کا بوجھ نہ اٹھائے گا یعنی کسی کے جرم میں کسی اور کو نہیں پکڑا جائے گا بلکہ ہر مجرم اپنے جرم کی سزا خود بھگتے گا۔ نیز فرمایا ’’**ومن اسا فعلیھا**‘‘ اور جس نے کوئی برائی کی تو وہ اسی پر ہے یعنی اس کی برائی کی سزا اسی کو ملے گی دوسرے سے اس کا کوئی تعلق نہ ہوگا۔ شاید یہاں یہ شبہ پیدا ہو جائے کہ جب اپنی نیکی کے بدلے کو دوسرے کی طرف منتقل کرنا اس قانون کے خلاف نہیں تو پھر اپنی بدی کی بدلے کا دوسرے کی طرف منتقل کرنا بھی خلافِ قانون نہ ہونا چاہیے تو اس کا جواب یہ ہے کہ بادشاہ عادل وحکیم کا قانون عدل وحکمت کے عین مطابق ہے کسی پر احسان کرنا چونکہ عدل وحکمت کے عین مطابق ہے، اس لیے اپنی نیکی کا ثواب کسی کو پہنچانا قانونِ ایزدی کے موافق ہے اور اپنی کی ہوئی برائی کا بدلہ دوسرے کو دلوانا عدل وحکمت کے سخت خلاف ہے اس لیے قادرِ مطلق عادل وحکیم جل مجدہٗ کے قانون میں اس کیلئے کوئی گنجائش نہیں اس تمہید اور تشریح وتوضیح آیات سے غالباً آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ ایک مسلمان کو دوسرے کی نیکی سے فائدہ پہنچنا آپ کی مرقومہ آیات کے خلاف نہیں، مزید تفصیل کیلئے عرض ہے کہ جب قرآن کریم کی متعدد آیات واحادیثِ صحیحہ سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی کہ ایک مسلمان کی نیکی کا نفع دوسرے مسلمان کو پہنچتا ہے تو اب اگر آپ کی مرقومہ آیات کا مطلب یہی لیا جائے کہ کسی کی نیکی کا فائدہ دوسرے کو نہیں پہنچ سکتا تو اس صورت میں قرآن وحدیث بھی آپس میں متخالف ہو جائیں گے اور خود قرآن کی آیتیں بھی دوسری آیتوں سے متعارض ہو جائیں گی اور قرآن کے درمیان تعارض ہونا محال ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ آپ کی مرقومہ آیتوں کا مطلب یہ بیان کیا جائے کہ کسی کی نیکیوں کا ثواب اس کی اجازت اور رضامندی کے بغیر کسی دوسرے کو نہیں

مل سکتا ہاں البتہ اگر وہ اپنی خوشی سے اپنی نیکی کا ثواب کسی کو منتقل کرنا چاہے تو ہو سکتا ہے جیسا کہ قرآن مجید کی دوسری آیاتِ بینات اور احادیثِ صحیحہ سے ثابت ہے۔

اس تقریر سے آیاتِ قرآنیہ اور کتاب وسنت کے درمیان تطابق بھی ہو جاتا ہے اور کسی قسم کا کوئی محظورِ شرعی بھی لازم نہیں آتا۔

آیہ کریمہ ’’**ان لیس للانسان الا ماسعٰی**‘‘ کے متعلق یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اس آیہ میں قانونِ عدل بیان کیا گیا ہے یعنی دل کا تقاضہ تو یہی ہے کہ انسان کو اس کی سعی سے زائد کچھ نہ ملے لیکن بمقتضائے رحم ہم نے اس کو اس کی سعی سے زائد بھی عطا فرمایا جیسا کہ ارشاد فرمایا ’’**بالحسنة فله عشر امثالها**‘‘ جس نے کوئی نیکی کی تو اس کیلئے اس کی مثل دس نیکیاں ہیں اب دیکھئے کرنے والے نے تو صرف ایک نیکی کی تھی آیہ کریمہ ’’**لیس للانسان الا ماسعٰی**‘‘ کے مطابق اسے صرف ایک نیکی کا ثواب ملنا چاہیے تھا کیونکہ ایک ہی نیکی اسکی سعی میں داخل ہے اس سے زائد اس کی سعی نہیں لیکن ثواب دس نیکیوں کا مل رہا ہے معلوم ہوا کہ ایک نیکی کرنے والے کو ایک نیکی کا ثواب عدل ہے اور دس نیکیوں کا ثواب رحم وفضل ہے اور عدل، رحم کے منافی نہیں اس لیے انسان کو اس کی سعی سے زائد ملنا، آیہ کریمہ ’’**لیس للا انسان الا ماسعی**‘‘ کے معارض نہیں، اب رہی آپ کی تیسری آیت ’’**کل امرئی بما کسب رھین**‘‘ سو یہ آپ کے نظریہ کی تائید سے بہت دور ہے آپ نے آیت کریمہ کا مطلب یہ سمجھا ہے کہ ہر شخص اپنے عمل میں گرو ہونے کی وجہ سے اپنے کسی عمل کا ثواب کسی کی طرف منتقل نہیں کر سکتا کیونکہ اگر وہ اپنے عمل کا بدلہ دوسرے کی طرف منتقل کر دے تو وہ خود اپنے عمل کے بدلہ اور اس کے اثرات وعواقب ونتائج سے آزاد ہو گیا۔

آپ کا یہ خیال درست نہیں کیونکہ مسلمان اپنی نیکی کے ثواب کو دوسرے کی طرف منتقل کرنے کی وجہ سے اپنے ثواب عمل سے خالی اور محروم نہیں ہو گیا بلکہ دوسرے

کو ثواب منتقل کرنے کے باوجود بھی اس کو اپنے عمل کا پورا پورا ثواب ملے گا، اور اس میں کوئی کمی واقع نہ ہوگی۔ لہٰذا وہ انتقال ثواب کے بعد بھی اپنے کسب میں رہن نہیں۔

اب رہا اسکا دوسرا پہلو اور وہ یہ کہ اگر ایصالِ ثواب کے ذریعہ کسی گناہگار کے عذاب میں تخفیف ہوجائے تو پھر بھی آیہ کریمہ "**کل امرئی بما کسب رهین**" کے خلاف ہوگا۔ اس کا جواب ہے کہ مومن کے حق میں دعاء استغفار کا جواز اور اس کا مفید ہونا قرآن کریم کی متعدد آیتوں میں وارد ہے جیسا کہ اوپر آپ پڑھ چکے ہیں تو آپ کے خیال کے موافق یہ خلاف پھر بھی باقی رہا اس کا صحیح اور معقول جواب یہی ہوسکتا ہے کہ آیہ کریمہ کا مطلب یہ ہے کہ ہر شخص اپنے کسب وعمل میں رہن ہے جب تک کہ اس کا وہ عمل باقی ہے کیونکہ بعض اوقات کسی برائی کی وجہ سے انسان کا نیک عمل ضائع ہوجاتا ہے اور کبھی نیکیوں کی وجہ سے برائیاں ختم ہوجاتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "**اولئك الذين حبطت اعمالهم**" وہ لوگ وہ ہیں جن کے (نیک) عمل مٹ گئے دوسری جگہ ارشاد فرماتا ہے "**ان الحسنات يذهبن السيئات**" بے شک نیکیاں برائیوں کو لے جاتی ہیں۔

اب دیکھئے آیہ کریمہ "**کل امرئی بما کسب رهین**" میں "**کل امرئی**" مومن وکافر سب کو شامل ہے اور "**ماکسب**" نیکی بدی سب کو عام ہے جس کا مفاد یہ ہے کہ اگر کسی کافر نے کوئی نیکی کی ہے تو وہ اس میں رہین ہے اور اگر کسی مومن نے کوئی بدی کی ہے تو وہ اس میں گرو ہے، لیکن بعض نیکی کرنے والے حبط اعمال کی وجہ سے اپنی نیکیوں میں رہن نہیں رہے اور بعض برائیوں سے آزاد ہوگئے۔ ظاہر ہے کہ یہ آزادی اور فک رہن آیہ کریمہ "**کل امرئی بماکسب رهین**" کے ظاہری معنٰی کے بالکل خلاف اور معارض ہے۔

معلوم ہوا کہ آیہ مبارکہ کے یہ معنٰی نہیں بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر شخص اپنے ہر عمل میں رہین ہے۔ جب تک اس کا وہ عمل عند اللہ باقی ہے۔ اور اگر کسی کا عمل کسی وجہ

سے ختم ہوگیا اس کا رہن ہونا بھی باقی نہ رہا، مثلاً کافر کی نیکیاں حبط اعمال کی وجہ سے باقی نہ رہیں تو وہ اپنی نیکیوں میں رہن ہونے سے چھوٹ گیا اور اگر کسی مومن کی برائیاں نیکیوں کی وجہ سے یا اس کی توبہ کے باعث یا اس وجہ سے کہ مومن نے اپنے عمل سے اس کو فائدہ پہنچایا ہے عام اس سے کہ وہ فائدہ شفاعت کی صورت میں ہو یا دعائے مغفرت کے ضمن میں یا ایصالِ ثواب کے طور پر (جیسا کہ آیاتِ قرآنیہ و احادیثِ صحیحہ سے ہم ثابت کرچکے ہیں) غرض کسی وجہ سے بھی جب مومن کی برائیاں ختم ہوگئیں تو اس کا رہن ہونا بھی ختم ہوگیا۔

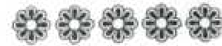
بعض مفسرین نے "**کل امرئی**" سے کافر مراد لیے ہیں اور "**بما کسب**" سے کسب عمل کفر مراد لیا ہے اور آیہ کریمہ کا یہ مطلب بیان کیا ہے کہ کافر اپنے عمل کفر میں گرفتار ہے اس تقسیم کا مبنی وہی آیات واحادیث ہیں جو ہم سابقہ تحریر کرچکے ہیں۔

آپ نے آیہ مبارکہ کا ایک ٹکڑا لکھ دیا پوری آیت ارقام نہیں فرمائی پوری آیت یہ ہے "**والذين امنو واتبعتهم ذريتهم بايمان الحقنا بهم ذريتهم وماالتنهم من عملهم من شئی۔ کل امرئی بما کسب رهين**" "اور جو ایمان لائے اور ان کی اولاد نے ایمان کے ساتھ ان کی پیروی کی یعنی ان کے پیچھے آئے ہم نے ان کی اولاد کو ان سے ملا دیا اور ان کے عمل سے ہم نے کچھ کم نہ کیا سب آدمی اپنے کیے میں گرفتار ہیں۔" یعنی نیکوں کی اولاد جو ان کے بعد پیدا ہوتی ہے اگرچہ ان کے عملوں میں قصور اور کوتاہی کیوں نہ ہو اور وہ ایمان دار رہیں تو اللہ تعالیٰ ان کے آباؤ اجداد کے اعمالِ صالحہ کے طفیل جنت میں ان کے درجے ان کے آباؤ اجداد سے ملا دے گا اور ان کے آباؤ اجداد کے عملوں سے کچھ کمی نہ کرے گا کیونکہ اگر ان کے عملوں سے کمی ہو جائے تو جتنی کمی ہوگی اسی قدر وہ اپنے عمل سے محروم ہو جائیں گے حالانکہ ہر شخص اپنے عمل میں گرو ہے پوری آیت کی اس

تشریح سے مسئلہ بالکل واضح ہوگیا اور آپ کے شبہ کی بنیاد منقطع ہوگئی غالباً اس آیت پر اب اس سے زیادہ کلام کرنے کی ضرورت نہیں۔

بحث کو طوالت سے بچانے کیلئے صرف ایک بات پر گفتگو ختم کرتا ہوں کہ اگر آپ کے اس نظریہ کو صحیح تسلیم کرلیا جائے کہ" **لیس للانسان الا ماسعیٰ**" کے موافق ہر شخص کیلئے وہی کچھ ہے جو اس نے کیا اس سے زیادہ اس کو کچھ نہیں مل سکتا تو یہ نظریہ اللہ تعالیٰ کے فضل کے بالکل منافی قرار پائے گا۔ کیونکہ فضل کے معنیٰ زیادتی کے ہیں اور اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں اپنے فضل کا ذکر بار بار فرماتا ہے" **ذالك فضل الله يوتيه من يشاء والله ذوالفضل العظيم**" یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے جسے چاہتا ہے دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ بڑے فضل والا ہے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نیکوں کو ان کی نیکیوں کی بدلے سے زائد بھی عطا فرماتا ہے جس میں ان کی سعی کو کوئی دخل نہیں ہوتا اور یہ بھی اس کا فضل ہے کہ اس نے ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان کے اعمالِ صالحہ کا فائدہ پہنچایا اور اس کے ثواب میں کچھ کمی نہ کی۔

بنابریں قرآن وحدیث کی روشنی میں بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ ہر شخص کو صرف اس کے عمل وسعی کا بدلہ ملنا قانونِ عدل ہے اور اس سے زائد کا حاصل ہونا فضل ہے اس طرح یہ بھی ماننا ہوگا کہ ہر شخص کا عمل اس کیلئے ہے دوسرے کیلئے نہیں جب تک وہ اپنی رضامندی سے اپنے عمل کا فائدہ دوسرے کو پہنچانا نہ چاہے نیز یہ کہ ہر شخص اپنے عمل میں رہن ہے جب تک اس کا وہ عمل باقی ہے اور اگر کسی وجہ سے اس کا وہ عمل (نیک ہو یا بد) باقی نہیں رہا تو اس کا رہین ہونا بھی ختم ہوگیا۔



بسم اللہ الرحمن الرحیم

باب نمبر 14

جامع العبادات "نماز"

خوبصورت موضوع پر امامِ اہلسنت حضرت

علامہ سید احمد سعید کاظمی کے جامع تحریر

ماہنامہ السعید امام اہل سنت نمبر ۱۹۹۵ صفحہ ۷۳ تا ۷۵

بندہ جب نماز کیلئے کھڑا ہوتا ہے اور نماز شروع کرتا ہے تو سب سے پہلے وہ ہاتھ اُٹھا کر تکبیر کہتا ہے۔ مختلف احادیث میں بظاہر مختلف الفاظ ہیں بعض احادیث میں سر تک، بعض میں کانوں تک، اور بعض میں شانوں تک ہاتھ اُٹھانے کا ذکر آیا ہے جس کے بارے میں فقہاء نے تصریح فرمائی کہ ہاتھ اس طرح اُٹھاؤ کہ اگر انگلیوں کا اعتبار کرو تو وہ سر کے مقابل ہوں، اگر ہتھیلیوں کو دیکھو تو وہ کانوں کے برابر ہوں اور اگر کلائی کو پیشِ نظر رکھو تو وہ شانوں تک ہو، گویا تمام احادیث پر عمل ہو جائے، بہر حال اگر کوئی شخص فقہاء کی اس تحقیق سے اتفاق نہ رکھے تب بھی وہ ہاتھ اتنی بلندی تک ضرور اٹھائے گا کہ دیکھنے والے کو بخوبی اندازہ ہو کہ نماز پڑھنے والے نے نماز کی نیت کر لی ہے اور تکبیرِ تحریمہ کہہ لی ہے۔ بندہ ہاتھ اُٹھا کر "اللہ اکبر" کہتا ہے، نماز کی ہر حرکت اور ہر سکون میں ایمان والوں کیلئے نشانیاں ہیں۔ بندہ تکبیرِ تحریمہ کہتے ہوئے باقی دنیا سے ناطہ توڑ کر بارگاہِ خداوندی میں حاضر ہوتا ہے گویا وہ یہ کہتا ہے کہ اے میرے مولا، میں اپنے جسمانی تقاضوں کی تکمیل اور دنیاوی کاروبار میں انہاک کے باعث تیری بارگاہ سے دور رہا۔ اب جبکہ میں تیرے حضور کھڑا ہوں تو اقرار کرتا ہوں کہ تو سب سے بڑا ہے۔ کچھ لوگ پتھروں کے بنائے ہوئے بتوں کو پوجتے ہیں، کچھ درختوں اور پہاڑوں کے سامنے سجدہ ریز ہوتے ہیں، کچھ چاند سورج کی پرستش کرتے ہیں، کچھ وہ ہیں جو پانی یا آگ کی پوجا کرتے ہیں معبودانِ باطلہ کی عبادت کرتے ہیں، میرے مالک میں تیری کبریائی کا اقرار اور اعلان کرتا ہوں کہ تو سب سے بڑا ہے، مناظر فطرت ہوں یا مظاہرِ قدرت، ہر شے تیری مخلوق ہے، تیری صنعت اور کاریگری کا نمونہ ہے، تو خالق و مالک تو سب سے بڑا ہے، تیرے مقابلے میں کوئی کچھ نہیں ہے، اس لیے اب جبکہ میں تیری بارگاہ میں حاضر ہوں اور تیری کبریائی کا اعلان کرتا ہوں تو میں دنیا اور اس کی ضرورتوں سے ہاتھ اٹھاتا ہوں، اپنے کاروبار اور اپنی زمین جائیداد سے ہاتھ اٹھاتا ہوں، اپنے رشتے ناطوں، اپنی آل اولاد سے ہاتھ اُٹھاتا ہوں کہ اب میں

تیری بارگاہ میں حاضر ہوں، اور تو بڑا ہے، سب سے بڑا ہے اور وہ صرف ایک دفعہ یعنی نیت باندھتے ہوئے تکبیرِ تحریمہ کے وقت اللہ اکبر نہیں کہتا بلکہ رکوع، سجدے اور قعدے میں جاتے ہوئے ہر بار بھی اللہ اکبر کہتا ہے، اس میں حکمت یہ ہے کہ اس کائنات کی ہر چیز اس کی تسبیح میں مشغول ہے" **وان من شیء الا یسبح بحمدہ**" کوئی شے ایسی نہیں جو اللہ کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح نہ کرتی ہو ہر چیز کی تسبیح اس کی شان اور اس کے حال کے مطابق ہے، جو جس حال میں ہے اسی حال میں رب کی تسبیح میں مشغول ہے۔ اگر درختوں اور پہاڑوں کو دیکھیں تو وہ حالتِ قیام میں اس کی تسبیح کرتے نظر آتے ہیں۔ اوپر آسمان اور نیچے چوپائے حالت رکوع میں سبحان ربی العظیم کہہ رہے ہیں، حشرات الارض وغیرہ سجدے کی حالت میں سبحان ربی الاعلیٰ پکار رہے ہیں زمین اور اس کے ساتھ کئی چیزیں حالت قعود میں اپنے رب کی الوہیت اور عظمت کی گواہی دیتی معلوم ہوتی ہیں۔ آبشار اور دریا حرکت کی حالت میں رب کی عبادت کر رہے ہیں اور پتھروں کی چٹانیں سکون کی کیفیت میں اس کی یاد میں محو محسوس ہوتی ہیں۔ غرض قیام و قعود، رکوع و سجود، حرکت و سکون، جس حال میں جو چیز جہاں ہے اپنے خالق و مالک کی تسبیح و ثنا میں مصروف ہے۔

چونکہ انسان ان تمام عالموں اور کائنات کی ہر شے کی حقیقتوں کا جامع ہے اس لیے ضروری تھا کہ اس کی عبادت بھی تمام کائنات اور ہر مخلوق کی عبادت کا مجموعہ ہو۔ تو اللہ تعالیٰ نے تمام موجودات کی عبادتوں کے مختلف اور متعدد طریقے انسان کی عبادت میں شامل کر دیئے۔ قیام و قعود، رکوع و سجود، تمام مخلوق کی عبادت کا عطر ہیں، اور نماز میں حرکت بھی ہے، سکون بھی ہے، قیام و قعود اور رکوع و سجود کے وقت اور حرکت و سکون کے وقت بندہ "اللہ اکبر" کہتا ہے، گویا جب وہ حالت قیام کیلئے اللہ اکبر کہتا ہے تو ان تمام چیزوں کی طرف سے خدا کی کبریائی کا اعلان کرتا ہے جو حالت قیام میں اس کی تسبیح کر رہی ہیں اور جب وہ رکوع میں جاتے ہوئے اللہ اکبر کہتا ہے تو یہ اعلان اس

ساری مخلوق کی طرف سے ہے جو حالت رکوع میں محو عبادت ہے اسی طرح سجدے اور قعدے کیلئے اس کا اللہ اکبر کہنا گویا سجدے اور قعدے کی حالت میں قعدے کیلئے اس کا اللہ اکبر کہنا گویا سجدے اور قعدے کی حالت میں حمد وتسبیح کرنے والی جملہ مخلوق کی نمائندگی ہے۔

اب بندہ تکبیرِ تحریمہ کہہ کر ثناء پڑھتا ہے اور اس کے بعد سورۃ فاتحہ کی تلاوت کرنا۔ سورۃ فاتحہ تو اسے ہر رکعت میں پڑھنا ہے اس سورۃ میں کتنے اسرار ورموز ہیں کتنے بھید ہیں مجھ سا ناقص الفہم ان کا ادراک کیسے کرسکتا ہے، یہ تو ان برگزیدہ ہستیوں کا کام ہے کہ کسی نے کہا۔

؎ حریفاں بادہ ہا خوردند ورفتند
تہی خمخانہ ہا کر دندو رفتند

وہ حضرات اس کے اہل ہیں۔ بہر حال میں عرض کر رہا تھا کہ بندہ جب سورۃ فاتحہ پڑھتا ہے، کہتا ہے" **الحمد لله رب العٰلمين**" تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے" **حمدنی عبدی**" میرے بندے نے میری حمد کی۔ پھر بندہ کہتا ہے "**الرحمٰن الرحيم**" تو اللہ کی طرف سے ارشاد ہوتا ہے" **اثناء علٰی عبدی**" میرے بندے نے میری ثناء کی، پھر بندہ کہتا ہے" **مالک يوم الدين**" تو رب تعالیٰ فرماتا ہے" **مجدنی عبدی**" میرے بندے نے میری بزرگی بیان کی، اس کے بعد بندہ کہتا ہے" **اياك نعبد واياك نستعين**" تو ارشاد ہوتا ہے" **هذالی ولعبدی ماسال**" یہ میرے اور میرے بندے کے درمیان مشترک ہے، معبود ہونا یہ میری الوہیت کا تقاضہ ہے اور مدد کرنا مانگنا یہ تیری بندگی کا تقاضہ ہے، تو میرے بندے نے جو کچھ مانگا وہ سب کچھ اس کیلئے ہے، اور بندے نے کیا مانگا" **اهدنا الصراط المستقيم**" مجھے صراط مستقیم کی ہدایت فرما۔ بندہ رب کی بارگاہ میں عرض گزار ہے" **اهد**" ہدایت فرمایا۔ یہ صیغہ امر

کا ہے۔ جب خطاب کرنے والا بندہ ہو اور مخاطب رب ہو اور صیغہ امر کا ہو تو وہ ہمیشہ عاجزی تذلیل، اور دعا کے معنیٰ میں ہوتا ہے، حالانکہ امر کے اندر تو استعلاء ہوتا ہے لیکن جب یہ صیغہ استعمال کرنے والا بندہ ہے اور جس کو مخاطب کر کے یہ امر کا صیغہ بول رہا ہے وہ خالق و مالک کائنات ہے، معبودِ حقیقی ہے تو اس کا یہ خطاب دراصل اس کی عاجزی ہے، اس کا تذلل ہے، اس کی دعا ہے،۔ یہ التجاء ہے، مولا ہمیں سیدھا راستہ دکھادے، صراط المستقیم پر چلادے، صراط مستقیم کی ہدایت دےدے۔ کیا یہ بندہ، یہ التجاء کرنے والا، یہ دعا مانگنے والا، نماز پڑھنے والا، یہ سیدھے راستے پر نہ تھا؟ یہ مسلمان ہے، یہ کلمہ گو ہے، یہ عابد ہے، نمازی ہے، اس نے وضو کیا ہے پاک لباس پہنا ہے، مسجد میں آیا ہے، تذلل اور خضوع وخشوع کے ساتھ اپنے رب کے دربار میں ہاتھ باندھے سر جھکائے عرض گزار ہے، اے رب العٰلمین، اے رحمٰن ورحیم، اے بدلے کے دن کے مالک، اے ہمارے معبود، اے ہماری جھولیوں کو بھرنے والے، مجھے سیدھا راستہ دکھادے، اگر یہ سیدھے راستے پر نہیں، صراط مستقیم پر نہیں، اگر اسے ہدایت نہیں ملی، تو کلمہ، ایمان، وضو، مسجد میں حاضری، نماز، ان سب کا کیا مطلب ہے، اور اگر یہ سیدھے راستے پر ہے تو پھر ہدایت کیوں مانگ رہا ہے، جو چیز پہلے سے حاصل ہوا سے مانگنا تو بے عقلی ہے، نادانی ہے، یہ تو تحصیل حاصل ہے اور تحصیلِ حاصل جہاں عبث ہے وہاں محال بھی ہے، یہ محال چیز کیلئے دعا کیوں مانگ رہا ہے اور پھر از خود نہیں مانگ رہا، رب کے کہنے پر مانگ رہا ہے۔

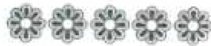
اس کے جواب میں عرض کروں گا کہ نماز کی حقیقت کیا ہے اور نماز ہمیں کیوں تعلیم کی گئی ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے کہ" **وماخلقت الجن والانس الاليعبدون**" (پ۲۸)

انسان کی تخلیق کا مقصد خدا کی عبادت ہے، خدا کی معرفت کا حصول ہے، اور نماز جو انسان کی تمام عبادتوں کا خلاصہ ہے اس کا اصل مقصد بھی یقیناً معرفت خداوندی

ہے، اور صراط مستقیم بھی وہی راستہ ہے جو ہمارے رب کی طرف جاتا ہے جس پر چل کر وہ کریم اپنے رب کی معرفت حاصل کر سکتے ہیں۔ اس راستے کی بیشمار منزلیں ہیں، بے شمار درجات ہیں، یہ راستہ تو خدا کی طرف جاتا ہے اور خدا لامحدود ہے خدا ایسا نہیں کہ جسے آپ کہیں گے کہ یہاں سے شروع ہو کر یہاں تک ختم ہو گیا ہے۔ نہیں وہ لامتناہی ہے، جب خدا لامحدود ہے، تو جو راستہ اس کی طرف جا رہا ہے وہ بھی لامحدود ہے، تو جو راستہ اس کی طرف جا رہا ہے وہ بھی لامحدود ہے، اس کی بے شمار منازل اور بے شمار مراحل ہیں، اس کے بیشمار درجات ہیں، سب سے پہلا مرحلہ، سب سے پہلا مرتبہ۔ سب سے پہلی منزل ''ایمان'' ہے۔ پھر اس پر چلتے چلے جاؤ گناہوں سے بچنا، نیکیوں کو اختیار کرنا۔ روزہ رکھنا، نماز پڑھنا، زکوۃ دینا، فسق و فجور سے اجتناب کرنا، اس کے احکامات کی بجا آوری میں مشغول رہنا، اس کی مرضیات پر عمل کرنا، اس کی خوشنودی طلب کرنا، بیشمار مرحلے، بے شمار درجے ہیں، اس کی ذات لامتناہی ہے، یہ صراط مستقیم ہمیں اس کی طرف لے کر جا رہا ہے۔ اب کس مقام کو کہیں گے کہ بس اب ہم خدا تک پہنچ گئے۔ اب اس کی معرفت اور قرب کے درجات ختم ہو گئے؟ نہیں، بندہ نماز میں کھڑا عرض کرتا ہے، کہ اے میرے مالک تو نے مجھے توفیق بخشی، تو نے مجھے سیدھا راستہ دکھایا میں تیری بارگاہ میں حاضر ہو گیا، میرے مولا! اب مجھے معرفت کا اگلا درجہ بھی عطا فرما دے، یہ درجہ مل گیا، مولا! اب دوسرا درجہ دکھا دے، اب تیسرے درجے تک پہنچا دے، اب جو اس سے اگلا درجہ تیری معرفت کا ہے وہ مجھے عطا فرما دے۔ گویا ہر ایک ہدایت مانگنے والا اپنے حال کی مناسبت سے اپنی شان اور اپنے مقام کے مطابق مانگ رہا ہے۔ میں جو اس کا ایک گناہگار بندہ ہوں میں اس سے ہدایت مانگوں گا'' **اهدنا الصراط المستقيم**'' کہوں گا تو وہ درجہ طلب کروں گا جو میرے حسب حال ہے اور اگر کوئی صالح، متقی، اللہ کا ولی، '' **اهدنا الصراط المستقيم**'' کہے گا تو وہ اپنے مرتبے کے مطابق خدا سے

اس کی معرفت کے اگلے درجے کو طلب کرے گا۔ کوئی صحابی کہے گا تو وہ اپنے مقام کے مطابق کہے گا، خلفاء راشدین کہیں گے، حسنین کریمین کہیں گے، سیدۃ النساء فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا کہیں گی، ازدواج مطہرات کہیں گی، تو اپنے اپنے حال کے مطابق خدا کی معرفت کے درجات کی طلب کا اظہار ہوگا، اور سرکار دو عالم نورِ مجسم ﷺ معرفت کے جس درجے کو طلب فرمائیں گے، اس کا تو کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا۔

معلوم یہ ہوا کہ نماز ان تمام عبادات کی جامع ہے جو انسان کیلئے ہیں اور انسان تمام مخلوقات کا جامع ہے تو نماز نہ صرف تمام مخلوق کی عبادتوں کی جامع ہوئی بلکہ انسان کی اپنی دیگر تمام عبادات کی بھی جامع قرار پائی۔



بسم اللہ الرحمن الرحیم

باب نمبر 15

وحدت الوجود

امامِ اہلسنت حضرت

از علامہ سید احمد سعید کاظمی رحمۃ اللہ علیہ

وحدت الوجود کے موضوع پر مدلل خطاب

ماہنامہ السعید امام اہل سنت نمبر ۱۹۹۵ صفحہ ۷۷تا۹۷

آپ رحمۃ اللہ علیہ یوں گویا ہوتے ہیں اس پُرفتن دور میں حق و باطل میں تمیز کرنا بے حد دشوار ہو گیا ہے۔ دلائل و شواہد کی بھول بھلیوں میں صحیح راستہ اختیار کرنا عوام الناس کیلئے ممکن نہیں رہا۔ اس کے باوجود میں کوشش کروں گا کہ وہ بات جو انتہائی ادق اور پیچیدہ ہے، بے حد سادہ اور عام فہم انداز میں آپ تک منتقل کردوں تاکہ وہ تمام شکوک و شبہات جو موضوع کے حوالے سے پیدا ہوتے ہیں یا پیدا کیے جاتے ہیں ان کا شافی جواب میسر آئے۔

کلمہ طیبہ دین کی بنیاد ہے، یہ کلمۃ التوحید ہے، یہ تو وہ جوہر ہے، جو اگر ہم میں ہے تو ہم ہیں اور گر نا پیدا ہے تو ہم کالعدم ہیں" **لا الہ الا اللہ**" کا مفہوم میں آپ پر واضح کرتا چلوں...... اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، کوئی عبادت کے لائق نہیں، اسکے سوا کسی کی پرستش اور پوجا نہیں کی جا سکتی...... یا یوں کہیے کہ اس کی ذاتِ مقدسہ وحدت کی صفت سے متصف ہے، اگر کوئی اس کی ذات میں شریک متصور ہو تو" **لا الہ الا اللہ**" کی نفی ہوگی اور اگر کوئی اس کی صفات میں شریک مانا جائے تب بھی" **لا الہ الا اللہ**" کی نفی ہوگی۔

یہ بھی ذہن میں رہے کہ ذات کا تعقل اور تصور صفات سے علیحدہ ہو کر ممکن نہیں انسان کی ذات، اس کے جسم، شکل و شبہات، عادات و اطوار کے بغیر کچھ نہیں، آپ کسی مکان کے بارے میں سوچیں تو جب تک اس کے بام و در، اس کی تعمیر، اس کا خاکہ آپ کے ذہن میں نہ آئے مکان کا تصور قائم نہیں ہوتا۔

رب تعالیٰ اپنی ذات اور اپنی صفات دونوں میں وحدہٗ لاشریک ہے لیکن قابلِ غور بات یہ ہے صفات میں شریک کا مفہوم تو سمجھ میں آتا ہے۔ وہ سمیع و بصیر ہے، وہ علیم و خبیر ہے، وہ حیی و قیوم ہے، وہ رحمٰن و رحیم ہے، وہ قہار و جبار ہے، وہ تو رب غفار ہے یہ تمام صفات اس کی ہیں، چنانچہ اس کے سوا کسی کو سمیع و بصیر مانو تو مشرک، علیم و خبیر اس کے سوا کسی کو گردانو تو شرک، اس کے علاوہ کسی کو حیی و قیوم سمجھو تو شرک، اسی

طرح اس کی کسی صفات کو کسی دوسرے کیلئے تسلیم کرو تو شرک ہے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ ذات میں شرک کا مفہوم کیا ہے، ہم کسی کو اس کی ذات میں کیسے شریک ٹھہرا سکتے ہیں؟ ظاہر ہے کہ اس کا جواب فوری طور پر ذہن میں یہ آتا ہے کہ اس کے سوا کسی کو الٰہ مانو تو یہ ذات میں شریک ہوگا، میں عرض کروں گا کہ یہ درست نہیں، وہ اس لیے کہ الوہیت بھی اس کی صفت ہے، اس کے علاوہ کسی کو الٰہ ماننے سے اس کی صفت الوہیت میں شرک ہوگا نہ کہ اس کی ذات میں، تو پھر ذات میں شریک ہونے کا مفہوم کیا ہے؟

خدا کی پہلی صفت:

اس سوال کا جواب تلاش کرنے کیلئے ہمیں مزید غور وخوض سے کام لینا ہوگا، خدا تعالیٰ کی سب سے پہلی صفت، صفتِ وجود ہے "وجود" کا مفہوم کیا ہے؟ کیا وجود جسم کو اس کے اعضاء کو، گوشت پوست، ہڈیاں اور خون کو کہتے ہیں؟ گفتگو کے دوران ہم کہتے ہیں کہ میرا جسم کمزور ہوگیا ہے۔ میرے اعضاء متناسب ہیں، میری ہڈیاں مضبوط ہیں، میرا خون بہہ رہا ہے وغیرہ وغیرہ گویا ہم یہ کہتے ہیں کہ ہم کچھ اور ہیں اور ہمارا جسم، ہمارے اعضاء، ہمارا گوشت، ہڈیاں، خون وغیرہ کچھ اور ہیں، جیسے ہم کہیں کہ یہ میرا مکان ہے، یہ میرا کمرہ ہے، یہ میری کتاب ہے، یہ میرا لباس ہے، ظاہر ہے کہ جسے ہم نے اپنا کہا ہے وہ کچھ اور ہے اور ہم کچھ اور ہیں۔

اب "وجود" کا مفہوم سمجھئے "الوجود شدن" یعنی وجود کے معنیٰ ہیں "ہونا" یوں سمجھئے کہ "ہست ونیست" ......وجود وعدم...... "ہست، ہونا" ...... "نیست، نہ ہونا ہے" "وجود، ہونا ہے" "عدم، نہ ہونا" ذات کی پہلی صفت "وجود" ہے۔ ہم کہیں کہ زید ہے یا زید نہیں ہے۔ ہم نے زید پر "ہونے" یا "نہ ہونے" کا حکم لگایا ہے گویا ہونا یا نہ ہونا زید کی صفت ہے۔ یہ علیحدہ بحث ہے کہ یہ صفت عین ذات ہے یا غیر ذات۔ اگر

پہلے ہم اللہ کی صفت وجود کو نہ مانیں تو نہ ہم اس کو سمیع وبصیر مان سکتے ہیں نہ حی وقیوم، نہ علیم وخبیر مان سکتے ہیں، نہ رحمٰن ورحیم، نہ اس کی قدرت پر ایمان لاسکتے ہیں نہ اس کی حکمت پر، خدا کی کسی صفت پر ایمان نہیں لایا جاسکتا جب تک اس کی صفت وجود کو نہ مانا جائے۔

صفتِ وجود، عین ذات ہے:

رہی یہ بحث کہ "وجود" عین ذات ہے یا غیر ذات ......تو اس کے بارے میں عرض ہے کہ اگر ذات کا "وجود" ہے تو ذات ہے، اگر وجود نہیں ہے تو ذات نہیں ہے ذات کا "ہونا" ہی تو ذات ہے، گویا ہم صفتِ وجود کو غیرِ ذات نہیں مانتے بلکہ عین ذات مانتے ہیں ...... یا یوں کہیئے کہ صفتِ وجود وہ صفت ہے جو عین ذات ہے۔ اس مقام پر ہمیں اس سوال کا جواب ملا کہ صفاتِ الٰہیہ میں شرک کا مفہوم تو واضح ہے لیکن ذاتِ الٰہی میں شرک کا تصور کیا ہے؟ اگر ہم غیرِ خدا کی صفات میں شرک کے مرتکب قرار پائے اور اگر ہم نے خدا کے سوا کسی اور کے وجود کو تسلیم کیا تو یہ شرک فی الذات ہونے کے ساتھ شرک فی الصفات بھی ہوا۔

جب ہم نے کلمہ طیبہ پڑھا اور کہا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ وحدہٗ لاشریک ہے اپنی ذات میں اپنی صفات میں یکتا ہے، تو جب تک ہم یہ نہ مانیں کہ اس کی صفتِ وجود میں کوئی شریک نہیں، اس کے سوا کسی کا وجود نہیں، اس وقت تک توحید کا صحیح تصور ممکن نہیں۔

ایک شبہ کا ازالہ:

اس پر سوال ہوتا ہے کہ یہ زمین، آسمان، چاند، سورج، چرند، پرند، انسان، حیوان، نور، ظلمت ہدایت، وگمراہی، خیر وشر، ان سب کا وجود ہے اور اگر ہم ان کا وجود نہ مانیں تو اللہ کی صفتِ تخلیق کا انکار لازم آئے گا اور اس طرح ہم شرک سے بچ کر کفر کا

شکار ہو جائیں گے۔

اس کے جواب میں عرض ہے کہ وجود حقیقی تو اللہ ہی کا ہے، باقی تمام کائنات کا وجود حقیقی نہیں مجازی ہے، حقیقتِ وجود، وجودِ واحد کے سوا موجود نہیں، آئینہ خانے میں، جہاں ہر طرف، ہر سمت، بے شمار آئینے جڑے ہوں، ایک شمع روشن ہو تو وہ ہر آئینے میں جگمگاتی نظر آتی ہے، ہر عکس اس ایک شمع کا محتاج ہے، وہ ایک شمع بجھ جائے تو ہر سو اندھیرا چھا جائے۔ ساری جگمگاہٹ اور روشنی اسی ایک شمع کی مرہون منت ہے۔

لیکن شاید اس مثال پر اعتراض ہو کہ آئینوں کا تو اپنا وجود ہے، اس لیے اس بات کو دوسرے انداز میں سمجھنے کی کوشش کیجئے، آپ ایک کمرے میں تشریف رکھتے ہیں، آپ کے سامنے چارپائی ہے، پیچھے دروازہ ہے، دائیں طرف کھڑکی ہے اور بائیں طرف الماری ہے، آپ کے اوپر چھت ہے اور نیچے فرش ہے، اگر آپ رخ پھیر لیں تو آگے، پیچھے، دائیں، بائیں کا مفہوم بدل جائے گا اور اسی طرح اگر آپ چھت پر چلے جائیں تو اوپر نیچے کا تصور بھی تبدیل ہو جائے گا۔ یہ آگے، پیچھے، دائیں، بائیں، اوپر، نیچے، ان کا اپنا وجود نہیں ہے۔ آپ ہیں تو یہ سمتیں اور جہتیں بھی ہیں اگر آپ نہیں تو یہ بھی نہیں، آپ جب کمرے میں داخل ہوئے تو ان سمتوں کو ساتھ لے کر نہیں آئے کہ ان کا اپنا علیحدہ کوئی وجود نہیں ہے، آپ کے وجود کے باعث یہ از خود متصور ہو گئی ہیں۔

اگر ریاضی کے حوالے سے سوچیں تو تمام اعداد ''ایک'' کے مرہونِ منت ہیں۔ بلکہ کمپیوٹر میں تو ایک اور صفر صرف یہی عدد استعمال ہوتے ہیں ''ایک'' وجود ہے ''صفر'' عدم ہے باقی تمام اعداد و شمار اسی ایک وجود کے مرہونِ منت ہیں۔ وجودِ حقیقی وہی ایک وجود ہے، باقی سب کچھ اس کی صفات کا جلوہ ہے، اس کی قدرت کی کرشمہ سازی ہے، کہیں اس کی صفتِ جلال جلوہ نما ہے، کہیں اس کی جمالِ کی جلوہ آرائی ہے۔

جدت پسند اذہان کی تسلین کیلئے اسی بات کو ایک دوسرے انداز میں عرض کرتا ہوں، کسی مسئلہ کی تحقیق کیلئے کچھ چیزیں فرض کر لی جاتی ہیں، فرض کرو ایک شخص ہے،

اس کے فلاں فلاں اہلِ خانہ ہیں، فلاں حالات سے وہ گزرتا ہے اور فلاں صورتِ حال پیش آتی ہے۔ اس صورت میں اس شخص کیلئے شریعت کا کیا حکم ہے، علماء جانتے ہیں کہ مسائل کے استنباط کیلئے اس نوعیت سے چیزیں فرض کرنا ضروری ہو جاتا ہے، یا جیسے حساب کتاب کے معاملات میں سوال حل کرنے کیلئے چند چیزیں فرض کر لی جاتی ہیں۔ الجبراء میں کہتے ہیں کہ اس کی قیمت خرید فرض کی لی جو برابر ہے ''لا'' کے۔ اب سب جانتے ہیں کہ ''لا'' کا تو مفہوم ہے ''نہیں'' لیکن جب قیمت ''لا'' قیمت فرض کر لی جاتی ہے تو سوال حل ہو جاتا ہے۔ اور جواب تلاش کرنے میں آسانی ہو جاتی ہے۔

یہ تمام چیزیں جو ہم فرض کرتے ہیں ان کا حقیقتاً کوئی وجود نہیں ہوتا۔ لیکن عالم فرض میں ایسی بے شمار اشیاء آنِ واحد میں مستحق ہو جاتی ہیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ جب کسی شے کی تخلیق کا ارادہ فرماتا ہے تو فرماتا ہے'' **کن** '' تو چیز ہو جاتی ہے'' **انما امرہ اذا اراد شیئا ان یقول لہ کن فیکون** '' اس کا حکیم یہی ہے کہ جب وہ کسی چیز کا ارادہ فرمائے تو اس سے کہے، ہو جا تو وہ (فوراً) ہو جاتی ہے۔

ظاہر ہے کہ حقیقی اشیاء کے بنانے میں وقت صرف ہوتا ہے، فرضی اشیاء کی تخلیق میں نہیں، فرق اتنا ہے کہ جتنی ہماری حیثیت اور وقعت ہے اتنی حیثیت ہماری فرض کی ہوئی چیزوں کی ہے اور خدا کی تخلیق کردہ اشیاء اس حقیقی وجود کے مقابلے میں فرضی ہونے کے باوجود ''وجود'' معلوم ہوتی ہیں۔ دیکھئے شاعر بتاتے ہیں اور صوفیاء کرام نے کہا ہے کہ ''یہ دنیا دراصل عالمِ خواب ہے، جب ہماری موت آئے گی تو یوں کہئے کہ ہماری آنکھ کھلے گی، تو اس تمام کائنات کو بھی اسی انداز میں خواب تصور کیجئے، لیکن یہ خواب دکھانے والا وہ قادرِ مطلق ہے اس لیے اس خواب کو خواب سمجھنا بھی خواب و خیال کی بات معلوم ہوتی ہے۔''

بہر کیف اس تمام گفتگو کا مقصد یہ ہے کہ یہ تمام کائنات مجاز ہے، فرضی چیز ہے اور حقیقی وجود صرف اس کا ہے۔

اب غور کیجئے کہ "وحدت الوجود" پر یقین رکھنے والوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انھوں نے شرک کیا، کہ یہ چونکہ صرف رب کے وجود کو مانتے ہیں اس لیے انھوں نے گویا ہر موجود شے کو خدا تسلیم کرلیا...... ان کے کہنے کے مطابق جب خدا کے سوا کچھ نہیں تو پھر جو کچھ ہے وہ خدا ہی ہے، پھر ہر شے خدا ہے۔ یہ دراصل مغالطہ ہے، شرک تو اس وقت ہوگا جب خدا کے سوا کسی شے کو مانو گے تسلیم کرو گے۔ پھر اسے خدا کی ذات و صفات میں شریک ٹھہراؤ گے۔ جب تمہارا عقیدہ یہ ہوگا کہ خدا کے سوا کچھ نہیں، یہ کائنات رنگ و بُو، یہ عالمِ آب وگل، یہ زمین و آسمان، یہ ستارے، یہ کہکشاں، یہ نباتات و جمادات، یہ انسانوں کی فوج ظفر موج، یہ حشرات الارض، یہ سیم وزر کے انبار، یہ اجناس و اثمار، یہ شجر وحجر، یہ سب مجاز ہیں، یہ سب فرضی چیزیں ہیں، یہ ذہن و نظر کا فریب ہے، یہ ساری کائنات اعتباری ہے۔ حقیقی نہیں، خدا کے سوا کچھ نہیں ہے، جب تم اس کے سوا کسی کے وجود کو تسلیم ہی نہیں کرتے تو اس کی ذات میں کسی کو شریک کیسے کر سکتے ہو؟ جس کو تم شریک کرنا چاہو گے پہلے اس کے وجود کو تو مانو گے، جو چیز ہے ہی نہیں، وہ خدا کی ذات وصفات میں شریک کیسے ہو سکتی ہے؟؟؟





باب نمبر 16

حضرت غزالئ زماں رحمۃ اللہ علیہ کی نکات آفرینیاں

از علامہ غلام رسول سعیدی رحمۃ اللہ علیہ

شیخ الحدیث دار العلوم نعیمیہ کراچی

ماہنامہ السعید امام اہل سنت نمبر ۱۹۹۵ صفحہ ۸۵ تا ۸۸

ضیغم اسلام، غزالی دوراں، رازی زماں، حضرت علامہ سید احمد سعید کاظمی رحمۃ اللہ علیہ علم وفضل کے بے کراں سمندر بلکہ ورثۃ الانبیاء کی تعبیر، زہد وتقویٰ اور عبادت و ریاضت میں ''**الفقر فخری**'' کی تصویر، تحقیق وتدقیق کے نیرِ تاباں، علم وعمل کے مرج البحرین، سادات کے گوہر آبدار، بارگاہِ غوثیت میں مقبول ومحبوب، علومِ ابو حنیفہ کی برہان، افکارِ احمد رضا خان رحمۃ اللہ علیہ کے پاسبان، اسلاف صالحین کی میراث، اخلاف کیلئے مشعلِ راہ بلکہ نشانِ منزل، اعدائے دین کیلئے شمشیرِ برہنہ، دنیاداروں کے سامنے سراپا استغناء، دینداروں کیلئے سراپا مہر ومحبت، مریدین وتلامذہ کیلئے مجسمِ شفقت، بادۂ توحید میں مست، رسول اللہ ﷺ کے عشق سے سرشار، جن کی تحریر وتقریر میں اجتہاد واستنباط کی مہک تھی تو جن کی مجلس میں علم وعرفان کی بارش ہوتی تھی، جن کی گفتگو میں روانی واثر آفرینی تھی۔ جو تمام علوم وفنون پر یکساں نظر اور قدرت ومہارت رکھتے تھے۔ اور مضامین کی تصنیف میں طبعزاد نگارشات کا ملکہ، نکتہ سنجی اور حاضر جوابی میں جن کا ثانی نہ تھا۔

دین کی خدمت کرنا تو ہر عالم کا شعار ہوتا ہے۔ لیکن اپنی جیب سے خرچ کر کے دین کی سربلندی کیلئے کوشاں میں نے صرف علامہ کاظمی رحمۃ اللہ علیہ کو پایا۔

تیس سال پہلے ایک شوریدہ سر صحافی نے اپنے ہفت روزہ میں جب اسلافِ اہلسنت کے خلاف سب وشتم کی شورش برپا کی۔ شعائرِ اہلسنت کا مذاق اڑایا اور اپنے مذموم عزائم کی تکمیل کیلئے اس نے چٹان کا سہارا لیا اس وقت کوئی اور ادارہ یا شخص اس چٹان میں شگاف نہیں ڈال سکا۔ اس چٹان کو توڑنے کیلئے آپ ہفت روزہ ''طوفان'' سامنے لائے اور دیکھتے ہی دیکھتے آپ نے بساطِ مخالف کا نقشہ بدل ڈالا۔ اس مہم میں آپ نے اپنی جیب سے اس وقت دس ہزار روپے خرچ کیے تھے۔ یہ میرے علم اور مشاہدے کی بات ہے۔ کرایہ اور نذرانہ لے کر وعظ وتقریر کیلئے سبھی تیار ہوجاتے ہیں لیکن بغیر کرایہ اور نذرانہ کے شرح صدر اور طمانیتِ قلب کے ساتھ سفر کرتے ہوئے

میں نے صرف آپ رحمۃ اللہ علیہ کو دیکھا ہے۔ بے حد حلیم، ہمدرد اور غمگسار تھے۔ امیر اگر بیمار ہوتو بے شمار لوگ عیادت کیلئے پہنچتے ہیں لیکن غریبوں کی عیادت کرنے میں سبقت لے جانے میں میں نے آپ رحمۃ اللہ علیہ ہی کو دیکھا تھا۔

آپ میں غایت درجہ کی سادگی وانکساری تھی۔ ایک مرتبہ میں نے عرض کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے نابینا صحابی کو جو دعا تلقین فرمائی تھی، اس دعا کے الفاظ میں یا محمد ہے لیکن اعلیٰحضرت رحمۃ اللہ علیہ نے تجلی الیقین میں لکھا ہے کہ یا محمد کی جگہ یارسول اللہ (ﷺ) پڑھے۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ''رسول اللہ ﷺ نے دعا میں جو کلماتِ تلقین فرمائے ہوں انہیں بدلنا نہیں چاہیے۔ کیونکہ بخاری شریف میں ہے کہ جب حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ نے ''**بنبیك الذی ارسلت**'' کی جگہ ''**برسولک الذی ارسلت**'' کہا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ نہیں ''**بنبیك الذی ارسلت**'' کہو۔ لیکن اعلیٰحضرت نے جو فرمایا۔ وہ محبت وعشق اور ادب وتعظیم کے حوالے سے کہا ہے سو حق کہا ہے۔''

اعلیٰحضرت فاضلِ بریلوی رحمۃ اللہ علیہ زمین وآسمان کے سکون (عدمِ حرکت) کے قائل تھے اور قرآن مجید کی اس آیت سے استدلال کرتے تھے'' **ان اللہ یمسك السموت والارض ان تزولا**'' (فاطر ۱۴) ''بیشک اللہ روکے ہوئے ہے آسمانوں اور زمین کو کہ جنبش نہ کرے'' (ترجمہ اعلیٰحضرت رحمۃ اللہ علیہ)۔ میں نے جب اس مسئلے میں آپ کی رائے پوچھی تو آپ نے فرمایا کہ ''میرے خیال میں اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ آسمان وزمین کو ان کے محور میں رکھے ہوئے ہے، اور ان کو اپنے محور سے ہٹنے نہیں دیتا'' آپ زمین کی حرکت کے قائل تھے اور البیان میں آپ نے اس آیہ کریمہ کا ترجمہ بھی اسی رعایت سے کیا ہے ''بیشک اللہ آسمانوں اور زمینوں کو روکتا ہے کہ وہ اپنی جگہ سے (نہ) ہٹیں۔'' پھر فرمایا ''میں اعلیٰحضرت کے استدلال کی گہرائی کو شاید نہیں پہنچ سکا۔ اور احتراماً فرمایا کہ ممکن ہے کہ حق وہی ہے جو

اعلیٰحضرت نے فرمایا ہے۔"

ایک مرحوم واعظ (اللہ ان کی مغفرت فرمائے) جو حضرت کے بمنزلہ شاگرد تھے کسی بات پر حضرت سے روٹھ گئے آنا جانا اور ملنا جلنا چھوڑ دیا۔ آپ سے ایک مرتبہ لاہور کی کسی مجلس میں آمنا سامنا ہوگیا۔ آپ بے اختیار ان کی طرف بڑھے اور فرمایا حدیث شریف میں ہے کہ " **خیر کم من یبدا بالسلام** "اس کے بعد" السلام علیکم" کہا اور مصافحہ کیلئے ہاتھ بڑھا دیئے۔ علم کی بلندی اور علم و عمل کے بہترین امتزاج کی یہ مثال ناراضگی کے موقع پر کسی بڑے آدمی کا اپنی بڑائی اور عظمت کے باوجود چھوٹے کے آگے جھکنے کی یہ نظیر میں نے صرف آپ میں دیکھی ہے۔ نیکی پارسائی اور زہد و تقویٰ کا تعلق تو انسان کی اپنی ذات سے ہوتا ہے لیکن اپنی سیرت و اخلاق کے درخشاں نشان جس میں دوسرے کے ساتھ حسنِ سلوک، تواضع اور انکسار کی قابلِ تقلید مثالیں وہ چھوڑ گئے ہیں، جو پوری قوم کیلئے مشعلِ راہ ہیں۔

حضرت سید ابوالبرکات رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مرتبہ آپ سے فرمایا کہ "اعلیٰحضرت فاضلِ بریلوی نے لکھا ہے کہ امام رازی " **وتقلبك فی السّٰجدین** " سے حضور کے ابوین کریمین کے ایمان پر استدلال فرماتے ہیں حالانکہ امام رازی نے تفسیرِ کبیر میں اس استدلال کا رد فرمایا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ "امام رازی نے تفسیرِ کبیر میں اس عقیدہ کی قطعیت کا رد فرمایا ہے اور اسرار التنزیل میں اس آیت سے استدلال کیا ہے۔ اعلیٰحضرت نے اسی حوالہ سے لکھا ہے۔"

علامہ عبدالغفور ہزاروی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مرتبہ تقریر میں فرمایا کہ حضور نبی کریم ﷺ بمنزلہ روح ہیں اور کائنات بمنزلہ بدن ہے۔ تقریر کے بعد فرمایا کہ میری تقریر متن ہے اور اس پر علامہ کاظمی صاحب رحمۃ اللہ علیہ حاشیہ چڑھائیں گے۔ آپ نے فرمایا کہ "محشی کا کام ہوتا ہے کہ متن سے ایراد اور اعتراض کو دور کرے علامہ عبدالغفور کی تقریر پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ روح کو بدن کے بہت سے احوال کا علم نہیں ہوتا۔ مثلاً ہم نہیں

جانتے کہ ہمارے بدن میں مختلف حصوں کی کیفیت کیا ہے۔ خون کی مقدار کتنی ہے، ہمارے جسم پر بال کتنے ہیں، ہمارے اندرونی اعضاء کا تناسب، قوت و ضعف، وغیرہ ہم پر آشکار نہیں۔ گویا روح کو جسم کے بارے میں بیشتر تفصیلات کا علم نہیں ہوتا۔ بلکہ جسم کے بارے میں اس کی معلومات بہت کم ہوتی ہیں۔ اگر حضور بمنزلہ روح اور کائنات بمنزلہ جسد ہو تو لازم آئے گا کہ حضور کو کائنات کی بیشتر باتوں کا علم نہ ہو۔ اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ علامہ عبدالغفور نے حضور ﷺ کو بمنزلہ روح قرار دیا ہے عین روح نہیں کہا۔ اور مثال، ممثل لہٗ، کے جمیع امور میں مساوی نہیں ہوتی۔ اس مجلس میں حضرت صدر الافاضل رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر بڑے بڑے اکابر موجود تھے۔

حضرت مفتی محمد حسین نعیمی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مرتبہ آپ سے پوچھا کہ قرآن کریم میں ہے " **من جاء بالحسنة فله عشر امثالها** " (الانعام، ۱۶۰)" اس کا مطلب ہے کہ ایک نماز دس نمازوں کے برابر ہے۔ اس اعتبار سے اگر کوئی شخص ایک دن کی نمازیں پڑھ لے تو اگر خدانخواستہ وہ آئندہ 9 دن کی فرض نمازیں نہ بھی ادا کرے تو بظاہر ایک دن کی پڑھی ہوئی ان نمازوں سے ان کی تلافی ہو جانی چاہیے۔

حضرت کاظمی رحمۃ اللہ علیہ نے جواباً فرمایا "ارشادِ ربانی کا منشاء یہ ہے کہ مومن کے ایک صالح عمل کا اجر دس گنا عطا کیا جائے گا۔ اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ ایک ہی فریضہ کی ادائیگی سے اس جیسے دس فرائض کی فرضیت و وجوب اور تکلیف شرعی ساقط ہو جائے گی۔ دوسرا نکتہ آپ نے یہ فرمایا دیا کہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے فضل و احسان کے طور پر اگر کسی عمل کا اجر دس گنا عطا ہو تو وہ اس اصل عمل کے مساوی کب قرار پا سکتا ہے جو خود اپنی اصل میں دس گنا اجر کا موجب ہے۔"

بعض معاصرین سے آپ کا ایک علمی مسئلہ میں اختلاف تھا۔ وہ کہتے تھے کہ حیوانات و بہائم کے ادراک پر حقیقتِ علم کا اطلاق ہوتا ہے اور آپ فرماتے تھے کہ حیوانات و بہائم کے ادراک پر حقیقتِ علم کا اطلاق جائز نہیں البتہ مجازاً جائز ہے۔ اور"

کل شئی یعرفنی انی رسول اللّٰہ" ایسے اطلاقات کو مجاز پر محمول کرتے تھے۔ آپ کی دلیل یہ تھی کہ علمائے اسلام نے علم کی تعریف یہ کی ہے۔" **العلم صفة یتجلی بها المذکور لمن قامت هی به"** اس تعریف میں "**من**" استعمال کیا گیا ہے وہ ذوی العقول کیلئے آتا ہے۔

ایک بار میں نے عرض کیا کہ" **الم تر ان اللّٰہ یسبح له من فی السمٰوٰت والارض والطیر صفت کل، قد علم صلاته وتسبیحه"** (النور،۴۱)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے تمام زمین و آسمانوں اور بالخصوص پرندوں کے ادراک پر علم کا اطلاق کیا ہے۔ اور علم کی وہ تعریف جو ذوی العقول کے ساتھ خاص ہے وہ علماء کی اصطلاح ہے اور اللہ تعالیٰ ان کی اصطلاح کا تابع نہیں ہے کہ اس اطلاق کو مجاز پر محمول کیا جائے۔ حضرت علامہ کاظمی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے جواب میں فی البدایہ فرمایا کہ" قرآن مجید لغتِ عربی پر نازل ہوا ہے" **انا انزلنٰه قرآناً عربیاً"** اور حیوانات و بہائم کے ادراک پر لغتِ عرب اور اس کے عرف میں علم کا ادراک نہیں ہوتا۔ علامہ خیالی نے حاشیہ شرح عقائد میں اس کی تصریح کی ہے۔ اس اعتبار سے یہاں علم کا اطلاق مجازاً ہے۔ ثانیاً تمام آسمان اور زمین والوں میں ذوی العقول (مثلاً انسان) بھی ہیں اور غیر ذوی العقول بھی۔ اللہ تعالیٰ نے ذوی العقول کو ان پر غلبہ دے کر تمام آسمان اور زمین والوں کو بمنزلہ ذوی العقول قرار دے کر ان پر علم کا اطلاق کردیا۔ لہٰذا یہ آیت بابِ تغلیب سے ہے۔" ثالثاً ...... "علم" ...... کا فاعل" **من فی السمٰوٰت "** نہیں بلکہ ضمیر مستتر ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے راجع ہے۔ یعنی" **علم اللّٰہ صلاته و تسبیحه"** بعد میں میں نے دیکھا کہ موخر الذکر دو جواب معتبر تفاسیر میں بھی لکھے ہوئے ہیں۔

پاکستان کے ایک مشہور منطقی استاذ نے ایک مرتبہ خیالی پڑھاتے ہوئے بیان کیا

کہ علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی لکھتے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام کا کذب ممتنع بالذات ہے تو اللہ تعالیٰ کے کلام میں صدق بطریق اولیٰ واجب بالذات اور کذب ممتنع بالذات ہوگا۔ میں نے حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی کی اس عبارت کے بارے میں استفسار کیا تو آپ نے فرمایا" انبیاء علیہم السلام امورِ تبلیغیہ میں جو کچھ فرماتے ہیں وہ ان کا نہیں اللہ تعالیٰ کا کلام ہوتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے کلام میں کذب ممتنع بالذات ہے۔"

دیوبندی مکتبِ فکر کا نظریہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے کلام میں کذب ممکن بالذات اور ممتنع بالغیر ہے۔ اور خیر آبادی حضرات اور مکتبِ فکر بریلی کا نظریہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے کلام میں ممتنع بالذات ہے۔ شیخ اشرف علی تھانوی صاحب اہلِ دیوبند کی ترجمانی کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا کلام لفظی بھی ہے اور نفسی بھی۔ کلامِ نفسی اس کی ذات کے ساتھ قائم ہے۔ اس میں یہ اختلاف ہو نہیں سکتا رہا لفظی تو وہ مخلوق اور حادث اور ممکن ہے اور ممکن کا سلب بھی ممکن ہے۔ لہٰذا امکان کذب ثابت ہوگیا۔ اس اشکال کا جواب میں نے صرف علامہ کاظمی رحمۃ اللہ علیہ سے سنا ہے کہ آپ نے فرمایا" اس دلیل سے ان کا مدعا ثابت نہیں ہوسکتا کیونکہ کلامِ لفظی کے امکان سے یہ لازم آتا ہے کہ وہ جائز العدم ہو۔ اور یہ کذب نہیں ہے امکانِ کذب یہ ہے کہ ایسے کلام کا صدور ممکن ہو جو خلافِ واقع ہو اور کلامِ لفظی کے امکانِ سلب سے یہ امکان لازم نہیں آتا۔

علامہ مفتی محمد حسین نعیمی نے ایک مرتبہ ذکر کیا کہ امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے تفسیرِ کبیر میں لکھا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی حقیقت میں انسانیت سے زائد ایک چیز رکھی گئی ہے۔ آپ نے فرمایا" پھر تو انسان انبیاء علیہم السلام کیلئے ایک جنس بن جائے گا، حالانکہ امام رازی رحمۃ اللہ علیہ بھی انسان کو جنس نہیں مانتے۔" (حقیقت یہ ہے کہ امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے حلیمی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو عام انسانوں کی بہ نسبت زیادہ خصوصیت عطا کی جاتی ہیں)۔

شیخ اشرف علی تھانوی سے کسی نے سوال کیا کہ ایک شخص اپنی بیوی اور بہن کے

ساتھ سفر پر جا رہا تھا۔ راستہ میں ڈاکوؤں نے اس کی بیوی اور بہن کو قتل کر دیا بعد میں وہاں سے ایک ولی کا گزر ہوا اس نے کرامت سے دونوں کو زندہ کر دیا لیکن بیوی کے دھڑ کے ساتھ بہن کا سر لگا دیا اور بہن کے دھڑ کے ساتھ بیوی کا سر لگا دیا اب وہ شخص کس کو بیوی قرار دے گا اور کس کو بہن؟ شیخ تھانوی نے جواب دیا قتل سے ان کا نکاح ختم ہو گیا اب بیوی کا کیا سوال؟ یہی سوال ایک علمی مجلس میں علامہ مفتی محمد حسین نعیمی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت علامہ کاظمی رحمۃ اللہ علیہ سے کیا تو آپ نے فرمایا کہ ''اعتبارِ سر اور چہرے کا کیا جاتا ہے (مفتی صاحب نے تھانوی صاحب والا اعتراض کر دیا کہ قتل سے نکاح تو ختم ہو گیا) آپ نے فرمایا کہ اس سے کیا ہوتا ہے وہ سوال تو اب بھی قائم ہے کہ وہ کس عورت کو بہن قرار دے گا جس کا بدن کے ساتھ سر ہے یا جس کے ساتھ دھڑ ہے۔ قتل سے نکاح ختم ہوا ہے۔ بہن کا رشتہ تو نہیں ٹوٹا اور چونکہ ایک انسان کو دوسرے انسان سے متمیز اور متشخص کرنے والا عضو صرف دماغ ہے۔ اس لیے جس بدن کے ساتھ دماغ قائم ہے وہی اس کی بہن ہوگی۔ مفتی صاحب حیران رہ گئے۔

جی چاہتا تھا کہ یہ ذکر ختم نہ ہو اور حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی جو یادیں دل میں نقش ہیں اور مجالس میں جو آپ سے استفادہ ہو رہا ہے اس کا سلسلۂ ذکر دراز تر ہو جائے لیکن آج کل شب و روز تبیان القرآن (تفسیرِ قرآن) میں مصروف ہوں یہ چند سطریں اظہارِ عقیدت کے طور پر لکھ دی ہیں۔ اللہ تعالیٰ حضرت علامہ کاظمی رحمۃ اللہ علیہ کے فیض کو تا قیامت پائندہ رکھے اور ہم ایسوں کو اپنی زندگی کے اندھیروں میں آپ کی سیرت کے چراغوں سے روشنی حاصل کرنے کی توفیق ارزانی فرمائے۔ حضرت کو رسول اللہ ﷺ سے جو والہانہ عشق تھا اس سے ہم حرماں نصیب لوگوں کو حظ وافر عطا فرمائے۔ اخلاق کی بلندی کے جو انمٹ نقوش آپ نے چھوڑے ہیں آج کے مشائخ کو انہیں اپنانے کی ضرورت ہے۔ اور مسلک کی بے لوث خدمت اور انتھک مطالعہ کی جو میراث آپ نے چھوڑی ہے آج کے علماء کو اسے حرزِ جاں بنانے کی ضرورت ہے۔''

اقوال زریں

- اخلاق اچھا ہونا محبتِ الٰہی کی دلیل ہے۔ (رسول اللہ ﷺ)
- ہمیشہ پاک وصاف رہا کرو رزق میں برکت ہوگی۔ (رسول اللہ ﷺ)
- سب سے بڑی دولت عقل اور سب سے بڑی مفلسی بے وقوفی ہے۔
(حضرت علی رضی اللہ عنہ)



بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باب نمبر 17

سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشنگوئیاں

امامِ اہلسنت علامہ

از علامہ سید احمد سعید کاظمی رحمۃ اللہ علیہ

کی خوبصورت تحریر

ماہنامہ السعید امام اہل سنت نمبر ۲۰۰۹ صفحہ ۲۶ تا ۲۹

افکارِ کاظمی

جلد سوم

علامہ سید حامد سعید کاظمی شاہ

وفاقی وزیر مذہبی امور حکومت پاکستان







ترتیب و تدوین

حافظ طارق جاوید سعیدی

ناشر

ادارہ احمد سعید کنز العلوم پاکستان

عن انس بن مالك قال سمعت رسول الله ﷺ يقول ان امتی لا تجتمع علی ضلا لته فاذرائتهم اختلافا فعليكم بلسواد الاعظم (رواہ ابنِ ماجہ)

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے انھوں نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ''میری امت گمراہی پر جمع نہ ہوگی جب تم اختلاف دیکھو تو سب سے بڑی جماعت کو لازم پکڑو۔'' اس حدیث کو ابنِ ماجہ نے روایت کیا ہے۔

بعض لوگ سوال کیا کرتے ہیں کہ اسلام میں فرقہ بندی کیوں ہوئی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ حضورِ سید عالم جناب محمد رسول اللہ ﷺ نے اس اختلاف وافتراق کی بابت پیشگوئی فرمائی تھی کہ'' **ولذی نفس محمد بیدہ تفترق امتی علی ثلث و سبعین فرقته فواحدة فی الجنة وثنتان وسبعون فی النار**'' اس ذات پاک کی قسم جس کے وسعتِ قدرت میں محمد ﷺ کی جان پاک ہے کہ میری امت تہتر فرقوں میں منقسم ہوجائے گی (ان میں سے) ایک جنت میں جائے گا اور بہتر دوزخ میں جائیں گے۔''

حضور سید عالم ﷺ کی یہ پیشگوئی انسانی فطرت کے عین مطابقت تھی نظامِ کائنات اور رفتارِ زمانہ بھی اس پر شاہد ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ نسلِ انسانی ابتداء چند اصول کو تسلیم کرلیتی ہے پھر مرورِ زمانہ کی وجہ سے اس کے بعض افراد کے خیالات میں ان مانے ہوئے اصول کے متعلق تفاوت اور اختلاف پیدا ہوجاتا ہے بلکہ زیادہ مدت گزرنے کے بعد وہ اختلاف کچھ ایسی نوعیت اختیار کرلیتا ہے کہ اس جماعت میں ایک فرد بھی مسلمہ اصول پر قائم نہیں رہتا۔
لیکن آسمانی اورالہامی اصول اور سچے دین کی امتیازی شان یہ ہے کہ اس دین کو قبول کرنے والوں میں سے ضرور ایک جماعت ایسی ہوتی ہے جو اس کثرتِ اختلاف کے

باوجود بھی حق و صداقت پر قائم رہتی ہے اور فرقہ بندی کا طوفان اس کے پائے استقلال کو ڈگمگا نہیں سکتا۔

مختصر یہ کہ غلط اصول کا ذکر ہی کیا؟ جب ان کی بنیاد ہی باطل پر ٹھہری تو ان میں حقانیت و صداقت کا تصور بھی نہیں ہوسکتا۔ تاریخ عالم گواہ ہے کہ الہامی اور آسمانی تعلیمات میں بھی نسلِ انسانی نے اس قدر اختلاف کیا کہ مدتِ مدید کے بعد ان کو قبول کرنے والوں کی اتنی قلیل تعداد حق و صداقت پر باقی رہی کہ اسے اکہتر یا تہتر حصوں میں سے ایک حصہ کہا جاسکتا ہے انسان کی فطرت کے ساتھ گردشِ کائنات کا نقشہ بھی ہماری نگاہوں کے سامنے ہے۔

رفتارِ زمانہ کے اثر سے زمانیات میں جو تفاوت پایا جاتا ہے اس کا انکار بھی نہیں ہوسکتا زمانیات کے بہت تھوڑے افراد ایسے ہیں جو اس گردش لیل ونہار سے متاثر ہوکر مختلف اور متفاوت نہیں ہوتے اور اپنے پہلے حال پر قائم رہتے ہیں۔

بہر حال اس فطری اصول کے موافق ہادی اعظم نور مجسم ﷺ کی پیشگوئی عقلِ سلیم کے عین مطابق ہے اور واقعات نے ثابت کردیا ہے کہ حضور ﷺ نے اختلافِ امت کے بارے میں جو کچھ فرمایا وہ عین حق وصواب پر مبنی تھا۔

لیکن اس مقام پر جو بات قابلِ غور ہے وہ یہ ہے کہ اس دور میں اختلاف و افتراق میں حق پسند اور نجات پانے والے گروہ کا کیسے پتہ چلے اور کیونکر معلوم ہو کہ موجودہ فرقوں میں حق پر کون ہے۔

اس حدیث مبارک میں حضور اکرم ﷺ نے یہی بات ارشاد فرمائی ہے کہ '' **فاذا رائيتم اختلافا فعليكم بالسواد الاعظم**'' جب تم اختلاف دیکھو تو سب سے بڑی جماعت کو لازم پکڑو۔''

یہاں اختلاف سے مراد اصولی اختلاف ہے جس میں کفر وایمان اور ''ہدایت و ضلالت'' کا فرق پایا جائے فروعی اختلاف ہرگز مراد نہیں کیونکہ وہ تو رحمت ہے جیسا کہ

حدیث شریف میں ہے ''اختلاف امتی رحمتی'' میری امت کا (فروعی) اختلاف رحمت ہے۔''

اس تفصیل کو ذہن میں رکھ کر موجودہ اسلامی فرقوں میں اس بڑے فرقے کو تلاش کیجئے جو باہم اصولاً مختلف نہ ہو اور جس قدر اسلامی فرقے اس کے ساتھ اصولی اختلاف رکھتے ہوں وہ ان سب میں بڑا ہو تو میں دعویٰ سے کہتا ہوں کہ آپ کو ایسا فرقہ اہلسنت والجماعت کے سوا کوئی نہ ملے گا۔ جس میں حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی، قادری، چشتی، سہروردی، نقشبندی، اشعری، ماتریدی سب شامل ہیں۔ یہ سب اہلسنت ہیں اور ان کے مابین کوئی ایسا اصولی اختلاف نہیں ہے جس میں کفر وایمان یا ہدایت وضلالت کا فرق پایا جائے۔

حنفی امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کو اختلافی مسائل میں خطا اجتہادی پر تسلیم کرتے ہیں مگر ان کے مسائل کو (خطاء اجتہادی پر مبنی ہونے کے باوجود) ان کے حق میں ہدایت سے خالی نہیں سمجھتے بخلافِ معتزلہ مرزائیہ روافض وخوارج وغیرہم کے۔ کہ ان میں بعض گروہ ایسے ہیں جو اہلسنت کے نزدیک دائرہ اسلام وایمان سے خارج ہیں اور بعض وہ ہیں کہ ہدایت سے بے بہرہ ضلالت میں مبتلا ہیں۔

لہٰذا اس دورِ پُرفتن میں حدیثِ مذکور کی رو سے سوادِ اعظم جماعت اہل سنت کا حق پر ہونا ثابت ہوا جیسا کہ شیخ عبدالغنی دہلوی رحمۃ اللہ علیہ انجاح الحاجۃ حاشیہ ابنِ ماجہ میں اسی حدیث پر ارقام فرماتے ہیں۔

فھذ الحدیث معیار عظیم لا ھل السنۃ والجماعۃ شکر اللہ سعیھم فانھم السواد لاعظم وذالک لا یحتاج الی برھان فانك لونظرت الی اھل الاھوا باجمعھم مع انھم اثنتان و سبعون فرقنہ لا یبلغ عددھم عشر اھل السنت واما اختلاف المجتھدین فھما بینھم وکذالك

اختلاف الصوفیۃ الکرام و المحدثین العظام والقراء لاعلام فھو اختلاف لا یضلل احدھم الاخر۔

(ابن ماجہ شریف ص۲۳۶ حاشیہ)

یعنی یہ حدیث اہلسنت وجماعت (اللہ تعالیٰ ان کی سعی کو مشکور فرمائے) کیلئے معیارِ عظیم ہے بیشک وہی سوادِ اعظم ہیں اور یہ امر کسی برہان کا محتاج نہیں تمام اہلِ اہواء باوجود یہ کہ وہ بہتر فرقے ہیں، کو اگر تم دیکھو تو وہ اہلسنت کے دسویں حصہ کو بھی نہیں پہنچ سکتے۔ رہا مجتہدین اور اسی طرح صوفیاء کرام اور محدثین عظام اور قراء اعلام کا باہمی اختلاف تو وہ ایسا ہے کہ جس کی وجہ سے کوئی ایک دوسرے کی تضلیل نہیں کرتا۔

یہاں بعض لوگ یہ شبہ پیش کیا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ قرآنِ مجید میں ارشاد فرماتا ہے کہ '' **منھم المومنون و اکثرھم الفاسقون** '' ان میں سے بعض مومن ہیں اور اکثر فاسق ہیں'' نیز ارشاد فرمایا'' **اعملو ال داؤد شکرو قلیل من عبادی الشکور** '' عمل کرو اے آلِ داؤد علیہ السلام شکر کا اور کم ہیں میرے بندوں سے شکر کرنے والے ان کے علاوہ اور آیات سے بھی یہ ثابت ہے کہ مومن اور نیک بندے قلیل ہیں اس لیے یہ حدیث قرآن مجید کے خلاف ہے لہٰذا قابلِ قبول نہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اول تو یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ مدارِ نجات ایمان پر ہے ایمان رکھنے والوں میں بھی ایسے لوگوں کی تعداد کم ہوتی ہے جو حسبِ استطاعت اللہ تعالیٰ کی پوری شکر گزاری کرنے والے اور کامل مومن ہوں۔

دوسرے یہ کہ جن آیتوں میں مومنین کو قلیل اور کفار کو کثیر فرمایا گیا ہے وہاں کفار سے وہ بہتر فرقے بالخصوص مراد نہیں جو مدعی اسلام ہیں بلکہ وہاں کفار سے عام کفار مراد ہیں جن میں اسلام کے مدعی منکر سب شامل ہیں اور یہ امر واضح ہے کہ اسلام کے مدعی اور منکر تمام جہان کے کافروں کے مقابلہ میں سوادِ اعظم اہلسنت وجماعت کو لایا جائے

تو یہ ضرور قلیل ہوں گے اور وہ کفار یقیناً کثیر ہوں گے لہٰذا قرآن و حدیث میں کوئی اختلاف نہیں۔

بعض لوگ کہہ دیا کرتے ہیں کہ دوسری حدیث میں حضور ﷺ نے فرقہ ناجیہ کے متعلق فرمایا ہے کہ" **ما انا علیه واصحابی** " ناجی گروہ وہ ہے جو میرے اور میرے صحابہ کرام کے مسلک پر ہو۔ اس حدیث میں سوادِ اعظم کا ذکر نہیں اس کا جواب ظاہر ہے کہ یہ حدیث سوادِ اعظم والی حدیث کے خلاف نہیں بلکہ اس کو اور واضح کر رہی ہے کیونکہ" **ما انا علیه واصحابی** " والی حدیث میں یہ اجمال باقی ہے کہ حضور ﷺ اور حضور ﷺ کے صحابہ کے موافق کون ہیں؟ تہتر فرقوں میں ہر فرقہ یہ کہہ سکتا ہے کہ میرا عقیدہ اور مذہب حضور ﷺ اور صحابہ کرام کے موافق ہے اس صورت میں ناجی گروہ کا پتہ نہیں چل سکتا" **علیکم باسواد الاعظم** " والی حدیث نے اس اجمال کو دور کر دیا اور اس امر کو واضح کر دیا کہ جتنے فرقے اس امر کے مدعی ہوں گے کہ ہمارا دین و مذہب حضور ﷺ اور صحابہ کرام کے موافق ہے وہ سب جھوٹے ہوں گے میرے دین پر جو جماعت صحیح معنیٰ پر قائم رہے گی وہ سوادِ اعظم ہوگی لہٰذا تم سوادِ اعظم ہی کو لازم پکڑنا۔

اس مقام پر ایک اعتراض کا جواب نہایت ضروری ہے اور وہ یہ کہ حدیث مبارک میں مذکور ہے کہ میری امت میں بہتر فرقے ناری ہوں گے اور ایک ناجی ہوگا حالانکہ اگر ان فرقوں کو دیکھا جائے جو ہمارے نزدیک ناری ہیں تو ان کی تعداد سینکڑوں سے متجاوز ہو چکی ہے پھر اہلسنت کا وہ ایک فرقہ جو ہمارے نزدیک ناجی ہے اس میں بھی متعدد صوفیاء کرام اور علماء متکلمین وغیرہم میں بہت سے گروہ ہیں حالانکہ ہم ان سب کو ناجی سمجھتے ہیں اس حدیث سے تو یہ ثابت ہے کہ ناجی فرقہ صرف ایک ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ حدیث مبارک میں بہتر ناری فرقوں سے وہ فرقے مراد ہیں جو کفر والحاد اور گمراہی و بے دینی کا سرچشمہ اور جڑ ہیں اسی طرح ایک ناجی گروہ سے

وہ نجات پانے والا فرقہ مراد ہے جو اسلام و ایمان ہدایت و رحمت کا منبع اور اصل و بنیاد ہے۔ ظاہر ہے کہ ایک جڑ سے کئی شاخیں نکلتی ہیں مگر ان کی اصل وہی جڑ ہے جس سے وہ نکلتی ہیں شاخوں کی کثرت سے جڑوں کی کثرت لازم نہیں آتی۔ جیسے ایک قبیلے میں کئی خاندان ہوتے ہیں اور ہر خاندان میں کئی گھر اور ہر گھر میں کئی افراد اسی طرح گمراہی کی بہتر جڑوں اور ضلالت کے بہتر قبیلوں سے سینکڑوں کیا ہزاروں بلکہ لاکھوں کی تعداد میں بھی اگر شاخیں اور خاندان و افراد پیدا ہو جائیں تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ان کی اصل اور قبیلے بھی اتنی ہی تعداد میں ہوں مختصر یہ کہ جس طرح گمراہی کی بہتر جڑوں سے سینکڑوں ہزاروں شاخیں پیدا ہو گئیں (جنھیں فرقوں میں شمار کر لیا گیا) اسی طرح ہدایت کی ایک جڑ سے کئی شاخیں پیدا ہوئیں۔ مگر یاد رکھئے ضلالت کی جڑ کی ہر شاخ ضلالت ہوگی اور ہدایت کی جڑ سے جو شاخیں نمودار ہوں گی وہ سب ہدایت قرار پائیں گی۔

اسی لیے اللہ نے قرآن مجید میں ارشاد فرمایا" **والذین جاهدو افینا لنهدینهم سبلنا** " جن لوگوں نے ہماری راہ میں جہاد کیا (عام اس سے کہ وہ جہاد جانی ہو، یا مالی، جسمانی ہو یا روحانی ہو، جہادِ اصغر ہو، یا جہادِ اکبر ہو) ہم انہیں اپنی راہوں کی طرف رہنمائی فرمائیں گے۔ اس آیہ کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے سبیل کی بجائے سبل فرمایا یعنی یہ نہیں فرمایا کہ ہم انہیں اپنی راہ کی طرف رہنمائی فرمائیں گے بلکہ یہ ارشاد فرمایا کہ ہم انہیں اپنی راہوں کی طرف رہنمائی فرمائیں گے۔" معلوم ہوا کہ سبیل خداوندی ایک نہیں بلکہ متعدد ہیں اور وہ وہی ہیں جن کا مبداء اور مرکز فرقہ ناجیہ السواد الاعظم اہلسنت و جماعت ہو، جیسے، حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی، چشتی، قادری، سہروردی، نقشبندی، ماتریدی، اشعری وغیرہم۔ ثابت ہوا کہ اس اختلاف و افتراق کے دور میں نجات کا ذریعہ صرف یہ ہے کہ حدیث مبارکہ" **علیکم بالسواد الاعظم** " کے مطابق مسلمانوں کے سب سے بڑے گروہ اہلسنت و جماعت کو لازم پکڑ لیا جائے

اوراس کے علاوہ مرزائی، رافضی، نیچری، وہابی، غیر مقلد وغیرہم سب سے علیحدگی اختیار کی جائے۔ "**واللہ الموافق للهد ایته وھا الموصل الٰی سبیل الرشاد۔**"



بسم اللہ الرحمن الرحیم

باب نمبر 18

رحمتِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم

امامِ اہلسنت علامہ

از علامہ سید احمد سعید کاظمی رحمۃ اللہ علیہ

ماہنامہ السعید امام اہل سنت نمبر ۲۰۰۲ صفحہ ۳۵ تا ۳۶

امامِ اہلسنت علامہ سید احمد سعید کاظمی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں نہایت اختصار اور جامعیت کے ساتھ چند کلمات آیہ کریمہ کے بارے میں عرض کروں گا تاکہ وقت کی گنجائش کے مطابق کلام کو مربوط اور بامعنیٰ انداز میں پیش کرسکوں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآن مجید میں ارشاد فرمایا" **وما ارسلنٰك الا رحمة اللعٰلمین**"

ترجمہ: **وما ارسلنٰك** میں "**ما**" نافیہ ہے۔ نفی کے بعد "**الا**" ہو تو یہ اثبات کیلئے آتا ہے اور یہ بات نہایت قابلِ توجہ ہے کہ کلام میں نفی کے بعد اثبات پایا جائے تو اس سے "حصر" کا مفہوم پیدا ہوتا ہے۔ اس کو اس طرح سمجھئے میں آپ حضرات کی خدمت میں عرض کروں کہ کسی شخص نے صاف کپڑے نہیں پہنے سوائے عبداللہ کے، یا میں کہوں کہ یہاں کوئی سرکاری ملازم نہیں سوائے سالم کے۔ نفی کے بعد اثبات آرہا ہے۔ اگر کلام صحیح ہے، اگر بات درست ہے تو "حصر" لازم آئے گا اور اگر "حصر" نہیں ہے، کوئی دوسرا بھی صاف کپڑے زیب تن کیے ہوئے ہے، یا کوئی اور شخص بھی سرکاری ملازم یہاں موجود ہے تو کلام جھوٹا قرار پائے گا اب بات ہو رہی ہے قرآن مجید کی، قرآن غلط نہیں ہوسکتا اس لیے جب قرآن میں نفی کے بعد اثبات آئے گا تو "حصر" لازم آئے گا۔ جیسے ہم کلمہ پڑھتے ہیں "**لا اله**" کوئی معبود برحق نہیں، پہلے نفی آگئی اس کے بعد کہا "**الا الله**" سوائے اللہ کے۔ یہ اثبات ہوا۔ تو اللہ تعالیٰ کے سوا ہر ایک سے الوہیت کی نفی ہوگئی۔ الوہیت صرف اللہ کیلئے ثابت ہے کوئی دوسرا الٰہ نہیں ہوسکتا۔ تو اللہ تعالیٰ نے جب "**وما ارسلنک**" ارشاد فرمایا تو اس میں "**ک**" ضمیر خطاب ہے اور اس کا مصداق اور مخاطب صرف اور صرف حضور اکرم نورِ مجسم ﷺ ہیں۔ اب حصر کی صورت میں ترجمہ کریں تو دو باتیں سامنے آئیں گی۔ یا تو یہ کہئے کہ اے محبوب! میں نے تجھے رحمت بنا کر بھیجا۔ تو صرف رحمت ہے، تو اگر رسول ہے، اگر نبی ہے، اگر ہادی ہے، اگر رؤف ہے، اگر کریم ہے، تو جو کچھ بھی ہے اے محبوب! ہر صورت میں تو رحمت ہی ہے۔

یا اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اے محبوب! ہم نے صرف تجھے رحمت بنا کر بھیجا، تیرے سوا کوئی ہستی کوئی ذات ایسی نہیں جس کو یہ شرف ملا ہو، یہ امتیاز تیرا ہے، یہ خصوصیت تیری ہے کہ "**العٰلمین**" کیلئے، تمام جہانوں کیلئے، اس ساری کائنات کیلئے تو رحمت ہے، ہم نے بس تجھی کو یہ اعزاز بخشا ہے۔

ایک بات مزید سمجھنے کی ہے کہ اس آیہ کریمہ میں لفظِ "رحمت" عربی زبان کے قواعد کی رو سے مصدر ہے اور مصدر کا حمل ذات پر نہیں ہوتا۔ سوائے اس کے کہ مبالغہ مقصود ہو۔ ہاں کبھی مجازاً مصدر کا استعمال اسمِ فاعل ہے جس کا مطلب ہے "رحمت کرنے والا" بہر حال اس آیہ کریمہ کا مطلب یہ ہوا کہ "اے محبوب! ہم نے آپ کو تمام جہانوں کیلئے صرف رحمت کرنے والا بنا کر بھیجا ہے۔" اب اس حصر کا فائدہ کیا ہوگا؟ یہ "رحمۃ" کے لفظ کو سمجھنے پر منحصر ہے۔" ایک بات تو آپ نے سمجھ لی کہ "رحمت" کے معنیٰ "راحم" کے یعنی رحمت کرنے والا کے ہیں۔" اب دوسری بات یہ سمجھئے کہ ترکیبِ نحوی کے لحاظ سے اس کے معنیٰ کیا ہوں گے؟ بعض علمائے نحو نے کہا کہ یہ مفعول "**له**" ہے اور بعض نے کہا یہ ضمیر خطاب سے حال ہے۔ "حال" کے معنیٰ ہیں کہ وہ ذوالحال کی ہیئت بیان کرتا ہے۔ بالفاظِ دیگر فاعل یا مفعول کا حال بیان کرنے والا کلمہ حال کہلاتا ہے، اب اگر "رحمت" حال ہے تو اس کے معنیٰ اور ہوں گے اور اگر مفعول "**له**" ہے تو اس کے معنیٰ اور ہوں گے۔ لفظِ "رحمت" کو مفعول لہ سمجھا جائے تو آیہ کریمہ کا مطلب ہوگا "پیارے محبوب! ہم نے آپ کو کسی اور سبب سے نہیں بھیجا، بلکہ آپ کے بھیجنے کا سبب صرف یہ ہے کہ آپ تمام جہانوں کیلئے رحمت کرنے والے ہیں اور اگر "رحمت" کو حال قرار دیا جائے تو آیہ کریمہ کا ترجمہ ہوگا "اے محبوب! ہم نے آپ کو اور کسی حال میں نہیں بھیجا، صرف اس حال میں بھیجا ہے کہ آپ سارے جہانوں پر رحم فرمانے والے ہیں۔" اس تمام گفتگو کا مطلب یہ نکلا کہ "رحمت" مصدر اسم فاعل کے معنیٰ میں ہے جو مفعول لہ بھی ہوسکتا ہے اور حال بھی۔ لیکن دونوں

صورتوں میں مفاد ایک ہے اور یہ کہ اے محبوب! تیرے بھیجنے کا فقط ایک ہی حال ہے کہ میں نے تجھے سارے عالم کیلئے راحم بنا کر بھیجا ہے یا یہ کہ تو سارے عالموں پر رحم کرنے والا ہے۔ اسی سبب سے میں نے تجھے بھیجا ہے کہ تو راحم ہے۔

یہاں یہ بھی پیشِ نظر رہے کہ سرکار ''العٰلمین'' کیلئے رحم فرمانے والے ہیں، کوئی شے اس کائنات کی کوئی چیز ''العٰلمین'' سے باہر نہیں، جیسے ارشاد ہوا '' **الحمد لله رب العٰلمین**'' سب تعریفیں تمام جہانوں کے رب کیلئے ہیں۔'' جن کا وہ رب ہے ان کیلئے سرکار رحمت فرمانے والے ہیں۔ جب کوئی چیز اللہ تعالیٰ کی ربوبیت سے باہر نہیں تو آقا ﷺ کی رحمت سے باہر کیسے ہوسکتی ہے اور رب کہتے ہیں تربیت کرنے والے کو۔ تربیت کا مطلب ہے ''پالنا'' اور پالنے کیلئے رحمت لازمی ہے، ماں بچے کو نہیں پال سکتی، اس کیلئے اپنی نیند خراب نہیں کرسکتی، اس کے آرام کیلئے خود تکلیف نہیں اٹھا سکتی جب تک بچے کیلئے رحمت کا جذبہ اس کے اندر موجزن نہ ہو۔ انسان تو درکنار، حیوان بھی، چرند، پرند اور درند بھی اپنے بچوں کو اس وقت پال سکتے ہیں جب ان کے اندر بچوں کیلئے رحمت ہو۔ اپنی غذا، اپنا شکار بچوں کو تبھی کھلائیں گے نا۔

پتہ چلا کہ ''رحمت'' کے بغیر تربیت نہیں ہوسکتی۔ اللہ تعالیٰ گویا یہ فرماتا ہے کہ ربوبیت میری صفت ہے اور رحمت بھی میری صفت ہے، اے محبوب! اگرچہ رحمت بھی میری صفت ہے، میں رحمٰن ہوں، میں رحیم ہوں لیکن میری اس صفتِ رحمت کا مظہر آپ ہیں، میں نے اپنی ربوبیتِ عامہ کو اپنی رحمتِ عامہ میں ظاہر کیا، میری رحمتِ عامہ کا مظہرِ اتم آپ ہیں، میں نے اپنی رحمت کو آپ کی صورت میں ڈھال دیا ہے اس لیے میں نے آپ کو ''رحمت'' قرار دیا ہے اور چونکہ آپ میری صفت کا مظہر ہیں اس لیے آپ تمام کائنات، ساری خدائی پر، سب عالموں پر رحم کر رہے ہیں۔ اے محبوب! جس کا میں رب ہوں اس پر آپ رحمت فرمانے والے ہیں۔

پتہ یہ چلا کہ آپ کی رحمت کے دائرے سے کوئی باہر نہیں، وہ انسان ہوں یا

حیوان ہوں، جن ہوں یا فرشتے ہوں، وہ عالمِ تحت ہو یا عالمِ فوق، عالمِ ظاہر ہو یا عالمِ باطن ہو، وہ عالمِ خلق ہو یا عالمِ امر ہو، جواہر ہوں یا اعراض ہوں، لوح و قلم ہوں یا عرش و کرسی ہوں میرے آقا ﷺ سب پر رحم فرمانے والے ہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جس کو رحمت کی ضرورت ہوتی ہے، احتیاج ہوتی ہے وہ محتاج ہوتا ہے اور یاد رکھئے جس کی حاجت ہوتی ہے وہ پہلے ہوتا ہے او جو محتاج ہوتا ہے وہ بعد میں ہوتا ہے، ہمیں سانس لینے کیلئے ہوا کی احتیاج تھی، ہم پیاس بجھانے کیلئے پانی کے محتاج تھے، ہمیں رہنے، بسنے، چلنے کیلئے زمین کی احتیاج تھی، تو ہم پیدا بعد میں ہوئے۔ ہوا، پانی، زمین وغیرہ پہلے موجود تھیں، بچہ بعد میں پیدا ہوتا ہے اس کی ماں کی چھاتی میں دودھ پہلے اتر آتا ہے، بچہ سکول میں پڑھنا بعد میں شروع کرتا ہے اس کا استاد اور کتابیں پہلے سے مہیا کیے جاتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ جس کی احتیاج ہو وہ پہلے ہوتا ہے اور جو محتاج ہو وہ بعد میں ہوتا ہے۔ پتہ یہ چلا کہ ساری کائنات پر رحمت کرنے والی ذات میرے آقا ﷺ کی ہے تو تمام کائنات بعد میں ہے اور سرکار ﷺ پہلے ہیں۔



بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باب نمبر 19

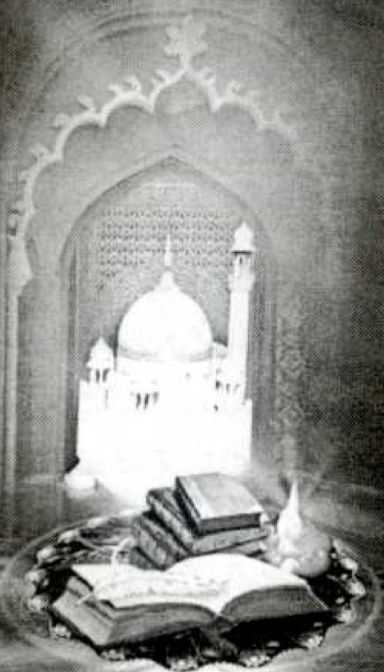
تصریح المقال فی حل امر لا اھلال

ایصالِ ثواب کیلئے جانور ذبح کرنا، علمی تحقیق

از علامہ سید احمد سعید کاظمی رحمۃ اللہ علیہ

ماہنامہ السعید امام اہل سنت نمبر ۲۰۰۲ صفحہ ۴۰ تا ۵۰

مرحبا کاظمی



امین ملت حامد سعید کاظمی

باہتمام
حافظ طارق جاوید سعیدی

امام اہلسنت علامہ سید احمد سعید کاظمی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں جانوروں اور زراعت میں کسی جانور یا حصۂ زراعت کی تعیین کے فعل کا جائز یا ناجائز ہونا۔ معین کرنے والے کی نیت اور اعتقاد پر موقوف ہے۔ اور اس مقرر کردہ جانور کے گوشت کی حلت و حرمت کا مدار، ذابح کی نیت، حال اور قول پر ہے۔

اگر مقرر کرنے والا بزرگانِ دین کو (معاذ اللہ) مستقل بالذات، متصرف فی الامور (نعوذ باللہ) انہیں مستحقِ عبادت مانتا ہے، اور اس کا یہ اعتقاد ہے کہ جو جانور یا حصۂ زراعت کسی بزرگ کے نامزد کر دیا گیا وہ عند اللہ کسی دوسرے مصرف میں صرف کرنا گناہ ہے۔ اور اس بزرگ کے علاوہ کسی دوسرے کیلئے اس کا استعمال شرعاً حرام اور موجبِ ضرر ہے۔ تو فعل مذکور ایسا ہی کفر و شرک قرار پائے گا جیسا کہ زمانۂ جاہلیت میں مشرکینِ عرب، بحیرہ، سائبہ، وغیرہ کے نام سے جانور اپنے اصنام والہہ کیلئے نامزد کر کے انہیں اپنی طرف سے حرام قرار دے دیا کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں انہیں "مفتری، کذاب قرار دیا اور ان کی سخت مذمت فرمائی البتہ محض اس اعتقاد اور نامزدگی کے باعث وہ جانور حرام نہیں ہوں گے۔ جب تک کہ ان کا ذابح کوئی مرتد یا مشرک و کافر غیر کتابی نہ ہو یا انہیں غیر اللہ کے نام پر ذبح نہ کیا جائے یا ان کا خون بہانے سے غیر اللہ کی تعظیم و تقرب مقصود نہ ہو۔

ہاں اس میں شک نہیں کہ عقیدۂ مذکور کے ساتھ مقرر شدہ جانوروں کو اگر مقرر کرنے والا شخص اسی عقیدہ کفریہ کی حالت میں اللہ کے نام پر بھی ذبح کر دے، تب بھی ذبیحہ مرتد ہونے کی وجہ سے اور" **اراقة الدم لتعظيم غير الله**" کے باعث ان کا گوشت حرام ہوگا، حلال نہیں ہو سکتا۔

لیکن اس میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ مسلمان کلمہ گو، اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان رکھنے والوں کی طرف بلا دلیل ایسے عقائدِ کفریہ منسوب کر کے معاذ اللہ انہیں کافر و مرتد بنانا مسلمان کا کام نہیں۔ مومن کو کافر و مرتد قرار دینے والا خود

کفر و ارتداد کے وبال میں مبتلا ہے" **نسال الله السلامة عن هذه البلية**۔"

شرک کے معنیٰ ہیں" **الاشراك هو اثبات الشريك في الالوهية بمعنىٰ وجوب الوجود كما للمجوس او بمعنىٰ استحقاق العبادة كما لعبدة الاصنام**" (شرح عقائد نفسی) یعنی شرک کرنا وہ اثبات شریک ہے الوہیہ میں بمعنیٰ وجوب وجود، جیسا کہ مجوس کیلئے ہے یا بمعنیٰ استحقاق عبادت جیسا کہ بتوں کی عبادت کرنے والوں کیلئے ہے۔

خلاصہ یہ کہ شرک کے معنیٰ ہیں اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو الٰہ ماننا، اور الوہیت صرف وجوب وجود یا استحقاق عبادت کا نام ہے۔ لہٰذا جب تک کسی غیر اللہ کو واجب الوجود یا مستحق عبادت نہ مانا جائے اس وقت تک شرک نہیں ہو سکتا۔ واجب الوجود اسے کہتے ہیں جس کا ہونا عقلاً ضروری ہو، اور نہ ہونا عقلاً محال ہو۔

مجوسی اپنے اعتقاد میں دو واجب الوجود مانتے ہیں ایک یزدان (خالقِ خیر) اور دوسرا اہرمن (خالقِ شر) وہ مشرک ہیں۔ اس لیے انھوں نے الوہیت، بمعنیٰ وجوب وجود کو غیر اللہ کیلئے ثابت کیا۔ اور بتوں کی عبادت کرنے والے اپنے باطل معبودوں کو واجب الوجود تو نہیں مانتے، لیکن انہیں مستحقِ عبادت مان کر الوہیت کے دوسرے معنیٰ (استحقاقِ عبادت) ان کیلئے ثابت کرتے ہیں، لہٰذا دونوں مشرک ہوئے۔ یہاں اتنی بات ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ اللہ کی ہر صفت ذاتی اس کے استحقاقِ عبادت کا مناط و مدار ہوتی ہے۔ جس کا کسی کیلئے ثابت کرنا، استحقاقِ عبادت اور الوہیت کا ثابت کرنا ہے، اور ظاہر ہے، جو صفت استحقاقِ عبادت کا مناط ہے، خواہ وہ علم ہو یا قدرت، تصرف ہو یا خالقیت ضروری ہے کہ ذاتی اور مستقل ہو ورنہ افرادِ ممکنات کا (معاذ اللہ) مستحقِ عبادت ہونا لازم آئے گا۔ کیونکہ عطائی، غیر مستقل، حادثِ صفات، افرادِ مخلوق میں پائی جاتی ہیں۔ معلوم ہوا کہ استحقاقِ عبادت کیلئے صفاتِ مستقلہ لازم ہیں۔ چونکہ

صفاتِ مستقلہ مناط استحقاقِ عبادت ہیں۔ اس لیے ان کا وجود، وجودِ الوہیت کو مستلزم ہوگا۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ استحقاقِ عبادت کیلئے صفاتِ مستقلہ لازم ہیں اور صفاتِ مستقلہ کیلئے استحقاقِ عبادت لازم ہے کسی کو مستحقِ عبادت کہنا اس کیلئے استقلالِ ذاتی کو ثابت کرنا ہے اور کسی کو مستقل بالذات ماننا اسے مستحقِ عبادت قرار دینا ہے۔

اس بیان کی روشنی میں یہ امر بخوبی واضح ہوگیا کہ کسی مسلمان پر ہرگز حکمِ شرک نہیں لگ سکتا۔ تاوقتیکہ وہ غیر اللہ کیلئے وجوبِ وجود یا کوئی صفتِ مستقلہ مناط استحقاقِ عبادت ثابت نہ کرے۔ یہی وجہ ہے کہ جمہور متکلمین نے معتزلہ کو مشرک قرار نہیں دیا۔ حالانکہ وہ بندے کو خالقِ افعال مان کر اس کیلئے صفتِ خالقیت ثابت کرتے ہیں جو صفتِ مستقلہ ہونے کی صورت میں مناط استحقاقِ عبادت ہے۔ لیکن چونکہ وہ بندے کو مستقل بالذات خالق نہیں مانتے اس لیے انہیں مشرک قرار نہیں دیا گیا۔ ثابت ہوا کہ اولیاء کرام کو غیر مستقل متصرف ماننے والے اور ان کے اختیاراتِ علم وقدرت تصرفات کو مقید باذن الٰہ تسلیم کرنے والے مسلمان ہرگز ہرگز کافر ومشرک نہیں، انہیں مشرک کہنے والا خود مشرک ہے۔ لہٰذا یہ حکمِ شرک یقیناً مفتیانِ شرک کی طرف لوٹے گا۔

" تخرج الفتنه منهم وفيهم تعود"

قرآنِ کریم اور احادیثِ صحیحہ کی رو سے مومن کے حق میں بدگمانی حرام ہے، فقہاء کرام نے بھی بالخصوص ناجائز قرار دیا ہے۔ **(قال الله تعالٰی ' یایها الذین اٰمنو اجتنبوا کثیرا من الظن ان بعض الظن اثم ''** (الحجرات، پ۲۶) ''اے ایمان والوا کثر گمانوں سے بچو۔ بیشک بعض گمان گناہ ہے۔

حدیث پاک میں ہے کہ حضور اکرم نورِ مجسم فخرِ عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا'' **یاکم والظن فان الظن اکذب الحدیث''** بدگمانی سے دور رہو، بدگمانی بدترین جھوٹ ہے۔

دوسری حدیث میں ہے'' **افلا شققت عن قلبه حتی تعلم اقالها ام لا''** (رواہ مسلم) تو نے اس کے دل کو چیر کر کیوں نہ دیکھ لیا کہ تجھے معلوم ہو جاتا کہ اس نے (دل سے) کہا ہے یا نہیں۔

سیدی عبدالغنی نابلسی شرح طریقہ محمدیہ میں نقال ہیں'' **قال الا مام سید احمد رزوق انما ینشاء الظن الخبیث عن القلب الخبیث''** امام سیدی احمد رزاق نے فرمایا'' خبیث گمان صرف خبیث دل میں پیدا ہوتا ہے۔ پاک دلوں میں ناپاک گمان کی گنجائش نہیں ہوتی۔

شرح رہبانیہ، درمختار وغیرہا میں اس مسئلہ کی ذیل میں ہے'' **انا لا نسئی الظن بالمسلم ان یتقرب الادمی بهذا لنهر''** ہم کسی مسلمان کے حق میں ہرگز بدگمانی نہیں کرتے کہ وہ اس فعلِ ذبح کے ذریعہ کسی آدمی کا تقرب حاصل کرتا ہے۔

ردالمختار جلد ۵ صفحہ ۲۱۸ میں اس کے تحت ہے'' **ای علٰی وجه العبادة لانه المكفر وهذا بعيد من حال المسلم''** یعنی تقرب علٰی وجہ العبادہ، اس لیے کہ تقرب علٰی وجہ العبادہ ہی موجب کفر ہے اور ایسا تقرب مسلمان کے حال میں بہت بعید ہے۔

خوب یاد رکھئے مسلمان، اولیاء کرام و بزرگانِ دین کے ساتھ محبت وعقیدت رکھتے ہیں۔ مگر انہیں الٰہ نہیں مانتے، کسی قسم کا استقلال ذاتی ان کیلئے ثابت نہیں کرتے نہ انہیں مستحقِ عبادت جانتے ہیں، نہ واجب الوجود، محض عباد اللہ الصالحین سمجھتے ہیں اور جو جانور یا حصۂ زراعت یا کوئی چیز از قسم نقد وجنس وغیرہ ان کیلئے مقرر کرتے ہیں، اس کو ان کا ہدیہ جانتے ہیں اور وصال یافتہ بزرگوں کیلئے ایصالِ ثواب کی نیت کرتے ہیں۔ اسی قصد ونیت کے ساتھ اگر وہ کسی جانور یا غیر جانور کو بزرگانِ دین کی طرف منسوب کر کے ان کے نام پر اسے مشہور بھی کر دیں تب بھی جائز ہے اور وہ چیز حلال

اور طیب ہے اور اسے " **ماأهل به لغير الله** " کے تحت لا کر حرام قرار دینا باطل محض اور گناہِ عظیم ہے۔

عہدِ رسالت میں صحابہ کرام رسول کریم ﷺ کی خدمت میں کھجوروں کے درخت اور دودھ پینے کے جانور پیش کرتے تھے جن کا ذکر احادیثِ صحیحہ میں مفصل موجود ہے اور اس میں بھی کسی مسلمان کو شک کرنے کی گنجائش نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے محبوبوں کی خوشنودی رحمت و برکت کا موجب اور دفعِ بلیات و آفات کا باعث ہے۔

اسی طرح بعد از وفات بھی ایصالِ ثواب کے طور پر بزرگانِ دین کیلئے کسی چیز کا مقرر کرنا عہدِ رسالت میں پایا گیا ہے۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے حضور نبی کریم ﷺ سے عرض کیا یا رسول " **ان ام سعد ماتت فای الصدقة افضل؟ قال الماء فحفر بيرا وقال هذا لام سعد** " سعد کی ماں کا انتقال ہو گیا کون سا صدقہ بہتر ہوگا؟ فرمایا " پانی بہتر رہے گا تو انھوں نے ایک کنواں کھدوا دیا اور کہہ دیا کہ یہ کنواں سعد کی ماں کا ہے۔"

اگر کسی وصال یافتہ بزرگ کیلئے کسی چیز کا نامزد کرنا موجب حرمت قرار دیا جائے تو معاذ اللہ وہ کنواں جو حضرت ام سعد رضی اللہ عنہا کے نام پر مشہور ہو گیا حرام اور اس کا پانی نجس قرار پائے گا۔ (العیاذ باللہ)

اب اصل مسئلہ کی طرف آیئے، بزرگوں کے نام پر جو جانور وغیرہ مشہور کیے جائیں اگر ان جانوروں پر اولیاء اللہ کیلئے نذر شرعی مانی جائے جو حقیقۃً عبادت ہے تو ایسا " ناذر " مرتد ہے " **لانه ا شرك بالله باثبات الالوهية لغيره تعالىٰ** " کیونکہ اس نے غیر اللہ کیلئے الوہیت ثابت کرنے کی وجہ سے شرک کیا۔ لیکن اس کے اس شرک کی وجہ سے وہ جانور حرام نہیں ہوگا جب تک کہ وہ اسے " **بقصدِ تقرب لغير الله** " ذبح نہ کرے، کما سیاتی۔

اور اگر اولیاء کی نذر محض نذر لغوی یا عرفی، بمعنیٰ ہدیہ و نذرانہ ہو، یا وصال یافتہ

بزرگ کیلئے بقصدِ ایصالِ ثواب کوئی جانور وغیرہ نامزد کر دیا اور نذرِ شرعی اللہ کیلئے ہو تو یہ فعل شرعاً جائز اور باعثِ خیر و برکت ہے۔

نذر لغیر اللہ کا مدار " ناذر " کی نیت پر ہے۔ اگر ناذر نے تقرب لغیر اللہ کا قصد کیا ہے اور متصرف فی الامور، اللہ تعالیٰ کی بجائے کسی مخلوق کو مانا ہے تو یہ نذر کفر و شرک ہے۔ اور اگر اس کا ارادہ تقرب الی اللہ ہے اور بزرگانِ دین کو ثواب پہنچانا ہے تو ایسی " نذر للاولیاء " قطعاً جائز ہے اور اس کا نذر ہونا مجازاً ہے کیونکہ نذرِ حقیقی اللہ کیلئے خاص ہے۔

فتاوی ابی اللیث میں ھے " الناذر لغير الله ان قصد بالنذر التقرب الیٰ غير الله وظن انه يتصرف فی الامور كلها دون الله فنذره حرام باطل وار تداده ثابت وان قصد بالنذر التقرب الیٰ الله وايصال الثواب للاولياء ويعلم انه لا تتحرك ذرة الا باذن الله ويجعل الاولياء وسائل بينه وبين الله فی حصول مقاصد فلا حرج فيه وذبيحته حلال طيب " غیر اللہ کی نذر ماننے والے نے اگر اپنی نذر سے غیر اللہ کی طرف تقرب کا ارادہ کیا اور یہ گمان کیا کہ تمام امور میں میت ہی متصرف ہے نہ اللہ تعالیٰ، تو اس کی نذر حرام اور باطل ہے اور اس کا مرتد ہونا ثابت ہے اور اگر اس نے اس نذر سے تقرب الی اللہ کا ارادہ کیا اور اولیاء اللہ کو ثواب پہنچانے کی نیت کی اور وہ یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اذن کے بغیر کوئی ذرہ متحرک نہیں ہوتا اور وہ اولیاء اللہ کو اپنے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان وسائل قرار دیتا ہے تاکہ اس کے مقاصد حاصل ہو جائیں تو اس میں کوئی حرج نہیں اور اس کا ذبیحہ حلال و طیب ہے۔"

یہاں یہ بات ضرور یاد رہے کہ اس جگہ تقرب سے مطلق تقرب مراد نہیں بلکہ تقرب علیٰ وجہ العبادہ مراد ہے۔ جیسا کہ ہم شامی جلد خامس سے ابھی یہ عبادت نقل کر

چکے ہیں" قوله انه يتقرب الى الادمى اى علىٰ وجه العبادة لانه المكفر وهذا بعيد من حال المسلم" یعنی مطلق تقرب الی الادمی موجب کفر نہیں بلکہ صرف تقرب علی وجہ العبادہ موجب کفر ہے۔"

نذرِ اولیاء کے متعلق حدیقہ ندیہ میں سیدی عبدالغنی نابلسی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں" **والنذر لهم بتعليق ذالك علىٰ حصول شفاء اوقدوم غائب فانه مجاز عن الصدقة علىٰ خادمين بقبورهم"** اولیاء اللہ کیلئے جو نذر مانی جاتی ہے اور اسے مریض کے شفا حاصل ہونے یا غائب کے آنے پر معلق کیا جاتا ہے تو وہ نذر مجاز ہے اس سے اولیاء اللہ کی قبور پر خادمین کیلئے صدقہ کرنا مراد ہوتا ہے۔"

طبقات کبریٰ جلد دوم، صفحہ ۶۸ میں امام شعرانی رحمۃ اللہ علیہ شاذلی رحمۃ اللہ علیہ سے ناقل ہیں" **كان رضى الله تعالىٰ عنه يقول رايت النبى ﷺ فقال اذا كان لك حاجة واردت قجائها فانذر للنفيسة الطاهرة ولو فلسافان حاجتك تقضىٰ"** امام شعرانی رحمۃ اللہ علیہ نے سیدی شاذلی رحمۃ اللہ علیہ کا قول نقل فرمایا کہ وہ فرماتے تھے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا حضور ﷺ فرماتے تھے جب تجھے کوئی حاجت درپیش ہو اور تو اس کے پورا ہونے کا ارادہ کرے تو سیدہ نفیسہ طاہرہ کی نذر مان لے اگرچہ ایک پیسہ ہی کیوں نہ ہو بے شک تیری حاجت پوری ہو جائے گی۔

معلوم ہوا کہ قضاء حاجات کیلئے اولیاء کی نذر ماننا جائز ہے۔ جبکہ کسی قسم کا فساد عقیدہ نہ ہو۔ اسی طرح تفسیرات احمدیہ صفحہ ۲۹ میں تحت آیہ کریمہ " وما اہل بہ لغیر اللہ" مرقوم ہے: ترجمہ " اور یہاں سے معلوم ہوا کہ بے شک وہ گائے جس کی نذر اولیاء کیلئے مانی جائے جیسا کہ ہمارے زمانے میں رسم ہے حلال وطیب ہے۔

جو لوگ نذرِ اولیاء کو شرک قرار دیتے ہیں انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اس نذر سے

مراد نذرِ شرعی نہیں بلکہ اسے بر بنائے عرف نذر کہا جاتا ہے اور اس ایصالِ ثواب اور ہدیہ کو نذر کہنا شرعاً جائز ہے، جیسا کہ طبقاتِ کبریٰ جلد دوم، صفحہ ۶۸ للامام الشعرانی رحمۃ اللہ علیہ سے نقل پیش کی گئی ہے اور تفسیراتِ احمدیہ کا حوالہ بھی مرقوم ہے۔

آخر میں حضرت شاہ رفیع الدین کی عبارت مزید نقل کی جاتی ہے، وہ اپنے" رسالہ نذر" میں تحریر فرماتے ہیں" نذرے کہ اینجا مستعمل میشود نہ بر معنی شرعی است چہ عرف آنست کہ آنچہ پیشِ بزرگان می برند نذر و نیاز مے گویند" ترجمہ: جو نذر کہ اس جگہ مستعمل ہوتی ہے وہ اپنے معنیٰ شرعی پر نہیں بلکہ معنیٰ عرفی پر ہے اس لیے کہ جو کچھ بزرگوں کی بارگاہ میں لے جاتے ہیں اس کو نذر و نیاز کہتے ہیں۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدثِ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ جو معترضین کے نزدیک مسلم علمائے راسخین سے ہیں۔ انفاس العارفین صفحہ ۴۵ میں تحریر فرماتے ہیں" حضرت ایشاں در قصبہ ڈاسنہ بزیارت مخدوم" اللہ دیا" رفتہ بودند شب ہنگام بود در آں محفل فرمودند، مخدوم ضیافت ما می کنند وی گویند چیزے خوردہ روید توقف کردند تا آنکہ زنے بیاید، طبق برنج و شرینی برسر، وگفت نذر کردہ بودم، کہ اگر زوج من بیاید ہماں ساعت ایں طعام پختہ بانشینندگان درگاہ مخدوم" اللہ دیا" رسانم دریں وقت آمد، ایفائے نذر کردم" حضرت والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ قصبہ ڈاسنہ میں مخدوم اللہ دیا کی زیارت کو گئے رات کا وقت تھا اس جگہ فرمایا کہ مخدوم ہماری ضیافت کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ کچھ کھا کر جانا، حضرت نے توقف فرمایا، یہاں تک کہ آدمیوں کا نشان منقطع ہو گیا، ساتھی اُکتا گئے اس وقت ایک عورت اپنے سر پر چاول اور شیرینی کا طبق لیے ہوئے آئی اور کہا میں نے نذر مانی تھی کہ جس وقت میرا خاوند آئے گا اس وقت یہ کھانا پکا کر مخدوم اللہ دیا رحمۃ اللہ علیہ کے دربار میں بیٹھنے والے کو پہنچاؤں گی، وہ اسی وقت آیا میں نے اپنی نذر پوری کی۔

درمختار، بحر الرائق وغیرہ نے جس نذر اولیاء کو حرام اور باطل قرار دیا ہے علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ فقہاء نے اس کے وجوہ بھی بیان فرمائے ہیں ایک وجہ یہ ہے کہ وہ مخلوق

کی نذر ہے اور نذر چونکہ عبادت ہے اس لیے مخلوق کیلئے جائز نہیں، دوسری وجہ یہ ہے کہ ''منذور لہ'' میت ہے اور میت کے مالک ہونے کی صلاحیت نہیں، تیسری وجہ یہ ہے کہ اگر اس نے اعتقاد کیا کہ میت ہی متصرف فی الامور ہے اللہ تعالیٰ نہیں تو اس کا یہ اعتقاد کفر ہے۔ (شامی جلد دوم، صفحہ ۱۳۹)

ہم تفصیلاً لکھ چکے ہیں کہ نذر شرعی جو عبادت ہے ہرگز کسی غیر اللہ کیلئے جائز نہیں نہ میت کو اشیاء منظر کا مالک سمجھنا درست ہے، نہ غیر اللہ کو اللہ کے سوا متصرف فی الامور جاننا جائز ہے، اس اعتقاد فاسد کے ساتھ نذر اولیاء کو آج تک کسی نے جائز نہیں کہا، محل نزاع تو یہ امر ہے کہ صحیح اعتقاد کے ساتھ اولیاء کرام کیلئے لفظ نذر بمعنیٰ عرفی بولنا یا دل میں اس کی نیت کرنا اور اسی نیت سے ان کے مزارات پر کوئی چیز لانا جائز ہے یا نہیں؟ ہمارے نزدیک جائز ہے جیسا کہ تحریر مختار لرد المحتار جلد اول صفحہ ۱۲۳ میں علامہ رافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں'' **ونذر الزیت والشمع للولیاء یوقد عند قبورھم تعظیما لھم ومحبۃ فیھم جائز ایضالا ینبغی النھی عنہ**''، تیل اور شمع کی نذر ماننا اولیاء اللہ کیلئے کہ وہ چراغ روشن کیے جائیں، ان کی قبروں کے نزدیک، ان کی تعظیم اور محبت کیلئے تو یہ جائز ہے اور اس سے منع کرنا بھی مناسب نہیں، اور منکرین اسے حرام کہتے ہیں۔''

الحمد للہ اس کے ثبوت جواز میں ہم متعدد عبارات نقل کر چکے ہیں اور منکرین اس کے عدم جواز پر کوئی دلیل نہیں پیش کر سکتے، رہا یہ امر کہ مزارات اولیاء پر جا کر، یا سیدی فلاں'' **یا ولی اللہ اقض حاجتی اعنی**''، وغیرہ الفاظ بولنے کو فقہاء نے ناجائز قرار دیا ہے، لہٰذا جو لوگ ایسے الفاظ قبورِ اولیاء پر بولتے ہیں وہ مشرک ہیں، بیشک فقہاء نے اس سے منع فرمایا لیکن اسی فساد عقیدہ اور متصرف بالاستقلال سمجھنے کی بنا پر جس کی تفصیل ہم ابھی رد المحتار سے نقل کر چکے ہیں، ورنہ اس کے بغیر نداء اولیاء ممنوع نہیں، دیکھئے صحیح ابن عوانہ، مصنف ابن ابی شیبہ اور معجم الطبرانی الکبیر میں حدیث

شریف'' **اعینونی یا عباد اللہ**'' مدد کرو میری اے اللہ کے بندو! وارد ہے۔

حصن حصین صفحہ ۲۲ اور شامی جلد ثالث ۳۵۵ کے منھیہ میں ہے'' **قرر الذیادی ان الانسان اذا ضاع لہ شئی واردادن یردہ اللہ سبحانہ علیہ قلیقف علیٰ مکان عال مستقبل القبلۃ ویقرالفاتحۃ ویھدی ثوابھا للنبی ﷺ ثم یھدی ثواب ذالک لسیدی احمد بن علوان ویقول یا سیدی احمد یابن علوان ان لم ترد علٰی ضالتی والانزعتک من دیوان الاولیاء فان اللہ یرد علٰی من قال فالکضالتہ ببرکتہ اجموری مع زیادۃ کذافی حاشیۃ شرح المنھج لداؤدی** رحمۃ اللہ علیہ اھ منہ (شامی ج۳، ص۳۵۵)

زیادی نے تقریر کی کہ بے شک انسان کی کوئی شے جب ضائع ہو جائے اور وہ چاہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی ضائع شدہ چیز اس کو لوٹا دے تو اسے چاہیے کہ قبلہ کی طرف منہ کر کے اونچی جگہ پر کھڑا ہو اور سورۃ فاتحہ پڑھے اور اس کا ثواب نبی کریم ﷺ کیلئے ہدیہ کرے پھر اس ثواب کا ہدیہ سیدی احمد بن علوان رحمۃ اللہ علیہ کیلئے کرے اور کہے یا سیدی احمد رحمۃ اللہ علیہ! اے میرے آقا! اے ابن علوان! اگر آپ نے میری گمشدہ چیز واپس نہ کی تو میں آپ کو دیوانِ اولیاء سے اتار دوں تو بیشک اللہ تعالیٰ واپس کر دیتا ہے اس کہنے والے پر اس کی گمشدہ چیز کو ان کی برکت سے۔''

دیکھئے فقہاء کرام کے کلام میں یا سیدی احمد یا ابن علوان وارد ہے اور'' **ان لم ترد علی ضالتی**'' میں انہی کو مخاطب کیا گیا ہے، ہاں یہ ضروری ہے کہ رد ضالتہ کا فاعلِ حقیقی صرف اللہ تعالیٰ ہے، احمد بن علوان کی طرف اس کی اسنا مجاز عقلی ہے اس پر جو دلیل ہے وہ قائل کا خود مومن و موحد ہونا ہے'' **انبت الربیع العقل**'' (موسم ربیع نے سبزی کو اگایا) اگر مومن کہے تو مجاز عقلی ہوگا اور دہریہ کہے تو

اسنادِ حقیقی ہونے کی وجہ سے یہ قول کفرِ خالص قرار پائے گا، ندائے اولیاء کے مسئلہ میں ندا کرنے والے کا مومن و موحد ہونا جوازِ ندا کی روشن دلیل ہے، بعض لوگ اس ندائے منقولہ (یا سیدی احمد بن علوان) کے جواب میں کہہ دیا کرتے ہیں کہ یہ تو ایک عمل ہے اس سے مدعا ثابت نہیں ہوتا، جواباً عرض ہے کہ ندا کرنا آپ کے نزدیک شرک ہے تو ایسے الفاظ جو شرک پر دال ہوں یا موہم شرک ہوں، کسی عمل میں ان کا تلفظ کیونکر جائز ہوسکتا ہے، اگر کوئی شخص کلماتِ کفریہ بکتا رہے مثلاً ''**یا عزی اقض حاجتی**'' (اے عزیٰ میری حاجت پوری کردے) اور جب اسے روکا جائے تو وہ یہ کہہ دے کہ میں تو محض عمل کی نیت سے الفاظ پڑھتا ہوں تو کیا کوئی عاقل متدین اس کو ایسے الفاظ بولنے کی اجازت دے سکتا ہے، مختصر یہ کہ مستقل بالذات، متصرف فی الامور سمجھ کر کسی ولی کو ندا کرنا ہمارے نزدیک بھی شرک ہے، لیکن معطی و حاجت روائے حقیقی صرف اللہ تعالیٰ کو مانتے ہوئے اور اولیاء کرام کو محض وسیلہ واسطہ سمجھ کر انہیں پکارنا ہرگز جائز نہیں۔

دیکھئے حضرت شاہ عبدالعزیز محدثِ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ فتاویٰ عزیزی میں فرماتے ہیں'' وینست صورتِ استمداد مگر ہمیں کہ محتاج طلب کند حاجت خود از جناب عزتِ الٰہی بتوسل روحانیت بندہ کہ مقرب و مکرم درگاہ والا است و گوید خداوند بہ برکت ایں بندہ کہ تو رحمت و اکرام کردہ، او را برآوردہ گردان حاجت مرا، یا ندا کند آں بندہ مقرب و مکرم را کہ اے بنہ خدا و ولی وے شفاعت کن مرا و بخواہ از خدا تعالیٰ مطلوب مرا، تاقجا کند حاجت مرا پس نیست بندہ درمیان مگر وسیلہ، و قادر و معطیٰ و مسئول پروردگار است اللہ شانہ و دروے ہیچ شائبہ شرکت نیست چنانچہ منکر وہم کردہ'' (فتاویٰ عزیزی، ج۲، ص ۱۰۷)

''اور نہیں ہے صورتِ استمداد مگر یہی کہ محتاج طلب کرے اپنی حاجت بارگاہ رب العزت سے اللہ تعالیٰ کے مقرب و مکرم بندہ کی روحانیت کے توسل سے اور کہے

کہ اے اللہ اس بندے کی برکت سے جس پر تو نے اپنی رحمت اور اپنا اکرام فرمایا ہے میری حاجت کو پورا کردے یا پکارے اس بندہ مقرب و مکرم کو، کہ اے خدا کے بندے اور اللہ کے ولی میری شفاعت کر اور اللہ تعالیٰ سے میرا مطلوب مانگ تا کہ وہ میری حاجت پوری فرمادے، پس نہیں بندہ درمیان میں مگر وسیلہ، اور قادر و معطیٰ حقیقی اور مسئول پروردگار ہے جس کی شان بہت بلند و بالا ہے اور اس میں شائبہ شرک کا نہیں ہے جیسا کہ منکر وہم کرتا ہے۔''

ملاحظہ فرمایئے! اس عبارت میں ولی اللہ، صاحب قبر کیلئے لفظ ''ندا کند'' موجود ہے، پھر وہ ندا بھی ''اے بندہ خدا و ولی وے'' کی عبارت میں مذکور ہے جس سے ہمارا مدعا روزِ روشن کی طرح ثابت و واضح ہورہا ہے، جس کا انکار کوئی منصف مزاج نہیں کرسکتا، وللہ الحمد! ان عبارت فقیہ ونقول معتبرہ کی روشنی میں نذر اولیاء کا مسئلہ بالکل روشن ہوگیا، بالمعنیٰ المذکور اس کے جواز میں کسی عاقل متدین کو شک وشبہ کی گنجائش باقی نہیں رہی۔

توسل واستعانت بالاولیاء الکرام کا مسئلہ بھی بیانِ سابق کی روشنی میں اچھی طرح واضح ہوگیا، شرک و توحید کا فرق بھی بالتفصیل بیان کردیا گیا، اب یہ عرض کرنا باقی رہا کہ ''**وما اهل به لغير الله**'' کے تحت وہ جانور جنھیں نذر اولیاء بالمعنیٰ المذکور کے ساتھ بزرگانِ دین کی طرف منسوب کردیا گیا وہ حلال وطیب ہیں اور وہ لوگ جو انہیں حرام کہتے ہیں سخت گمراہی میں مبتلا ہیں، شرعاً ذبیحہ کی حلت وحرمت میں ابتدائے ذبح کے وقت صرف ذابح کی نیت قول اور حال کا اعتبار ہے مالک کا نہیں رد المختار ج۵، ص۲۱۷ میں ہے'' **اعلم ان المدار علیٰ القصد عند ابتداء الذبح تتار خانيه**'' جاننا چاہیے کہ مدار قصد پر ہے، خاص ابتدائے ذبح کے وقت۔'' (جامع الفتاویٰ اور عالمگیری ج۴، ص۴۷ میں ہے)'' **مسلم ذبح شاة المجوسي لبيت نارهم اولكفار لالهتهم توكل**

لانه سمی الله تعالیٰ ویکره للمسلم انتهی "مجوسی نے آتش کدہ کے لیے بکری نامزد کی یا کافر نے اپنے بتوں کیلئے کوئی جانور نامزد کیا اوا ان جانوروں کو مسلمان نے ذبح کر دیا، اگر چہ مسلمان کیلئے ایسا کرنا مکروہ ہے، مگر وہ جانور طیب ہے کھایا جائے گا۔"

مقامِ غور ہے کہ مشرکین و کفار کے بتوں اور بت خانوں کیلئے نامزد کیے ہوئے جانور مسلمان کے ذبح کرنے سے حلال ہو جائیں، مگر نذرِ اولیاء کا جانور مومن کے ذبح کرنے سے حلال نہ ہو" **(سبحانك هذا بهتان عظيم)**

اس مسئلہ میں تفسیرِ عزیزی کی عبارت سے بھولے بھالے مسلمانوں کو دھوکہ میں ڈالنے کی کوشش کی جاتی ہے اور یہ کہا جاتا ہے کہ حضرت شاہ صاحب موصوف کا مسلک یہ ہے کہ جس جانور کو کسی ولی وغیرہ کیلئے نامزد کر دیا جائے اس میں ایسا خبث پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ پھر کسی طرح حلال نہیں ہو سکتا جب تک مالک اپنی نیت کو نہ بدلے اور پہلی شہرت کے بعد اللہ کے نام پر اسے مشہور نہ کر دے، حالانکہ شاہ صاحب کا یہ مسلک ہرگز نہیں، انھوں نے اپنے زمانے میں بعض مشرک پیر پرستوں کے اعتقاد اور مشرکانہ طرزِ عمل کے پیشِ نظر، نذرِ لغیر اللہ کا مسئلہ بیان فرمایا۔ اس میں شک نہیں کہ اس زمانہ میں مشرکین کا ایک گروہ پیر پرستوں کے نام سے پایا جاتا ہے۔

حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے تفسیرِ عزیزی ج ۱، ص ۱۵۸، میں بیان انواع شرک کے تحت مشرکین کے جو فرقے شمار کیے ہیں ان میں چوتھا گروہ پیر پرستوں کا فرقہ بتایا ہے۔ تفسیرِ عزیزی کی وہ عبارت "**بلفظها**" ملاحظہ ہو۔

چہارم" پیر پرستان گویند چوں مرد بزرگے کہ بسبب کمال ریاضت و مجاہدہ، مستجاب الدعوات و مقبول الشفاعت عند اللہ شدہ بود، ازیں جہان مے گزرد روح اورا قوتِ عظیم و وسعت بس فخیم بہم مے رسد، ہر کہ صورت او برزخ سازد یا در مکان نشست و برخواست او یا بر گور او سجود و تذلل تام نماید، روح او بسبب وسعت و اطلاق بر اں مطلع

شود، در دنیا و آخرت در حق او شفاعت نماید" گروہ چہارم پیر پرست کہتے ہیں کہ جب کوئی مرد بزرگ بسبب کمال ریاضت مجاہدہ کے اللہ تعالیٰ کے نزدیک مستجاب الدعوات اور مقبول الشفاعت ہو کر اس جہان سے گزر گیا تو اس کی روح کو بڑی قوت و وسعت حاصل ہو جاتی ہیں، جو شخص بھی اس کی صورت کو برزخ بنائے یا اس کے اٹھنے بیٹھنے کی جگہ پر یا اس کی قبر پر سجدہ عبادت اور تذلل تام کرے تو اس بزرگ کی روح وسعت و اطلاق کے سبب خود بخود اس پر مطلع ہو جاتی ہے اور دنیا و آخرت میں اس کے حق میں شفاعت ہو جاتی ہے اور دنیا و آخرت میں اس کے حق میں شفاعت کرتی ہے۔"

اس عبارت سے ظاہر ہے کہ یہ گروہ واقعی مشرکانہ عقائد رکھتا تھا اور قبروں پر سجدہ اور تذلل تام سے اس کی خصوصیات سے تھا، تذلل تام کے معنیٰ صرف عبادت ہیں، دیکھئے شامی ج ۲، ص ۲۵۷ پر ہے" **العبادة عبارة عن الخضوع والتذلل**"، خضوع اور تذلل تام کو عبادت کہتے ہیں۔

جو گروہ قبروں پر سجدہ عبادت اور تذلل تام کرتا ہو وہ کس طرح مومن ہو سکتا ہے، اس زمانہ کے خوارج نے اہل حق متصوفین کرام، اولیاء اللہ سے عقیدت و محبت رکھنے والے اہل سنت مسلمانوں کا نام پیر پرست رکھ دیا ہے اور ان کے مزارات پر جانا ان کے ارواحِ طیبہ کو ایصالِ ثواب کرنا ان سے روحانی فیض لینا، اور سال بسال ان کے اعراس کرنا جو ان حضرات کے معمولات سے ہے، کفر و شرک اور پیر پرستی کی علامت قرار دے دیا، حالانکہ یہ تمام امور خود شاہ عبدالعزیز صاحب، شاہ ولی اللہ صاحب اور ان کے والد ماجد شاہ عبدالرحیم صاحب (رحمہم اللہ) کے معمولات سے ہیں، جیسا کہ فتاویٰ عزیزی، انفاس رحیمیہ، انفاس العارفین، انتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ میں یہ تمام چیزیں بالتفصیل مذکور ہیں" **من شاه الاطلاع جلیر جع الیها**"۔

ممکن ہے اس زمانہ میں بھی اس قسم کے مشرکانہ عقائد رکھنے والے بعض لوگ کہیں پائے جاتے ہوں لیکن جب تک کوئی شخص اپنے عقیدہ کو خود ظاہر نہ کرے اور

اپنے قول یا قطعی مشرکانہ عمل سے اپنے مشرک ہونے کا اقرار و اظہار نہ کرے، اس وقت تک اس پر حکمِ شرک لگانا اور اسے اس زمانے کے مشرکین پیر پرستوں کے گروہ میں شامل کرنا ظلم و تعدی، بہتان و افترا نہیں تو اور کیا ہے؟ پھر ستم بالائے ستم یہ کہ عامۃ المسلمین کو پیر پرست کہہ کر مشرکین کے اس چوتھے گروہ میں شامل کیا جاتا ہے جس کا ذکر ہم نے ابھی تفسیرِ عزیزی سے نقل کیا ہے۔

یہ امر قابلِ فراموش نہیں ہے کہ فقہاء اور علماء راسخین کے کلام میں توسل و استمداد اور نذرِ اولیاء وغیرہ مسائل میں بعض مقامات پر جو تشدد پایا جاتا ہے درحقیقت اس کا تعلق اسی گروہ مشرکین سے ہے جو وہ اپنے آپ کو پیر پرست کہلوا کر عقائدِ شرکیہ میں مبتلا ہوا، اہلسنت و جماعت پر اس تشدد یا حکمِ تکفیر کو محمول کرنا جراتِ عظیمہ اور ظلمِ صریح ہے **(وسیعلم الذین ظلموای منقلب ینقلبون)**۔

آمد بر سر مطلب، حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب محدثِ دہلوی ﷫ نے تفسیرِ عزیزی میں مذکورہ گروہ مشرکین کا طرزِ عمل سامنے رکھ کر ارقام فرمایا، ان کا طریقہ یہ تھا کہ ایک جانور کی جان دینے کی نذر شیخ سدو وغیرہ کیلئے مانی اور اس کی تشہیر کردی، پھر اسی نیت کے ساتھ شیخ سدو وغیرہ کیلئے خون بہانے کی نیت سے اس جانور کو خود ذبح کردیا یا اپنی اس نیت اور منت وغیرہ کو پورا کرنے کیلئے کسی دوسرے آدمی سے ذبح کرا دیا، ہر صورت میں اس جانور کا خون شیخ سدو وغیرہ کیلئے بہایا جاتا تھا، ظاہر ہے کہ اس صورت میں ذبیحہ مذکورہ کسی طرح حلال نہیں ہوسکتا، کم فہم لوگوں نے یہ سمجھ لیا کہ حضرت شاہ صاحب نے ان جانوروں کو محض نذر لغیر اللہ کی وجہ سے حرام قرار دیا ہے، حالانکہ یہ قطعاً باطل اور شاہ صاحب پر بہتانِ صریح ہے، حضرت شاہ صاحب نے تفسیرِ عزیزی میں اپنے مسلک کی وضاحت فرماتے ہوئے تین دلیلیں ارقام فرمائی ہیں جن میں پہلی دلیل یہ حدیث شریف ہے " **ملعون من ذبح لغیر اللہ** " ملعون ہے جس نے غیر اللہ کیلئے ذبح کیا ہے، جس میں لفظ "ذبح" صراحۃً مذکور ہے۔"

دوسری دلیلِ عقلی ہے جس میں صاف مذکور ہے "وجان ایں جانور ازاں غیر قرار دادہ کشتہ اند" اور اس جانور کی جان اس غیر اللہ کی مملوک قرار دے کر اسے ذبح کیا ہے" یہاں بھی اس جانور کو غیر کی طرف منسوب کرنے پر اکتفاء نہیں فرمایا بلکہ "کشتہ اند" فرما کر واضح فرمادیا کہ جب تک اس جانور کا غیر اللہ کیلئے ذبح ہونا واقع نہ ہو اس وقت تک اس میں خبث پیدا نہیں ہوتا اور نہ وہ حرام ہوتا ہے۔"

تیسری دلیل تفسیر عزیزی نیشاپوری کی حسبِ ذیل عبارت ہے" **اجمع العلماء و ان مسلماً ذبح ذبیحة وقصد بذبحها الی غیر اللہ صار مرتد او ذبیحته ذبیحة مرتد**" علماء نے اس بات پر اجماع کیا ہے کہ اگر کسی مسلمان نے کوئی جانور ذبح کیا اور اس کے فعل ذبح سے غیر اللہ کی طرف تقرب (علی وجہ العبادۃ) کا ارادہ کیا تو وہ مرتد ہوگیا، اور اس کا ذبیحہ قرار پائے گا۔"

یہاں بھی ذبح بقصدِ تقرب الی غیر اللہ مذکور ہے، ثابت ہوا کہ شاہ صاحب محض تشہیر لغیر اللہ کو موجبِ حرمت قرار نہیں دیتے بلکہ ذبح لغیر اللہ ان کے نزدیک موجبِ حرمت ہے، جو نہ صرف ہمارا بلکہ تمام امتِ مسلمہ کا متفقہ مسلک ہے، اگرچہ اصل لغت کے اعتبار سے حضرت شاہ صاحب نے "اہل" کا ترجمہ "آواز دادہ شد" کیا ہے، مگر چونکہ اس آواز اور شہرت سے وہی آواز اور شہرت مراد ہے جس پر جانور کا ذبح واقع ہوا، اس لیے آیہ کریمہ " **وما اهل به لغير الله** " کی تفسیر کرتے ہوئے شاہ صاحب ممدوح نے صاف لفظوں میں " **اهل لغير الله** " کا ترجمہ ذبح لقصدِ غیر اللہ فرمایا، چنانچہ تفسیرِ عزیزی صفحہ ۲۹۳، جلد اول میں فرماتے ہیں " آمدیم برآنکہ دریں سورہ لفظ "بہ" را بر لفظ "لغیر اللہ" مقدم آوردہ اند، و در سورہ مائدہ و انعام، و نحل مؤخر و جہش آنست کہ اصل ہمیں است، کہ "با" را متصل فعل و مقدم بر متعلقات دیگر آرید، زیرا کہ با، دریں مقام برائے تعدیہ فعل است مانند ہمزہ و تضعیف پس حتی الامکان لا

صق فعل باشد، وایں موضع اول قرآن است دریں موضع بر ہماں اصل خود استعمال فرمودہ اند، ودر صورت ہائے دیگر آنچہ محل انکار و مدار سرزنش است یعنی ذبح لقصد غیر اللہ مقدم آمد" (تفسیر عزیزی جلد اول صفحہ ۶۹۳)

اب ہم اس بیان پر آئے کہ اس صورت میں لفظ بہ، کہ لفظ "لغیر اللہ" پر مقدم لائے ہیں اور سورہ مائدہ، انعام ونحل میں مؤخر، اس کی وجہ یہ ہے کہ اصل یہی ہے، "با" کو فعل کے متصل اور دوسرے متعلقات پر مقدم لائیں، اس لیے کہ "با" اس جگہ ہمزہ اور تضعیف کی طرح تعدیہ فعل کیلئے ہے، پس حتی الامکان فعل کے ساتھ ملی ہوئی ہوگی، قرآن کریم میں یہ آیت کریمہ پہلی جگہ ہے، ا۔ اس جگہ اپنی اس اصل پر استعمال فرمایا ہے اور دوسری سورتوں میں وہ چیز مقدم ہے جو محض انکار اور مدار سرزنش ہے، یعنی ذبح لقصدِ لغیر اللہ۔

سورہ بقرہ ہو یا مائدہ یا انعام یا نحل ہر جگہ لفظ "اہل" واقع ہوا نہ ذبح، پھر شاہ صاحب کا یہ کہنا کیسے صحیح ہوگا کہ دوسری سورتوں میں ذبح لقصدِ غیر اللہ "بہ" پر مقدم آیا ہے، جب تک کہ "اہل" کا معنیٰ ذبح نہ کیا جائے۔

ثابت ہوا کہ خود شاہ صاحب کے نزدیک بہ اہل لغیر اللہ کے مرادی معنیٰ ذبح لقصدِ لغیر اللہ ہے" **واللہ الحجۃ السامیۃ**"۔

اس کی تائیدِ مزید میں فتاویٰ عزیزی جلد اول صفحہ ۲۱ کی ایک اور عبارت ملاحظہ فرمائیے، حضرت سید احمد کبیر کیلئے نذر مانی ہوئی گائے کے حلال یا حرام ہونے کے سوال کا جواب حضرت شاہ صاحب اس طرح ارقام فرماتے ہیں۔

جواب: مدارِ حلت وحرمت ذبیحہ بر قصد ونیت ذابح است، اگر بنیت تقرب الی اللہ یا برائے اکل خود یا برائے تجارت ودیگر امور مباحہ ذبح میکند حلال است والا حرام۔"

ذبیحہ کی حلت وحرمت کا دارومدار ذابح کی نیت وقصد پر ہے، اگر تقرب الی اللہ کی نیت سے یا اپنے کھانے کیلئے یا تجارت اور دوسرے جائز کاموں کیلئے ذبح کرے تو

حلال ہے ورنہ حرام۔

دیکھئے اس بقرہ منذور، کو نذر سید احمد کبیر کی وجہ سے حرام نہیں کہا، اگر رفع صورت اور تشہیر ونذر لغیر اللہ موجب حرمت ہوتی تو جواب میں حلت وحرمت ذبیحہ کا مدار، ذابح کی قصد ونیت پر ہرگز نہ ہوتا، لیکن نیت ذابح پر مدار حلت وحرمت قرار دے کر شاہ صاحب موصوف نے اپنا مسلک واضح فرمادیا کہ محض نامزدگی موجب حرمت نہیں، جب تک کہ فعل ذبح کے ساتھ تقرب الی غیر اللہ کی نیت نہ پائی جائے۔ اس جواب میں آگے چل کر صفحہ ۲۴ پر فرماتے ہیں۔

" **فنیتھم دائمۃ الی وقت الذبح**"، یعنی ان کی نیت تقرب الی غیر اللہ، وقتِ ذبح تک دائم ومستمر رہتی ہے۔

ثابت ہوا کہ صرف "نیت تعظیم لغیر اللہ" موجب حرمت نہیں، جب تک کہ وہ نیت وقتِ ذبح تک دائم اور باقی نہ رہے۔

اس مسئلہ میں یہی شاہ صاحب اسی فتاویٰ عزیزی جلد اول، صفحہ ۴۷ پر فرماتے ہیں" **فمتیٰ کان اراقۃ الدم للتقرب الی غیر اللہ حرمت الذبیحۃ ومتیٰ کان اراقۃ الدم للہ والتقرب الی الغیر بالاکل والا نتفاع حلت الذبیحۃ**"" اھ جب خون بہانا تقرب الی غیر اللہ کیلئے ہو تو ذبیحہ حرام ہوجائے گا، اور جب خون بہانا اللہ کیلئے ہو اور تقرب الی غیر اللہ کھانے اور نفع حاصل کرنے کے ساتھ مقصود ہو تو ذبیحہ حلال ہوجائے گا۔"

دیکھئے حلت وحرمت ذبیحہ میں کتنا روشن فیصلہ ہے اس کے باوجود بھی اگر یہ کہا جائے کہ شاہ عبدالعزیز صاحب محدثِ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ محض تشہیر لغیر اللہ، کو جانور کے حرام ہونے کی علت قرار دیتے ہیں تو ایسا کہنا یقیناً شاہ صاحب پر افتراء عظیم ہوگا، ان کے نزدیک آیہ کریمہ" **وما اھل بہ لغیر اللہ**" کے مرادی معنیٰ قطعاً یہی ہیں کہ جس جانور پر عند الذبح اہلال لغیر اللہ کیا جائے۔

امام حجۃ الاسلام ابو بکر احمد بن علی رازی الجصاص الحنفی المتوفی ۳۷۰ھ اپنی مشہور تفسیر احکام القرآن، جلد اول، صفحہ ۱۴۵۔۱۴۶ پر اس آیہ کریمہ کے تحت فرماتے ہیں۔

وما اهل به لغير الله ولا خلاف بين المسلمين ان المرادبه الذبيحة اذا اهل بها لغير الله عندالذبح" اور مسلمانوں کے درمیان اس مسئلہ میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ "**ما اهل به لغير الله**" سے وہی ذبیحہ مراد ہے، جس پر بوقتِ ذبح غیر اللہ کا نام لیا گیا ہو۔"

اجماعِ امت کے خلاف قول کرنا گمراہی نہیں تو اور کیا ہے، حدیث شریف "**لعن الله من ذبح لغير الله**" **کے تحت علامہ نووی** رحمۃ اللہ علیہ **فرماتے هیں" اما الذبح لغير الله فالمراد به ان يذبح باسم غير الله تعالىٰ كمن ذبح للصنم او الصليب او لموسىٰ ولعيسىٰ صلى الله عليهما اوالكعبة او نحر ذالك فكل هذا حرام ولا تحل هذه الذبيحة سواء كان الذابح مسلماً او نصرانياً او يهودياً نص عليه الشافعي** رحمۃ اللہ علیہ **واتفق عليه اصحابنا ان قصد مع ذالك تعظيم المذبوح له لغير الله تعالىٰ والعبادة له كان ذالك كفرا فان كان الذابح مسلماً قبل ذالك صار بالذبح مرتدا، وذكر الشيخ ابراهيم المروزى من اصحابنا، انما يذبح عند استقبال السلطان تقرباً ،اليه افتىٰ اهل بخارا بتحريمه لانه مما اهل به لغير الله تعالىٰ، قال الرافعى هذا انما يذبحونه استبشارا بقدومه فهو كذبح العقيقة لولادة المولود ومثل هذا لا يوجب والتحريم والله اعلم"**

(نووی بر مسلم شریف جلد دوم، صفحہ ۱۶۱) اور ذبح لغیر اللہ سے مراد یہ ہے کہ غیر اللہ کے نام پر کوئی ذبح کرے، جیسے کسی نے بت یا صلیب کیلئے ذبح کر دیا، یا موسیٰ یا عیسیٰ علیہما السلام کیلئے یا کعبہ وغیرہ کیلئے ذبح کر دیا تو سب حرام ہے اور یہ ذبیحہ حلال نہیں برابر ہے کہ ذبح کرنے والا مسلمان ہو یا یہودی یا عیسائی، امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی تصریح فرمائی ہے اور ہمارے اصحاب نے اس بات پر اتفاق کیا ہے کہ اگر اس ذبح کی غیر اللہ کے ساتھ اس غیر اللہ کی تعظیم اور عبادت بھی مقصود ہو تو یہ کفر ہوگا۔ لہٰذا اگر ذبح کرنے والا پہلے مسلمان تھا تو اس ذبح کے بعد مرتد ہو جائے گا۔ اور الشیخ ابراہیم مروزی نے جو ہمارے اصحاب سے ہیں ذکر فرمایا کہ سلطان کے استقبال کے وقت اس کی طرف سے تقرب حاصل کرنے کیلئے ذبح کیے جاتے ہیں۔ اہلِ بخارا نے ان کی حرمت کا فتویٰ دیا کیونکہ وہ ما اہل بہ لغیر اللہ سے ہیں، امام رافعی نے فرمایا کہ یہ جانور، لوگ امیر کے آنے کی خوشی میں ذبح کرتے ہیں، تو وہ بچہ پیدا ہونے کے وقت عقیقہ کے ذبح کی طرح ہیں اور ایسا ذبح حرمت کو واضح نہیں کرتا۔

علامہ نووی کے اس کلام سے حدیث مبارک "**لعن الله من ذبح لغير الله**" کے معنی بھی واضح ہو گئے کہ اس سے مراد ذبح لغیر اسم اللہ ہے اور یہ بھی ظاہر ہو گیا کہ استقبال سلطان کے وقت جو جانور "تقربا الی السلطان" ذبح کیے جاتے ہیں، رافعی نے ان کو بادشاہ کے آنے کی خوشی پر محمول کر کے اس کو ذبح عقیقہ کی طرح جائز قرار دیا ہے، ان تمام تصریحات سے آیہ کریمہ "**وما اهل به لغير الله**" کے مرادی معنیٰ آفتاب سے زیادہ روشن ہو گئے۔ اس کے بعد بھی حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے کلام کی غلط توجیہ کرنا انہیں امتِ مسلمہ کا مخالف قرار دینا ہے، جن لوگوں نے از راہِ عناد شاہ صاحب کے کلام کی توجیہ اجماعِ امت کے خلاف کی ہے انھوں نے شاہ صاحب کے ساتھ کوئی نیکی کا سلوک نہیں کیا بلکہ ان لوگوں نے صراحتہ شاہ صاحب کو قرآن وحدیث کا مخالف قرار دیا ہے۔

دیکھئے! اولیاء کرام کے نام پر جو جانور نامزد کیے جائیں تو وہ مردار اور سگ و خوک سے زیادہ نجس وحرام قرار پائیں اور جو جانور ناپاک بتوں کیلئے ان کی عبادت اور نذر کی نیت سے تقرباً الی غیر اللہ نامزد کیے جائیں وہ حلال وطیب رہیں۔

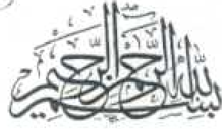
قرآن مجید اٹھا کر دیکھئے! اللہ تعالیٰ فرماتا ہے" **ماجعل الله من بحيرة ولا سائبة ولا وصلية ولاحام**" (الانعام،۱۰۳)

اللہ تعالیٰ نے کوئی بحیرہ سائبہ، وصیلہ اور حام نہیں بنایا۔"

اقوالِ زریں

- محنت سے روزی کمانے والا خدا کا دوست ہے۔
- دنیا مومن کیلئے قید خانہ ہے اور کافر کیلئے جنت ہے۔
- جو قوم لالچ میں پڑی وہ ذلت کے گڑھے میں جا گری۔
- ظالموں کو معاف کرنا مظلوموں پر ظلم ہے۔





باب نمبر 20

باتیں ان کی یادیں ان کی

از مفتی غلام مصطفیٰ رضوی

ماہنامہ السعید امام اہل سنت نمبر ۱۹۹۶ صفحہ ۶۳ تا ۶۸

مفتی غلام مصطفیٰ رضوی فرماتے ہیں برِ صغیر میں جن نامور روحانی، مذہبی اور علمی شخصیات نے ملتِ اسلامیہ کی رہبری اور رہنمائی کا فریضہ انجام دیا ہے ان میں امام اہلسنت غزالیٔ دوراں، بیہقیٔ وقت علامہ سید احمد سعید کاظمی رحمۃ اللہ علیہ کا اسمِ گرامی بہت درخشاں اور نمایاں نظر آتا ہے، آپ بلاشبہ علومِ ظاہری و باطنی کا کوہِ گراں تھے۔ اگرچہ وہ شخصیات جنھیں اپنے ہمعصروں پر بوجوہ فضیلت و برتری حاصل ہو عموماً ان میں تکبرو غرور پیدا ہو جاتا ہے، ان کے مزاج میں تندی اور گفتگو میں تلخی کا احساس نمایاں ہوتا ہے لیکن حضرت غزالیٔ زماں رحمۃ اللہ علیہ تمام تر علمی تفوق کے باوجود تواضع اور انکساری کا پیکرِ جمیل تھے اور وہ لوگ جنھیں آپ کی خدمت میں حاضری کی سعادت نصیب ہوئی ہے وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ آپ جب اپنے نیازمندوں اور حلقۂ احباب میں تشریف فرما ہوتے تو بعض اوقات احباب سے بے تکلفی اور قربت کا احساس اُجاگر کرنے کیلئے اس انداز سے اپنی گفتگو میں مزاح کا رنگ پیدا فرماتے کہ حاضرین کیلئے ہنسی پر قابو پانا مشکل ہو جاتا۔

چنانچہ ایک مرتبہ لاہور سے آپ کے ایک دیرینہ دوست تشریف لائے تو آپ نے ان کی حتی الوسع خاطر مدارت فرمائی، ایک دن ناشتہ کرتے وقت آپ نے فرمایا انڈوں کی پلیٹ ان کے سامنے رکھی اور ساتھ ہی فرمایا "دیکھئے ہم نے آپ کو انڈے بھی کھلا دیے ہیں" وہ صاحب بولے "جی ہاں! ہمیں بھی اللہ تعالیٰ انڈے دیتا ہی رہتا ہے" حضرت کاظمی رحمۃ اللہ علیہ نے فوراً مزاحیہ انداز میں فرمایا "العیاذ باللہ حضرت جی آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں؟ انڈے تو مرغی دیتی ہے، یہ سن کر وہ صاحب تو جھینپ گئے لیکن حاضرین کافی دیر تک آپ کے اس اندازِ ظرافت پر ہنستے رہے۔

یہ ایک مشاہداتی حقیقت ہے کہ کوئی بھی شخص علوم و فنون میں جس قدر بھی مہارت رکھتا ہو اس کی عظمت کو اس کے ہمعصر قبول کرنے کیلئے تیار نہیں ہوتے۔ لیکن یہ امتیازی حیثیت بھی حضرت امام اہلسنت رحمۃ اللہ علیہ کو حاصل ہے کہ آپ کے ہمعصر بھی

آپ کی علمی عظمت کے آگے اپنی گردنیں جھکا دیتے تھے، چنانچہ جب محترمہ فاطمہ جناح، فیلڈ مارشل ایوب خان کے خلاف صدارتی الیکشن لڑ رہی تھیں تو اس وقت اہل سنت و جماعت کے تمام علماء کرام نے عورت کی سربراہی کے خلاف رائے عامہ کو ہموار کرنے کیلئے لاہور کے موچی دروازے میں ایک کانفرنس کا اہتمام کیا جس میں ملک بھر کے نامور اور جید علماء کرام اور مشائخ عظام شریک ہوئے، ان علماء کرام اور مشائخ عظام کے قیام کا انتظام بھاٹی گیٹ کے قریب واقع ایک ہوٹل میں تھا، حکیم الامت مفتی احمد یار خان صاحب بدایونی رحمۃ اللہ علیہ صبح کی نماز کے بعد اچانک حضرت غزالیٔ زماں رحمۃ اللہ علیہ کے کمرے میں تشریف لے آئے اور انتہائی علمی مسائل پر گفتگو چھیڑ دی۔ جونہی اہلسنت و جماعت کے دو نامور بزرگوں کی گفتگو کی خبر دوسرے علماء کرام اور مشائخ عظام تک پہنچی وہ بھی وہاں تشریف لے آئے۔ حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے اگرچہ بہت ہی علمی اور پیچیدہ نوعیت کے سوالات کیے لیکن غزالیٔ زماں رحمۃ اللہ علیہ نے اس قدر جامعیت کے ساتھ جوابات عطا فرمائے کہ پورا کمرہ علماء و مشائخ کی صدائے تحسین سے گونج اُٹھا، گفتگو کے اختتام پر سب نے دیکھا کہ حضرت مفتی احمد یار خان صاحب بدایونی رحمۃ اللہ علیہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور فرمایا "قبلہ کاظمی صاحب! (رحمۃ اللہ علیہ) اس دور میں ہمارے اساتذہ کرام تو ہیں نہیں اس لیے جب بھی کوئی مشکل ترین مسئلہ ہمارے ذہن کو پریشان کرتا ہے تو اس کے حل کیلئے آپ کی ذات کے سوا ہمیں کوئی نظر نہیں آتا" اور اسی طرح حضرت قبلہ کاظمی صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی ان علماء کی جس طرح عزت و تکریم فرماتے تھے وہ منظر بھی دیدنی ہوتا تھا، مدرسہ انوار العلوم کے سالانہ جلسے کے موقع پر جب حضرت حکیم الامت مفتی احمد یار خان رحمۃ اللہ علیہ کے خطاب کا اعلان کیا گیا اور مفتی صاحب قبلہ رحمۃ اللہ علیہ کرسی پر بیٹھنے کیلئے کھڑے ہوئے تو حضرت غزالیٔ زماں رحمۃ اللہ علیہ بھی کھڑے ہوئے اور ہزاروں حاضرین کے سامنے حضرت مفتی صاحب کی دست بوسی فرمائی۔ یہ یقیناً اپنے ہمعصر اور ہم مرتبہ علماء کے ساتھ نیاز مندی کے اظہار کا

نہایت منفرد واقعہ ہے۔

اسی طرح ایک مرتبہ رحیم یار خان کے ایک دینی مدرسے کا سہ روزہ سالانہ جلسہ تھا جس میں ملک کے دیگر مشاہیر کی طرح حضرت غزالیٔ زماں رحمۃ اللہ علیہ بھی مدعو تھے۔ آپ بذریعہ ریل رات کو رحیم یار خان ایسے وقت پہنچے کہ رات کا اجلاس شروع ہو چکا تھا۔ جلسہ گاہ سے قدرے فاصلے پر واقع قیام گاہ میں ٹھہرایا گیا۔ چونکہ آپ کا خطاب اگلے دن ہونا تھا اس لیے آپ عشاء کی نماز پڑھ کر آرام فرمانے کیلئے لیٹ گئے اور طویل سفر کی تھکن کی وجہ سے آپ گہری نیند سو گئے۔ ادھر جلسہ گاہ میں اہلسنت وجماعت کے نامور عالمِ دین استاذ العلماء حضرت علامہ سید احمد ابوالبرکات کا خطاب جاری تھا اور آپ انتہائی مدلل انداز میں حضور ﷺ کی نورانیت مطہرہ کا ذکر فرما رہے تھے اور اپنے خطاب کے دوران حضرت استاذ العلماء نے فرمایا کہ اللہ کا ارشادِ گرامی ہے کہ کفار نے کہا کہ ”**البشر یهدوننا فکروا**“ کیا ہمیں بشر ہدایت کریں گے؟ پس وہ کافر ہو گئے۔ معلوم ہوا کہ انبیاء کرام علیہم السلام کو بشر کہنا کفر قرار پایا۔ کسی مخالف نے ایک پرچی بھیجی جس میں لکھا تھا کہ وہ لوگ انبیاء کو بشر کہنے کی وجہ سے کافر قرار نہیں پاتے تھے بلکہ انکار ہدایت کی وجہ سے ان پر کفر لازم آیا تھا۔ حضرت استاذ العلماء رحمۃ اللہ علیہ نے اگرچہ مخالفین کے رد میں بہت کچھ ارشاد فرمایا لیکن منتظمین نے محسوس کیا کہ معترضین کی تسلی اور مجمع کے اطمینان کیلئے موضوع مزید بھرپور بیان کا تقاضہ کرتا ہے، اگرچہ اس وقت اسٹیج پر بہت سے جید علماء کرام تشریف فرما تھے لیکن سب نے فیصلہ یہ کیا کہ ان نازک لمحات میں امامِ اہلسنت حضرت غزالیٔ زماں رحمۃ اللہ علیہ ہی مخالفین کا منہ توڑ سکتے ہیں اور اپنوں کا حوصلہ بلند کر سکتے ہیں چنانچہ فوراً ہی کچھ نیاز مند حاضر ہوئے۔ آپ کو گہری نیند سے بیدار کیا اور جلسہ گاہ کی نازک صورت حال سے آگاہ کیا۔ اور فوراً اسٹیج پر لے آئے، حضرت غزالیٔ زماں رحمۃ اللہ علیہ کے وہاں پہنچتے ہی اسٹیج پر بیٹھے علماء و مشائخ کے علاوہ عوام اہلسنت نے بھی اطمینان کا سانس لیا اور بلا تاخیر آپ کے خطاب کا اعلان کر دیا

گیا۔ آپ نے مختصر خطبہ پڑھنے کے بعد حضور نبی کریم ﷺ کی نورانیت مقدسہ اور بشریت مطہرہ کے بارے میں اہلسنت وجماعت کے پاکیزہ موقف کو قرآن و حدیث کی روشنی میں اس انداز سے بیان فرمایا کہ ہر شخص عش عش کر اٹھا، ایسے لگتا تھا کہ علم کا یک دریا ہے جو ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ مخالفین پر سکوتِ مرگ طاری ہو گیا، عوام کے اذہان کو مطمئن کرنے کیلئے آپ نے ایک اور سادہ اور آسان انداز اختیار کرتے ہوئے فرمایا کہ میں مخالفین اہلسنت سے پوچھتا ہوں کہ کفار انبیاء کرام کو بشر توہین کے ارادے سے کہتے تھے یا تعظیم کے ارادے سے، ظاہر ہے کہ کفار سے انبیاء کرام کی تعظیم کی توقع تو نہیں کی جا سکتی۔ آپ بھی یقیناً کہیں گے وہ ایسا توہین کے ارادے سے کہتے تھے۔ تو پھر اس طرح آپ خود بھی مان گئے کہ انبیاء کرام علیہم السلام کو توہین کی نیت سے بشر کہنا اور توہین انبیاء کرام علیہم السلام کفر ہے۔ اس طرح جلسہ بخیر و خوبی ختم ہو گیا۔

حضرت استاز العلماء رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا اور اس انداز میں حضرت کی حوصلہ افزائی کی کہ ”کاظمی صاحب! جی چاہتا ہے کہ آپ کے ہاتھ اور منہ چوم لیا جائے، یقیناً آپ غزالیٔ زماں ہیں۔“

حضرت غزالیٔ زماں رحمۃ اللہ علیہ کی علمی عظمت کو اپنے پرائے سب تسلیم کرتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ حضرت امامِ اہلسنت رحمۃ اللہ علیہ خانپور سے ملتان آ رہے تھے، ریل گاڑی کے انٹر کلاس میں آپ سوار ہوئے۔ راقم الحروف کے علاوہ دو تین خدام اور بھی ہمراہ تھے۔ گاڑی چلنے ہی والی تھی کہ دیوبندی مکتبِ فکر کے معروف مقرر مولانا محمد علی جالندھری بھی اسی ڈبے میں سوار ہوئے۔ ڈبہ مسافروں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا اور بیٹھنے کیلئے جگہ بالکل نہیں تھی، لیکن حضرت غزالیٔ زماں رحمۃ اللہ علیہ نے مولانا جالندھری کیلئے اپنے قریب جگہ بنا لی اور انھیں اپنے ساتھ بٹھا لیا اور ساتھ ہی مشروبات کے ذریعے ان کی تواضع بھی فرماتے رہے اور ساتھ ہی ساتھ دورانِ سفر مختلف موضوعات پر ان سے گفتگو بھی جاری رہی، ان دنوں دیوبندی مکتبِ فکر کے مولانا دوست محمد قریشی نے ایک اشتہار

شائع کیا تھا جس میں اور باتوں کے علاوہ یہ بھی لکھا تھا کہ دور اور نزدیک سے سننا صرف اللہ تعالیٰ کی شان ہے جو کسی اور کیلئے یہ وصف ثابت کرتے ہیں وہ مشرک ہیں، حضرت غزالیٔ زماں ﷫ نے فرمایا جالندھری صاحب! آپ کا اس سلسلے میں کیا خیال ہے؟ تو جالندھری صاحب فوراً بولے کہ قریشی صاحب نے صحیح لکھا ہے، حضرت غزالیٔ زماں ﷫ نے فرمایا جالندھری صاحب کیا اللہ تعالیٰ سے بھی کوئی چیز دور ہے؟ مولانا جالندھری گہری سوچ میں پڑ گئے اور کوئی جواب نہ دیا، تو آپ نے فرمایا جالندھری صاحب! اللہ تعالیٰ سے تو کوئی چیز بھی دور نہیں لہٰذا یہ کہنا کہ دور اور نزدیک سے سننا صرف اللہ تعالیٰ کی شان ہے سراسر غلط ہے۔ مولانا محمد علی جالندھری نے یہ سن کر کہا واقعی اس لفظ کی طرف تو میری توجہ ہی نہیں گئی۔ پھر کہنے لگے کاظمی صاحب! آپ کی فلسفیانہ گرفت سے بچنا آسان کام نہیں، چونکہ وہ پسنجر ٹرین تھی اسلیے اس نے کانپور سے ملتان آتے ہوئے کئی گھنٹے لگا دیے۔ راستے میں بیشتر مسافر اتر گئے۔ گاڑی جب شیر شاہ پہنچی تو مولانا محمد علی جالندھری لیٹ گئے اور انہیں گہری نیند آ گئی۔ گاڑی جب ملتان پہنچی تو مولانا جالندھری گہری نیند کے مزے لے رہے تھے۔ جب سب مسافر اتر گئے تو حضرت غزالیٔ زماں ﷫ نے اپنے ایک خادم سے فرمایا کہ مولانا جالندھری کو اٹھا دیں، وہ صاحب کہنے لگے حضرت! یہ سوتے رہیں تاکہ خانیوال جا کر انہیں احساس ہو کہ غفلت کی نیند کتنی نقصان دہ ہے لیکن، حضرت غزالیٔ زماں ﷫ نے فرمایا یہ طرزِ عمل حسنِ اخلاق کے خلاف ہے۔ چنانچہ آپ جلدی سے خود آگے بڑھے اور مولانا جالندھری صاحب کو بیدار کیا اور فرمایا مولانا ملتان آ گیا ہے، مولانا جالندھری ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے، شکریہ ادا کیا اور کہنے لگے کاظمی صاحب! اگر آپ بیدار نہ کرتے تو میری آنکھ نہ کھلتی، حضرت غزالیٔ زماں ﷫ نے مسکرا کر فرمایا ''خدا کرے آپ کی آنکھیں کھل جائیں'' اور دونوں صاحبان اس ذومعنی گفتگو پر ہنس پڑے احترام سے ایک دوسرے سے جدا ہوئے اور اس طرح یہ سفر یادگار بن گیا۔

حضرت غزالیٔ زماں ﷫ کو جودتِ طبع، قوتِ استدلال اور بھرپور فکری صلاحیتوں سے اللہ تعالیٰ نے جس طرح نوازا تھا اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ آپ مشکل سے مشکل ترین مسئلے کو چشمِ زدن میں حل فرما دیا کرتے تھے، مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ گرمیوں کے دن تھے، غالباً کراچی سے آپ کے ایک دوست ملتان تشریف لائے اور آپ کے ہاں قیام فرمایا، آموں کا موسم تھا، حضرت غزالیٔ زماں ﷫ نے اپنے اس معزز مہمان کیلئے عمدہ قسم کے آم منگوائے۔ جب وہ آم کھانے لگے تو اچانک انھوں نے پوچھا کاظمی صاحب (﷫)! علماء کرام بیان فرماتے ہیں کہ قرآن مجید میں ہر چیز کا ذکر موجود ہے، کیا آموں کا ذکر بھی ہے؟ حضرت غزالیٔ زماں ﷫ نے فوراً فرمایا، ہاں! ذکر ہے، وہاں پر اور بھی بہت سے اہلِ علم بیٹھے ہوئے تھے، وہ حیران ہو کر پوچھنے لگے حضرت! ہماری نظر سے تو کوئی ایسی آیت نہیں گزری جس میں آموں کا ذکر ہو، آپ نے فرمایا ''دیکھئے اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے'' **ویخلق ما لا تعلمون**'' اور اللہ تعالیٰ وہ کچھ پیدا فرمائے گا جو تم نہیں جانتے، آم بھی اس تخلیق میں شامل ہیں، آپ کا یہ طرزِ استدلال یقیناً آپ کی علمی عظمت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔''

امامِ اہلسنت حضرت غزالیٔ زماں ﷫ کو اللہ تعالیٰ نے جس فہم و فراست سے نوازا تھا وہ بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے اور پھر جب بھی تبلیغ دین کی راہ میں شر پسند عناصر نے رکاوٹ بننے کی کوشش کی، آپ نے اپنی اس خداداد صلاحیت سے انہیں وہ منہ توڑ جواب دیا کہ ان کی ساری منصوبہ بندی دھری کی دھری رہ گئی۔ چنانچہ ایک مرتبہ چاچڑاں شریف کے نزدیک انوار العلوم کے فاضل مولانا حبیب احمد حیدری کے والد گرامی نے جلسہ عید میلاد النبی ﷺ کا اہتمام کیا اور خطاب کیلئے حضرت غزالیٔ زماں ﷫ کو مدعو کیا۔ آپ ابھی اس بستی میں پہنچے ہی تھے کہ تھانہ چاچڑاں کے ایک پولیس آفیسر آدھمکے اور انھوں نے کہا کہ ڈی سی رحیم یار خان کی طرف سے ابھی ابھی آپ کی

زبان بندی کے احکام موصول ہوئے ہیں لہٰذا آپ اس جلسہ میں تقریر نہیں کر سکتے۔ ادھر سینکڑوں کی تعداد میں شمعِ رسالت کے پروانے جمع ہو چکے تھے۔ پھر منتظمینِ جلسہ زرِ کثیر خرچ کر چکے تھے۔ ایسے میں علاقے کے مخالفوں کی شورش کے باعث زبان بندی کا حکم مایوسی اور پھر اشتعال کا سبب بن رہا تھا اور یہ بھی ممکن تھا کہ کوئی ہنگامہ ہو جائے۔ لیکن حضرت غزالیِ زماں رحمۃ اللہ علیہ پورے اطمینان اور سکون کے ساتھ وہاں تشریف فرما رہے اور جلسہ کے منتظمین سے فرمایا تم لوگ مت گھبراؤ میں ضرور تقریر کروں گا۔ وہ لوگ کہنے لگے حضور! آپ بھی اور ہم بھی لکھ کر دے چکے ہیں کہ آپ کی تقریر نہیں ہوگی۔ اگر آپ نے تقریر فرمائی تو ہمیں خطرہ ہے کہ کہیں آپ کو پولیس گرفتار نہ کرلے لیکن آپ نے بڑے اطمینان سے فرمایا آپ لوگ اپنا انتظام جاری رکھیں کچھ بھی نہیں ہوگا۔ چنانچہ جب جلسہ گاہ کھچا کھچ بھر گئی تو آپ اسٹیج پر تشریف لائے۔ پولیس بھی وہاں موجود تھی، آپ نے پولیس آفیسر سے فرمایا کہ میری تقریر پر تو پابندی ہے لیکن یہ لوگ مختلف دور دراز کے علاقوں سے یہاں آئے ہیں کم از کم ہم دعا تو کر سکتے ہیں۔ پولیس آفیسر جو حضرت کے تحمل و بردباری اور حضرت کی بھرپور شخصیت سے متاثر نظر آ رہا تھا اس نے کہا جناب! دعا پر تو کوئی پابندی نہیں، آپ ضرور دعا فرمائیں، حضرت غزالیِ زماں رحمۃ اللہ علیہ نے دعا کیلئے ہاتھ اٹھائے اور دعا کا آغاز حمد وثناء سے کیا اور پھر دعائیہ انداز میں تقریباً ڈیڑھ گھنٹے تک حضور ﷺ کے فضائل بیان فرماتے رہے اور دعا کے خاتمے پر پولیس آفیسر کو ہوش آیا کہ کاظمی صاحب اپنے مقصد میں اس انداز سے کامیاب ہوئے ہیں کہ قانون شکنی بھی نہیں ہوئی اور تبلیغِ دین کا فریضہ بھی وہ انجام دے گئے ہیں۔

بعض اوقات حضرت غزالیِ زماں رحمۃ اللہ علیہ کو تبلیغِ دین اور اپنے مسلک کی حقانیت سے لوگوں کو روشناس کرانے کیلئے کئی صبر آزما مراحل سے گزرنا پڑتا لیکن آپ پورے صبر و تحمل اور عزم و حوصلے کے ساتھ ہر طرح کے حالات میں اپنا یہ فرضِ منصبی نبھاتے

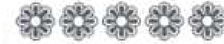
رہتے۔

مجھے یاد ہے کہ اندورنِ بوہڑ گیٹ کتب فروشوں کے بازار کا ایک غریب آدمی حاضر ہوا اور عرض کی کہ میں نے حصولِ برکت کیلئے گھر میں محفلِ میلاد کا اہتمام کیا ہے آپ قدم رنجہ فرمائیں اور اپنے مواعظِ حسنہ سے ہمیں نوازیں، چنانچہ آپ نے وعدہ فرما لیا اور عشاء کی نماز پڑھ کر اس شخص کے مکان پر پہنچے، راقم الحروف بھی ساتھ تھا، وہ شخص اپنے گھر کی دوسری منزل پر لے گیا اور وہاں حاضرین میں صرف وہ شخص خود، اس کے دولڑکے اور ایک اور آدمی تھا۔ یہ تھا وہ اجتماع جس سے اپنے دور کے غزالی نے خطاب فرمانا تھا، کوئی اور مقرر ہوتا تو اس شخص کی خوب خبر لیتا لیکن حضرت غزالیِ زماں رحمۃ اللہ علیہ کی جبیں پر شکن تک نہ آئی، آپ رحمۃ اللہ علیہ نے تقریباً ایک گھنٹہ خطاب فرمایا، وہ شخص غربت کی وجہ سے کرایہ تک نہ دے سکا لیکن آپ پوری خوش دلی کے ساتھ واپس تشریف لائے اور راستے میں فرمایا ''اگر میں اس وقت تقریر نہ کرتا تو اس شخص کی کتنی دل شکنی ہوتی اور اب وہ کتنا خوش ہے'' سبحان اللہ! یہی چیز اللہ تعالیٰ کو بہت پسند ہے۔

اسی طرح عیدگاہ چھاؤنی کے عقب میں واقع ایک محلے کے چند نوجوان حاضر ہوئے اور جلسہ عید میلادالنبی ﷺ میں شرکت کی دعوت دی، آپ حسبِ وعدہ وہاں اپنے چند شاگردوں کے ہمراہ پہنچے تو انتظام نہ ہونے کے برابر تھا، نہ تو کوئی نعت خواں اور نہ ہی کوئی تلاوت کرنے والا تھا اور ظاہر ہے کہ اس کے بغیر جلسے میں کون آتا، لیکن حضرت غزالیِ زماں رحمۃ اللہ علیہ جا کر اسٹیج پر بیٹھ گئے۔ اپنے ایک خادم سے فرمایا کہ آپ تلاوت کریں اور تلاوت کے بعد آپ نے خطاب شروع فرمایا، چند منٹ بعد چند آدمی آ گئے اور اس طرح آپ نے تقریباً دو گھنٹے خطاب فرمایا، جب آپ کی تقریر ختم ہوئی تو کوئی سلام پڑھنے والا نہیں تھا، حضرت غزالیِ زماں رحمۃ اللہ علیہ کھڑے ہو گئے اور خود ہی ترنم سے سلام پڑھا اور دعا خیر پر جلسہ ختم ہو گیا، واپسی پر کسی نیاز مند نے عرض کیا حضور! جب نعت خواں کوئی نہیں تھا تو آپ نے خود یہ زحمت کیوں فرمائی؟ سلام و قیام

ہمارے نزدیک کوئی فرض واجب تو ہے نہیں، کبھی نہ بھی پڑھا جائے تو اس میں کیا حرج ہے، حضرت غزالی زماں رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا "مولانا! یہ ہمارا تشخص ہے اور اپنے تشخص کو بلاوجہ نظر انداز کرنا مسلک کو نقصان پہنچانے کے مترادف ہے۔"

غرضیکہ دنیائے اسلام کی اس نامور علمی اور روحانی شخصیت کو اللہ تعالیٰ نے اس قدر خوبیوں اور کمالات سے نوازا تھا کہ اس کی مثال اس دور میں بہت کم نظر آتی ہے۔"



بسم اللہ الرحمن الرحیم

باب نمبر 21

جواہر پارے

حضرت غزالی زماں رحمۃ اللہ علیہ

کی علمی مجالس سے اکتساب فیض پر مبنی ڈائری کا ایک ورق

مولانا غلام دستگیر حامدی، ملتان

ماہنامہ السعید امام اہل سنت نمبر ۱۹۹۷ صفحہ ۱۰۷ تا ۱۱۰

مولانا غلام دستگیر حامدی فرماتے ہیں

امام ترمذی اور ترمذی شریف:

الامام الشیخ ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ بن سورۃ بن موسیٰ الحافظ الترمذی ۲۰۹ھ میں ترمذ، ولایت خراسان میں پیدا ہوئے، آبائی وطن ترمذ کی مناسبت سے ترمذی کہلائے، ۷۰ سال کی عمر میں ۲۷۹ھ میں وفات پائی۔

امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ کو اجلہ ائمۂ محدثین میں شمار کیا جاتا ہے، آپ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے مقلد تھے اور استنباط احکام میں بھی دخل رکھتے تھے، علومِ حدیث میں آپ کا مقام مجتہدانہ تھا اور قوی الحافظہ محدثین میں شمار کیے جاتے ہیں، محمد بن بشار قتیبہ اور دیگر مشائخ سے آپ کو روایتِ حدیث کا شرف حاصل ہے، امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ سے بھی انھوں نے حدیث روایت کی ہے، معرفت علل حدیث میں امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ کا مرتبہ بہت بلند ہے، علومِ حدیث میں امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ بہت بڑے ماہر تھے، نہایت متورع اور جلیل القدر حفاظ حدیث میں شمار کیے جاتے تھے۔

تصانیف:

امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ کی بہت سی تصانیف ہیں، جیسے (۱) شمائل ترمذی شریف، جس میں سرکارِ مدینہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارکہ، عادات و خصائل نہایت محبت بھرے انداز میں رقم فرمائے۔ (۲) کتاب العلل، (۳) جامع ترمذی شریف، امام ابو علیم ترمذی رحمۃ اللہ علیہ کی تمام تصانیف میں جامع ترمذی سب سے زیادہ عظیم، اہم اور نافع تصنیف ہے۔

خصوصیاتِ ترمذی شریف:

۱) یہ جامع، صحیح اور سنن ہے، "صحیح" اس کتاب کو کہتے ہیں جس کی تمام حدیثیں صحیح

ہوں، بجز چند قلیل حدیثوں کے سیدی حضور غزالی زماں رحمۃ اللہ علیہ نے اس موقعہ پر فرمایا "لوگ یہ تصور کرتے ہیں کہ جس کتاب کی تمام احادیث صحیح ہوں وہ (صحیح) کہلاتی ہے، حالانکہ ان معنوں میں تو امام بخاری کی "صحیح بخاری شریف" کو بھی یہ مرتبہ حاصل نہیں ہے، سنن ابوداؤد اور ترمذی میں ضعیف حدیثیں سب سے کم ہیں جبکہ امام ابنِ ماجہ میں ضعیف احادیث کی تعداد زیادہ ہے۔"

"سنن" اس کتاب کو کہتے ہیں جو فقہی ترتیب پر ہو اور "جامع" اقسام کتب حدیث میں اس قسم کا نام ہے جس میں "اقسامِ ثمانیہ" پر مشتمل احادیث جمع کی گئی ہوں، سیر، آداب، تفسیر و عقائد، فتن، احکام، اشراط و مناقب، یہ (ترمذی) تینوں خصوصیات کی حامل ہے جو صحیحین (مسلم و بخاری) کو بھی حاصل نہیں، یہ "خاصہ" نہیں بلکہ "خصوصیات" سے مراد محامد و فضائل ہیں۔

۲) صحیح ترمذی ترتیب کے لحاظ سے تمام امہات کتب حدیثہ میں سب سے زیادہ بہتر اور احسن ہے۔

۳) جامع ترمذی کی تمام احادیث کو امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے ماموربہا (جن پر عمل کیا جائے) کہا ہے، بجز دو حدیثوں کے ایک حدیث حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص کی جو شارب خمر سے متعلق ہے، دوسری حدیث حضرت عبداللہ بن عباس کی جو جمع بین الصلوٰتین سے متعلق ہے، امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے ان دونوں حدیثوں کے بارے میں "غیر ماموربہا" کہا ہے یہ قول ان کے اپنے نزدیک ہے، ہمارے (احناف) کے نزدیک یہ دونوں حدیثیں "ماموربہا" ہیں، سیدی و مولائی حضور غزالی زماں رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ان دنوں میں جبکہ میں جامعہ اسلامیہ (موجودہ اسلامیہ یونیورسٹی) بہاولپور میں مدرس (شیخ الحدیث) تھا۔

جب میں نے امام ترمذی کی ان دونوں حدیثوں کے بارے میں مذکورہ بالا تحقیق پیش کی تو دیوبندیوں اور غیر مقلدین نے طوفان کھڑا کر دیا، میں نے ان کی اپنی کتب

سے انہیں تحقیق و ثبوت پیش کیے تو ٹھنڈے پڑ گئے، پھر وہ لوگ میری یہ بات مان گئے کہ واقعی ان دونوں حدیثوں کو "غیر ماموربھا" کہنا تساہل ترمذی ہے مگر صحیح اور ماموربھا ہیں۔

دیوبندی طلباء کو مطمئن کرنے کیلئے "حد شرب خمر" کے بارے میں "العرف شذی"، صفحہ نمبر ۴۲۵ تالیف انور شاہ کشمیری کا اور غیر مقلدوں کو شوکانی کی نیل الاوطار صفحہ نمبر ۱۵۶ ساتویں جلد کا حوالہ دیا کہ دونوں حدیثوں کو ان دونوں مؤلفوں نے بھی "ماموربھا" کہا ہے، شراب پینے والے کو سزا کے بارے میں حضور ﷺ کا ارشاد پاک ہے کہ "شارب کو بار بار پینے کے جرم میں پہلے تین بار تو کوڑے مارے جائیں اور چوتھی بار پھر جرم کرے تو اسے قتل کر دیا جائے"، قتل کے بارے میں ہی امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا قتل کے اس حکم پر عمل نہیں ہوا، جس کی وجہ سے یہ حدیث "غیر ماموربھا" ہے جبکہ ہم (احناف) کہتے ہیں کہ چوتھی بار شراب پیئے تو اس کیلئے "فاقتلوہ" کا لفظ حدیث پاک میں "حد" کے طور پر نہیں بلکہ تعزیز کے طور پر جو حاکمِ وقت، اور والئی سلطنت کو اختیار کے طور پر سونپی گئی ہے کہ حالات کا جائزہ لے، جرم کی کمی زیادہ اور عبرت کے طور پر یا تو شرابی کو قتل کر دیا جائے یا کوڑے وغیرہ لگائے جائیں۔

اسی طرح "جمع بین الصلوٰتین" کے بارے میں انور شاہ کشمیری کی العرف الشذی صفحہ ۱۰۶، اور صفحہ ۱۰۷ اور شوکانی کی نیل الاوطار صفحہ ۲۲۹۔۲۳۰ جلد ثالث کا حوالہ دیا۔ حضور ﷺ نے مدینہ شریف میں نمازیں بلا خوف وعذر جمع کی ہیں، مگر "جمع بین الصلوٰتین" کسی امام کا مسلک نہیں، ہم احناف کہتے ہیں کہ یہ حدیث بھی "ماموربھا" ہے، اس میں جمع حقیقی نہیں بلکہ جمع صوری ہے کہ ظہر کا آخری وقت اور عصر کا اول وقت ہے، جو جائز ہے پھر احناف اسے جائز تو کہتے ہیں مگر ساتھ ہی یہ بھی کہتے ہیں کہ اسے عادت نہ بنایا جائے، زندگی میں بھی بوجہ مجبوری ایسا کرنا پڑ جائے تو سنت نبوی ﷺ کے طور پر اس پر عمل کر لیا جائے، نماز ہو جائے گی۔"

جامع ترمذی میں امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ کا طریق کار:

آپ ایک ترجمۃ الباب منعقد کرتے ہیں اور اسے ثابت کرنے کیلئے سب سے پہلے کوئی ایسی حدیث وارد کرتے ہیں جو ان کے نزدیک سب حدیثوں سے زیادہ قوی ہو، پھر دوسری احادیث وارد کرتے ہیں اس کے بعد "وفی الباب" کا لفظ لکھ کر اس باب سے متعلق جتنے صحابہ کرام سے احادیث مروی ہیں ان سب کا ذکر فرما دیتے ہیں اور اس سے امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ کی مراد یہ نہیں ہوتی کہ ان سب صحابہ نے جن کے نام لیے ہیں بعینہٖ اسی حدیث کو روایت کیا ہے بلکہ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ کا مطلب اس سے عام ہوتا ہے خواہ بعینہٖ یہ حدیث انھوں نے روایت کی ہو یا کوئی ایسی حدیث روایت کی ہو جو ترجمۃ الباب سے متعلق ہو۔

استنباط مسائل وعلوم:

امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ، امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی طرح مسائل کا استنباط بھی فرماتے ہیں کبھی عبارۃ النص سے، کبھی اشارۃ النص سے، اور کبھی دلالۃ النص سے، امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے تقریباً چودہ علومِ حدیث اپنی جامع میں رکھ دیے ہیں، مثلاً "احوالِ رواۃ" میں امام ترمذی کی عادت ہے کہ جس راوی کا صرف نام مشہور ہو اس کی کنیت بتا دیتے ہیں اور جس کی صرف کنیت مشہور ہو اس راوی کا نام بتا دیتے ہیں اور رواۃ کے ضعیف و قوی ہونے کی بھی تصریح فرما دیتے ہیں اور ضرورت محسوس ہو روایات کے ضعف و قوت کی طرف بھی حسبِ ضرورت اشارہ کر دیتے ہیں، اکثر و بیشتر حدیث وارد کر کے ہذا حدیث "حسن" یا ہذا حدیث "حسن، صحیح، غریب" **لا تعرفه الا من هذا لوجه**" فرما دیتے ہیں (یہ سب علومِ حدیث میں شامل ہیں) اور بعض اوقات اصطلاحاً کسی حدیث کے متعلق فرماتے ہیں " **هذا اصح شتی فی هذا الباب**۔"

حدیثِ حسن:

محدثین کے نزدیک وہ حدیث ہے جس میں حدیثِ صحیح کے سب شرائط پائے جاتے ہیں، بجز اس کے کہ کسی راوی کی عدالت یا اس کے حفظ وضبط میں کچھ کمی ہو، معلوم ہوا کہ حدیثِ حسن درجہ میں حدیثِ صحیح سے کم ہے، امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ کا ''حسن'' کو ''صحیح'' سے پہلے بیان کرنا اس نکتے پر مبنی ہے کہ متقدمین محدثین کے نزدیک'' حدیثِ صحیح''، کو ''حسن'' ہی کہا جاتا ہے۔ ''صحیح'' کی اصطلاح بعد میں متاخرین نے اختیار کی۔

حدیثِ غریب:

وہ ہے جس کی سند میں کوئی ایسا راوی آ گیا ہو جس کے ساتھ اس کی روایت میں کسی دوسرے راوی نے اس کا ساتھ نہ دیا ہو، ''روای غریب'' اگر ضعیف ہے تو اس کی روایت ضعیف ہوگی۔ اگر واری غریب قوی وثقہ ہے تو روایت صحیح ہوگی، ''غرابت'' عدمِ صحت کو مستلزم نہیں، یعنی جو ''غریب'' ہے یہ نہ کہو کہ وہ ''صحیح''، نہیں، انہی دنوں کی بات ہے کہ جبکہ حضور غزالئ زماں رحمۃ اللہ علیہ کی خدمتِ عالیہ میں درسِ حدیث لیتا تھا چند احباب نے بدمذہبوں کی صحبت کا اثر لے کر توسلِ بزرگان کا انکار کیا، سمجھانے پر ثبوت مانگے، چنانچہ ناچیز نے اپنے شیخ کے حضور حاضر ہو کر معاملہ حل کرنے کی درخواست کی، حضرت کاظمی رحمۃ اللہ علیہ نے ترمذی شریف کھولی یکبارگی وہ صفحہ ہی کھلا جو مقصود ومطلوب تھا، جس میں لکھا تھا کہ ایک نابینا بارگاہِ رسالت ﷺ میں حاضر ہوا اور آنکھوں میں بینائی کیلئے عرض کیا، حضور ﷺ نے فرمایا ''دو رکعت نفل پڑھ کر یہ دعا مانگ'' **''اللھم انی اسئلك وتوجه الیك بنبیك محمد نبی الرحمة یا محمد انی اتوجه بك الیٰ ربی فی حاجتی ھذه لیقضیٰ لی اللھم فشفعه فی''** اس نابینا صحابی نے نماز پڑھ کر یہ دعا کی

فوراً آنکھوں میں روشنی وبینائی آ گئی، یہ حدیث ودعا حاجتوں کے پورا ہونے میں اکسیر کا درجہ رکھتی ہے اور دعا بارگاہِ رب العزت میں قبول ہوتی ہے، بوسیلہ حضور ﷺ ہر طرح کی مشکل، پریشانی اور حاجت حل ہو جاتی ہے۔ طبرانی کی حدیث میں ہے کہ ایک صحابی یا تابعی کو خلیفۂ سوم حضرت سیدنا عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ سے کوئی کام پڑ گیا مگر التفات کا لمحہ نہ آیا، تو اس کی مشکل حل کرنے اور التفاتِ خلیفہ کیلئے حضرت عثمان بن حنیف رضی اللہ عنہ صحابی نے اس ضرورت مند کو مزکورہ بالا دعا بتلائی، اس نے اس پر عمل کیا تو خلیفہ کے دربان نے اسے آواز دے کر اندر بلایا اور اس کی پریشانی ومشکل دور کر دی گئی۔ زمانۂ رسالت ﷺ سے ہر قرن وزمانہ کے آئمہ دین وعلماء کرام اولیاء عظام میں آج تک مشکل ومصیبت کے وقت محبوبانِ خدا کو پکارنا معمول رہا ہے جو اس حدیث پر عمل ہے اس توسل وروحانی استمداد کا انکار دورِ حاضر کے خود ساختہ مفکروں اور مولویوں کے مطابق مان لیا جائے تو معاذ اللہ صحابہ کرام سے آج تک سب بزرگانِ دین مشرک ٹھہریں گے۔

عقیدہ کی درستگی کیلئے لازم ہے کہ بندگانِ خدا کو بارگاہِ رب العزت میں وسیلہ جانے اور ان کو باذنِ الٰہی ''المدبرات امرا'' سے مانے اور اعتقاد کرے کہ بے حکمِ خدا ذرہ بھی نہیں ہل سکتا اور اللہ تعالیٰ کے دیے بغیر کوئی شخص ایک حرف بھی نہیں دے سکتا، ایک حرف نہیں سن سکتا اور پلک نہیں ہلا سکتا، بے شک مسلمانوں کا یہی اعتقاد ہے، اس عقیدہ والے ان پر بدگمانی، بدظنی اور شرک کا الزام حرام ہے، بدظن وبدگمان گنہگار ہوگا، دراصل ''المدبرات امرا'' قرآنی آیات کے رموز وتشریح سے وہ نابلد ہیں کم علمی کی بنا پر بتوں کی آیتوں کو مسلمان پر چسپاں کرتے ہیں، اپنی دنیا وآخرت خراب کرتے ہیں، ایک اور جگہ حدیث پاک میں آیا ہے کہ مشکل کے وقت یوں کہیے **''اذ اراد عنونی یاعباداللہ''** جب استعانت کرنا اور مدد لینا چاہیے تو پکارے! اللہ کے بندو میری مدد کرو۔

ناچیز غلام دستگیر نے امامِ اہلسنت حضرت کاظمی رحمۃ اللہ علیہ سے توسل و نداء کے بارے میں سیر حاصل علمی مواد لے کر احباب کو مطمئن کیا، اس گئے گزرے دور میں حضرت کاظمی شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے اللہ تعالیٰ نے دین کی سربلندی، مقامِ نبوت و رسالت و ولایت کے دفاع کا علمی کام لینا تھا، جو آپ نے نہایت جانفشانی سے پورا کیا اور اہلسنت کو سیاسی، مذہبی، روحانی پلیٹ فارم مہیا کیے، آپ کی زندگی کا لمحہ لمحہ قرآن و حدیث کی ترویج و اشاعت میں صرف ہوا، آپ سے صحبتِ علمی و رابطہ میں ایسے لگتا تھا کہ آپ کتب سے ماورا ''الہامی'' طور پر گوہر فشانی فرما رہے ہیں۔ ایک ہی آیت یا ایک ہی حدیث پاک کی الگ الگ وقتوں میں ایسی تشریح فرماتے جو ہر نئے انداز اور علمی وسعتوں کے ساتھ مختلف ہوتی۔ طالبِ صادق کو بھلا اب ایسی مجلسیں اور محفلیں کہاں میسر آئیں گے، ایک سنہرا دور تھا جو گزر گیا، قحط الرجال کا زمانہ ہے، ناچیز کیلئے تو شیخ طریقت والشریعت حضرت مولانا حامد علی خان رحمۃ اللہ علیہ اور حضور امامِ اہلسنت کاظمی شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی علمی صحبتیں ہی سرمایۂ حیات ہیں۔

؎ زمین لوگوں سے خالی ہو رہی ہے
یہ رنگ آسمان دیکھا نہ جائے



223

بسم اللہ الرحمن الرحیم

باب نمبر 22

مفہومِ نبوت و رسالت صلی اللہ علیہ وسلم

تقریر: امامِ اہلسنت علامہ
از علامہ سید احمد سعید کاظمی رحمۃ اللہ علیہ

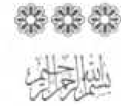
ترتیب: خلیل احمد رانا جہانیاں

ماہنامہ السعید امام اہل سنت نمبر ۱۹۹۹ صفحہ ۳۲ تا ۳۵

خلیل احمد رانا بیان کرتے ہیں کہ زیغم اسلام غزالیٔ زماں علامہ سید احمد سعید کاظمی رحمۃ اللہ علیہ نے ماہِ رمضان المبارک ۱۳۸۲ھ میں پرانا جامعہ انوار العلوم کچہری روڈ ملتان میں جو درسِ قرآن مجید دیا تھا، اس میں ۸ رمضان المبارک ۱۳۸۲۔۳ فروری ۱۹۶۳ء کو اتوار کے دن جو تقریر فرمائی، اسے ہمارے محترم برادر محمد مختار احسن مرحوم ایم اے (ملتان) نے قلمبند کر لیا تھا، عرصہ ہوا مرحوم کے چھوٹے بھائی پاکستان کے مشہور خطاط ابن کلیم کی مملوک بیاض سے احقر نے ایک دوست کے ذریعے نقل کر لیا تھا۔ اب حضرت غزالیٔ زماں رحمۃ اللہ علیہ کے سالانہ عرس کے موقع پر ماہنامہ ''السعید'' کیلئے ترتیب دے کر قارئین کی نذر کر رہا ہوں۔

(والسلام) ناکارہ، خلیل احمد رانا

❀❀❀



''نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم''

نبوت اور رسالت کے متعلق کچھ عرض کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ پہلے ہم نبوت ورسالت کے حقیقی مفہوم سے ذہن کو آشنا کر لیں۔

نبوت ورسالت میں فرق:

اصطلاح سے قطع نظر ہر نبی، رسول ہے، اصطلاح کی قید اس لیے لگائی کہ اصطلاح میں رسول اس کو کہتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نئی شریعت لے کر آئے، پس اصطلاح سے قطع نظر ہر نبی، رسول یعنی پیغامبر ہوتا ہے، کوئی نبی ایسا نہیں جو خدا کا پیغام نہ لائے، ہر نبی خدا کا پیغام لانے والا اور رسول ہوتا ہے لیکن ہر رسول کا نبی ہونا ضروری نہیں، اس لیے کہ نبی انسانوں کیلئے خاص ہے، نبی انسانوں کے علاوہ اور کوئی نہیں ہوسکتا اور رسول عام ہے، جیسا کہ رسول ملائکہ میں بھی ہیں اور جنوں میں بھی

ہیں، جیسے حضرت جبرائیل، حضرت میکائیل علیہم السلام، رسول تو ہیں لیکن نبی نہیں، پس جو انسانوں میں سے نہ ہو اور اس کو رسالت دی جائے وہ رسول تو ہے مگر اس کو نبی نہیں کہتے، شاید کوئی سمجھے کہ جس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی نازل ہو تو وہ رسول ہوتا ہے اور نبی ہوتا ہے، تو یہ غلط ہے کیونکہ وحی تو ایک تیز اشارے کو کہتے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے اس قسم کے اشارات انسانوں کے علاوہ دیگر مخلوقات کی طرف بھی فرمائے اور انسانوں میں انبیاء کے علاوہ دیگر لوگوں کے بارے میں بھی اشارات فرمائے چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ''اذا اوحینا الیٰ امک مایوحیٰ''

(طٰہٰ، ۳۸)

ترجمہ ''جب ہم نے غیبی اشارہ سے آپ کی والدہ کو وہ بات سمجھائی جس کی وحی آپ کو کی جارہی ہے۔''

اب یہاں دیکھئے قرآن مجید سے ثابت ہو رہا ہے کہ حضرت سیدنا موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کی طرف وحی ہوئی، لیکن عورت نبی نہیں ہوسکتی نبوت تو صرف مرد انسانوں کیلئے ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ نے حضرت مریم سلام اللہ علیہا کے بارے میں فرمایا'' فارسلنا الیها روحنا فتمثل لها بشرا سویا. قالت انی اعوذ بالرحمن منک ان کنت تقیا. قال انما انا رسول ربک لاهب لک غلما زکیا''

(المریم، ۱۷، ۱۸، ۱۹)

ترجمہ ''تو ہم نے ان کی طرف اپنے فرشتے (جبرائیل) کو بھیجا تو اس نے اس (مریم) کے سامنے تندرست آدمی کی صورت اختیار کی، مریم بولیں میں تجھ سے رحمٰن کی پناہ لیتی ہوں (میرے قریب مت آ) اگر تو متقی ہے (جبرائیل) نے کہا'' اے مریم! اس کے سوا کچھ نہیں کہ میں تمہارے رب کا بھیجا ہوا ہوں تاکہ تمہیں پاک بیٹا دوں۔''

اب دیکھئے کہ وہ رسول یعنی حضرت جبرائیل علیہ السلام ایک بشر کامل کی شکل میں متشکل ہو گئے، جب حضرت مریم نے ان کو شکل بشر میں دیکھا تو سمجھا کہ واقعی کوئی بشر ہے، وہ

مقدسہ بندی تھیں، فوراً پناہ مانگی اور کہا کہ اگر تم متقی ہو تو مجھ سے فوراً دور ہو جاؤ، اس نے کہا، اس کے سوا میں کچھ بھی نہیں کہ آپ کے رب کی طرف سے قاصد ہوں اور آپ کو رب کی طرف سے ایک پاک بیٹا دینے آیا ہوں۔

یہاں جبرائیل علیہ السلام نے جب یہ بات فرمائی تو متکلم کے صیغے کے ساتھ بیان کی کہ میں تم کو ایک بیٹا دینے آیا ہوں حالانکہ بیٹا دینا اللہ تعالیٰ کا کام ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ معطی حقیقی یعنی حقیقت میں عطا کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے اور جب اللہ کا بندہ کسی کو کچھ عطا کرتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کے اذن سے دیتا ہے، اس لیے جبرائیل علیہ السلام نے کہا کہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو بیٹا دینے آیا ہوں۔

اس کے علاوہ دیگر ملائکہ کو بھی اللہ تعالیٰ نے اپنے بعض بندوں کی طرف بھجا اور ان کو شرفِ مکالمہ سے نوازا اور فرشتوں نے ان کے ساتھ باتیں کیں۔

شہید کی مکھی کو وحی:

اللہ تعالیٰ نے سورہ النمل میں فرمایا" واوحی ربک الی النحل ان تخذی من الجبال بیوتا ومن الشجر ومما یعرشون"

(پ۱۴، النحل، ۶۸)

ترجمہ" اور آپ کے رب نے شہد کی مکھی کے دل میں ڈالا کہ پہاڑوں میں گھر بنا اور درختوں میں اور ان چھپروں میں جنھیں لوگ اونچا بناتے ہیں۔"

(البیان ترجمۃ القرآن، از علامہ سید احمد سعید کاظمی رحمۃ اللہ علیہ)

اب دیکھیے! یہاں قرآن حکیم بتارہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے شہد کی مکھی کی طرف وحی کی، لیکن یہاں نبوت کا تصور بھی نہیں، بہر حال یہ سمجھنا کہ جس کی طرف بھی وحی ہو جائے وہ نبی یا رسول ہے، غلط ہے، پس نہ فقط وحی سے اور نہ جبریل کے آنے سے نبوت ملتی ہے کہ جبریل تو حضرت مریم کے پاس آئے ہیں، نبوت تو ایک اور چیز ہے، یہ تو اللہ کا انعام ہے جو ان سب چیزوں سے الگ ہے۔

اب پہلے میں نبوت اور رسالت کے وہ معنیٰ جو انسانوں کے حق میں ہیں بیان کردوں کیونکہ اس وقت ملائکہ کی رسالت سے گفتگو نہیں بلکہ انسانوں کی نبوت اور رسالت کا بیان ہے۔

نبوت کی تعریف:

نبوت کی تعریف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے کسی مقدس ومطہر اور پاک بندے پر ایسی وحی نازل فرمائے کہ اس کلام، وحی یا خطاب کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کا حکم اس کے ذمہ عائد ہو جائے یا اس پر کسی چیز کو واجب کر دیا جائے اور وہ چیز پہلے اس پر واجب یا ضروری نہ تھی، اب واجب اور ضروری ہو گئی پس جس مقدس بندے کو اللہ تعالیٰ فرشتے کے واسطے یا واسطے کے بغیر کوئی ایسا پیغام دے یا کوئی ایسا خطاب کرے یا کوئی ایسی وحی فرمائے کہ جس وحی، خطاب یا متکلم کی وجہ سے اللہ کے اس بندہ پر وہ چیز جو پہلے اس پر واجب نہ تھی، اب فرض، واجب اور لازم ہو گئی...... یہ کلام، یہ وحی اور اللہ تعالیٰ کے اس بندے کا اس لازمی امر کیلئے مامور ہونا نبوت ہے اور یہ بات سوائے نبی کے کسی اور کیلئے ثابت نہیں ہو سکتی۔

ایک ضمنی مسئلہ:

فقط اللہ تعالیٰ کا مخاطبہ نبوت نہیں ہے ملائکہ کے ذریعے اللہ تعالیٰ کا تخاطب اپنے بندوں کے ساتھ ہوتا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اولیاء اللہ کے بارے میں ارشاد فرمایا"

لھم البشریٰ فی الحیوۃ الدنیا وفی الاخرۃ" (سورۃ یونس)

(الیونس)

یعنی ان کیلئے خوش خبری ہے دنیا میں اور آخرت میں بھی، اس بشارت کی تفسیر، حدیث میں یوں کی گئی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا" مومن اور بالخصوص مومن صالح اور اللہ تعالیٰ کا مقرب محبوب، جب اس کی موت کا وقت قریب آتا ہے تو وہ

موت کو پسند نہیں کرتا، موت کو پسند نہ کرنا انسان کی جبلت میں ہے، اسی حدیثِ قدسی میں جس میں کہا گیا ہے کہ میں اپنے بندے کے کان ہو جاتا ہوں، آنکھیں، ہاتھ اور پاؤں ہو جاتا ہوں، یہ طویل حدیث ہے، اس کے آخر میں ہے ''وما ترددت عن شئی انا فاعله ترددی عن نفس المومن یکره الموت وانا اکره مساء ته وفی بعض النسخ والابدله منه رواه البخاری''

(صحیح بخاری مطبوعہ مجتبائی دہلی جلد دوم صفحہ ۹۶۳)

ترجمہ ''اور میں توقف نہیں کرتا کسی شے میں جیسے میں کرنے والا ہوں، مثل میرے توقف کے مومن کی جان قبض کرنے سے کہ وہ (بحکمِ طبیعت) موت کو ناخوش رکھتا ہے اور میں اس کے غمگین ہونے کو ناپسند رکھتا ہوں اور بعض نسخوں میں ہے کہ حال یہ ہے کہ بندے کو موت سے چارہ نہیں، اس حدیث کو بخاری نے روایت کیا ہے۔''

یعنی میں کسی کام میں جو کہ میں کرنا چاہتا ہوں، دیر نہیں کرتا اور کبھی اتنی تاخیر نہیں فرماتا، جتنی دیر اس مومن کی موت کو واقع کرنے میں کرتا ہوں اس لیے کہ وہ موت کو ناپسند کرتا اور میں اس کے موت کو ناپسند کرنے کو ناپسند کرتا ہوں اور مجھے اس بندے کی ملاقات بڑی محبوب ہوتی ہے، پھر انجام کیا ہوتا ہے؟ یہ بات اگر کسی کے ذہن میں آجائے تو میرا مدعا بھی حل ہو جائے۔

مومن کو مرتے وقت بشارتیں:

جب اللہ کا بندہ موت سے کراہت کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس وقت اپنی حکمتِ بالغہ سے کام لیتا ہے اور جانتا ہے کہ میرا بندہ موت کو طبعاً پسند نہیں کرتا تو اس وقت اللہ تعالیٰ اپنے فرشتے بھیجتا ہے اور وہ فرشتے اللہ کے اس بندے کے سامنے اللہ تعالیٰ کی طرف سے بشارتیں لے کر آتے ہیں پس جو اعزاز و اکرام، راحتیں اور لذتیں اللہ تعالیٰ کے یہاں اپنے بندے کیلئے مقدر ہیں، فرشتے جب یہ بشارتیں لے کر اس کیلئے نازل ہوتے ہیں تو ان بشارتوں کو دیکھتے ہی اس بندے کی طبعی کراہت ختم ہو جاتی ہے اور اس

میں اشتیاق پیدا ہو جاتا ہے اور مسرور ہو کر مسکراتا ہے۔

نشانِ مرد مومن باتو
چوں مرگ آید تبسم برلب

(علامہ محمد اقبال ؒ)

پتہ چلا کہ اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں اور صالحین پر فرشتے بشارتیں لاتے ہیں، گویا اللہ تعالیٰ فرشتوں کے واسطے سے تخاطب فرماتا ہے، مگر اس کے باوجود وہ بندے اللہ کے نبی نہیں ہوتے، نبوت کا مقام اس سے بہت بلند ہے اور صرف ایسا تخاطب نبوت نہیں ہوتی، پس جو اللہ تعالیٰ کا مامور ہو اور اللہ تعالیٰ اسے اپنی وحی اور پیغام کے ذریعے بالواسطہ یا بلاواسطہ تخاطب فرمائے اور مخاطب اور مامور فرمائے تو وہ نبی ہے، ورنہ وحی تو شہد کی مکھی کی طرف بھی کی گئی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کی طرف بھی ہوئی۔

اگر یہ بات ذہن نشین کر لی جائے تو بہت سی گمراہیوں سے نجات حاصل ہو سکتی ہے اور نبوت کا جو معنیٰ اور مفہوم میں نے عرض کیا ہے اگر اس کو ذہن نشین رکھا تو اگلی بات اچھی طرح سمجھ سکیں گے۔

یہ بات تو سب مسلمان جانتے ہیں کہ نبوت حضرت آدم علیہ السلام سے شروع ہوئی اور حضور ﷺ پر ختم ہوگئی، یہ کوئی عالمِ ارواح کی بات نہیں، یہاں کی بات ہے اور یہ مسئلہ ضروریاتِ دین سے ہے، اس پر ایمان لانا شرط ہے کیونکہ جو حضور اکرم ﷺ کو آخری نبی نہیں مانتا وہ مرتد اور کافر ہے، پس حضور اکرم ﷺ خاتم الانبیاء ہیں اور آپ ﷺ کے بعد قیامت تو کیا ابد تک کوئی نبی پیدا نہیں ہو سکتا۔

اب وہ لوگ جنھوں نے ختم نبوت کے متعلق ایسی باتیں شروع کر دیں کہ جن میں نہ کوئی عقلی بات ہے اور نہ دلائل، ان کی یہ باتیں دلائل اور سمعیات وغیرہ سب سے عاری ہیں غلط تو جبھی اس انداز سے کی گئی ہیں کہ حیرت ہوتی ہے کہ اس زمانہ میں کس طرح باطل کو حق کا لباس پہنا کر لوگوں کے سامنے پیش کیا جاتا ہے، حضور اکرم

ﷺ نے فرمایا کہ میں آخر نبی ہوں، پس آپ ﷺ کے بعد کوئی نبی پیدا نہ ہوگا لیکن فرقۂ مرتدہ مرزائیہ کہتا ہے کہ تشریعی نبوت ختم ہوئی ہے اور جو نبوت تشریعی نہیں ہے وہ ختم نہیں ہوئی وہ چلے گی۔ (لاحول ولا قوۃ الا باللہ)

تشریعی نبوت:

آج تک ''تشریعی نبوت'' کا کوئی واضح مفہوم یہ لوگ نہیں بتا سکے، جو اس تشریعی نبوت کی آڑ لے کر ختمِ نبوت کا انکار کرتے ہیں ہم نے کہا کہ نبوتِ تشریعی کا مفہوم تو بتاؤ کہ وہ کیا ہے؟ تو انھوں نے بتایا کہ جس نبوت میں احکام نازل کیے جائیں وہ نبوت تشریعی ہے اور جس میں احکام نہ ہوں وہ غیر تشریعی ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے احکام کی آمد ختم ہوگئی، پس جس نبوت میں احکام نہ ہوں وہ نبوت چلے گی، ہم نے پوچھا کہ احکام کی تشریح کیا ہے؟ انھوں نے کہا کہ ''حکم'' کے معنیٰ یہ ہیں کہ کسی چیز پر کسی کو ضروری اور لازمی قرار دینا یا جو چیزیں پہلے لازمی اور ضروری تھیں ان سے رعایت دینا۔

ہم نے کہا کہ پھر تو غیر تشریعی ہرگز کوئی نبوت نہیں، نبوت تو ہوتی ہی وہ ہے جو تشریعی ہو اور جس میں کوئی حکم نہ ہو وہ تو نبوت ہی نہیں، اب تک میں آپ کی خدمت میں نبوت کا جو مفہوم واضح کرنا چاہتا تھا اس کا مطلب اور مقصد یہی تھا کہ جب اللہ تعالیٰ وحی فرمائے اور اس وحی کے نتیجے میں احکام مرتب ہوں وہ نبوت ہے محض وحی کا نزول نبوت ثابت نہیں کرتا، معلوم ہوا کہ نبوت کی دو قسمیں کرنا غلط ہے، کیونکہ جب نبوت کے معنیٰ ہی یہی ہیں کہ جہاں ''حکم'' ہو وہاں نبوت ہے اور جہاں حکم نہیں وہاں نبوت نہیں، اب جس غیر تشریعی نبوت کا تم ڈھنڈورا پیٹتے ہو وہ تو کوئی نبوت ہی نہیں، اس کو نبوت کہنا غلط ہے۔

دیکھیے میں چاہتا ہوں کہ اس انداز سے کہوں کہ کسی کا ذہن الجھنے نہ پائے، میں نے اب تک جو کچھ کہا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کوئی حکم جب کسی بندے کو

فرشتے کے واسطے یا واسطے کے بغیر دے یہی نبوت ہے۔

اب ایک تو ہے ''نبوت'' اور ایک ہے ''فیضانِ نبوت'' نبوت تو حضور اکرم ﷺ پر ختم ہوگئی اور فیضانِ نبوت جاری رہے گا کیونکہ اگر فیضانِ نبوت کا دروازہ بھی بند ہو جائے تو پھر نبی کا فیض کسی تک نہیں پہنچ سکتا، پس وہ فیضانِ نبوت، جو باقی ہے، اس کو حضور نبی کریم ﷺ نے مبشرات سے تعبیر فرمایا بلکہ حضور نبی کریم ﷺ نے اجزائے نبوت سے تعبیر فرمایا، اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب اجزائے نبوت کہا وہ تو نبوت سے متعلق ہیں پھر تو نبوت باقی ہوئی۔

تو سنئے حضور اکرم ﷺ نے فرمایا ''لم يبدمن النبوة الامبشرة'' یعنی نہیں باقی رہی نبوت سے کوئی چیز مگر مبشرہ'' ہم اسے نبوت کا جز و مجازاً کہتے ہیں اور دراصل یہ مبشرہ ہے، اگر یہ ہی نہ ہو تو دنیا میں کوئی فیوض و برکات نہ پھیلیں۔

اگر محض سچے خوابوں کا نام نبوت رکھ دیا جائے تو پھر وہ کون سا مسلمان ہے جس کو کبھی سچا خواب نہ آئے، اس طرح تو ہر مسلمان نبی ہو جائے گا کیونکہ ہر مسلمان کو کبھی نہ کبھی تو سچا خواب آ ہی جاتا ہے، اللہ تعالیٰ آدمیوں کو سوتے ہوئے بھی مبشرات دے دیتا ہے اور فرشتوں کے ذریعے جاتے ہوئے بھی دے دیتا ہے، پتہ چلا کہ مبشرات کے معنیٰ نبوت نہیں، مبشرات تو درحقیقت فیضانِ نبوت ہے اور یہ جاری ہے اور جاری رہے گا۔ (انشاء اللہ)

نبوت کا ظل بھی فیضانِ نبوت ہے، حضور ﷺ کی اتباع، حضور ﷺ کا ظل ہے اور ظل کو نبوت سے تعبیر کرنا بظاہر نبوت پر ظلم ہے بلکہ اپنے آپ پر ظلم ہے کہ کفر میں پڑنا ہے۔ دراصل یہ لوگ غلط بیانی سے کام لیتے ہیں کیونکہ مرزا قادیانی نے تو تشریعی نبوت کا دعویٰ کیا ہے اور اسی کو حقیقی نبوت کہتے ہیں، مرزا قادیانی نے اسی حقیقی نبوت کا دعویٰ کیا کیونکہ اس نے بار بار کہا میں خدا کا مامور ہوں اور یہاں تک کہ اس نے اپنے نہ ماننے والوں کو خارج از اسلام سمجھا، پتہ چلا کہ اس نے ماموریت قطعیہ کا دعویٰ کیا اور

س کا یہ دعویٰ جھوٹا ہے جب اس کے دعوے کے مطابق اس پر ایمان نہ لانا کفر کا سبب ہے تو ایمان وکفر کے مسئلہ میں کم از کم ایک حکم کا اضافہ تو ہو گیا اب تک تو کہتے تھے کہ یہ غیر تشریعی نبی ہے، جب ایک حکم بھی ثابت ہو گیا تو یہ دعویٰ تو باطل ہو گیا۔

مفہوم رسالت:

''نبوت اور رسالت'' مفہوم اور معنیٰ کے لحاظ سے رسل بشر کے حق میں یکساں ہیں، نبوت کے ساتھ ساتھ رسالت کے مفہوم کو بھی عرض کرتا ہوں کہ رسالت ایک تعلق اور ربط کا نام ہے، اگر وہ ربط نہ ہو تو رسالت کا کوئی مفہوم نہیں، وہ ربط ایک علمی، عملی اور باطنی تعلق ہے، جسے ہم نبوت سے تعبیر کرتے ہیں، اگر نبی یا رسول کا کوئی معنوی رابطہ مرسل الیہ کے ساتھ نہ ہو تو اس رسول کی رسالت کے کوئی معنیٰ نہ بنیں گے اور اس رسول کا ہونا مرسل الیہ کیلئے بالکل بے معنیٰ ہوگا۔

رسول کے معنیٰ یہ ہیں کہ جس کی طرف وہ رسول بن کر آیا، اس سے ایک اندرونی نسبت ہے، جس سے نبی کا فیض پہنچ رہا ہے، اب اگر وہ قبول کرے تو خوش نصیب ہے اور جو نہ کرے وہ بد بخت ہے، سورج تو سب پر پھیلا ہوا ہے، ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ وہ ہم پر بھی روشن ہے، اور ایک نابینا ہے اس پر بھی سورج کی روشنی ہے، لیکن وہ نہ دیکھ سکے گا، اب سورج کی شعاعوں نے تو نابینا سے رابطہ قائم کر لیا لیکن اس کی آنکھوں میں نور نہیں، وہ نور کے بغیر نور سے کس طرح رابطہ قائم کر سکتا ہے اور وہ سورج کی روشنی سے کس طرح فائدہ اٹھا سکتا ہے؟

اب سمجھ لو کہ رسالت کا آفتاب طلوع ہوا تو اس کا نور تو ہر طرف پھیلا ہوا تھا یہ روشنی اور یہ اجالا سیدنا صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ پر بھی پڑ رہا تھا اور ابو جہل پر بھی پڑ رہا تھا، ابو جہل چونکہ خود نور سے محروم تھا، اس لیے آفتابِ رسالت سے کوئی رابطہ نہ پیدا کر سکا اور کچھ حاصل نہ کر سکا۔

اب اگر کوئی یہ کہے کہ آفتاب زمین کیلئے ہے مگر آفتاب کی کوئی شعاع زمین کے

فلاں حصے پر نہیں پڑتی تو یہ غلط ہے کیونکہ آفتاب جب چمکتا ہے تو اس کی شعائیں ہر چیز پر پڑتی ہیں یہ علیحدہ بات ہے کہ کسی چیز میں آفتاب کی شعاعوں سے مستفیض ہونے کی صلاحیت ہی نہ ہو۔

اس طرح حضور نبی کریم ﷺ جو کہ آفتاب نبوت ہیں، آپ ﷺ کا عالموں کا رسول اور نور ہونا تب صحیح ہوگا جبکہ آپ ﷺ کے نورِ رسالت کی شعائیں ہر عالم کی چیز پر پڑ رہی ہوں آپ یقین جانئے کہ حضور ﷺ کا نورِ رسالت ہے تو آپ کا تعلق عالم کے ہر ذرہ ذرہ سے ہے، جب میرے آقا ﷺ تمام عالموں کے رسول ہیں تو آپ ﷺ کا ہر چیز کے ساتھ علمی اور عملی رابطہ قائم ہے، رسالت میں ارتباط ہے اور یہی رابطہ قائم ہونا حضور اکرم ﷺ کے حاضر و ناظر اور تمام کائنات کے عالم ہونے کا مفہوم ہے، اگر آپ ﷺ کا تعلق عالم کے ہر ذرہ سے نہیں اور رابطہ نہیں تو میں پوچھتا ہوں کہ آپ ﷺ عالمین کے کیسے رسول ہیں؟ ارے! حضور ﷺ جس کی طرف رسول بن کر آئیں وہ تو رسول کو پہچانے، عالم کی ہر چیز تو رسول کو پہچان لے اور حضور ﷺ کو پتہ نہ ہو۔ (معاذ اللہ)

ایک مرتبہ حضور نبی کریم ﷺ کے سامنے ایک گوہ لائی گئی، آپ ﷺ نے پوچھا میں کون ہوں؟ اس نے کہا ''**انت رسول رب العلمين وخاتم النبيين**''

(امام عبد الرحمٰن ابن جوزی المتوفی ۵۹۷ھ، الوفا باحوال المصطفیٰ، (اردو ترجمہ) مطبوعہ لاہور، ص ۴۸۶...... حافظ نعیم احمد بن عبد اللہ اصبہانی المتوفی ۴۳۰ھ، دلائل النبوۃ (عربی) مطبوعہ مکہ مکرمہ ۱۳۹۷ھ ۱۹۷۷ء ص ۳۲۲...... علامہ یوسف بن اسمٰعیل نبہانی شافعی المتوفی ۱۳۵۰ھ حجۃ اللہ علی العلمین (عربی) مطبوعہ فیصل آباد، ص ۴۶۵)

ارے! وہ تو حضور ﷺ کو پہچان گئی اور حضور ﷺ کو علم نہ ہو اُمت کو تو علم ہو اور رسول کو علم نہ ہو۔ (نعوذ باللہ)

پس جب اٹھارہ ہزار عالم کے آپ ﷺ رسول ہیں تو اٹھارہ ہزار عالم کا کوئی ذرہ

ایسا نہیں جو مصطفیٰ ﷺ کے دامن علم میں نہ ہو، میں اپنے کلام کو سمیٹ کر اس کا خلاصہ بیان کرتا ہوں کہ نبی کی نبوت اور رسالت کا علمی اور عملی تعلق ہے، اگر رسول اپنے مرسل الیہ کے ساتھ علمی اور عملی تعلق نہ رکھے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ رسول نہیں، حضور نبی اکرم ﷺ چونکہ تمام عالموں کیلئے رسول ہیں، لہٰذا کائنات کا کوئی ذرہ نہیں کہ جس کو حضور ﷺ کی علمی اور عملی نسبت سے تعلق نہ ہو۔

علمی رابطہ سے مراد یہ ہے کہ کائنات کا ہر ذرہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے حضور اکرم ﷺ کے دامنِ اقدس میں ہے کہ حضور ﷺ کو پہچانتا ہے اور عملی رابطہ ونسبت سے مراد یہ ہے کہ وہ اپنے وجود وبقا میں حضور اکرم ﷺ کا محتاج ہے، اگر حضور نبی کریم ﷺ کے نور مبارک (جو واسطہ تخلیق ہے) سے اس کا رابطہ کٹ جائے تو اس ذرہ کا وجود نیست ہو جائے۔

پس اب اگر زبان سے تو نبی اور رسول کہے جاؤ لیکن نبی اور رسول کے جو معنیٰ ہیں ان کو ذہن میں ہی نہ آنے دو اور اس سے بے خبر رہو یہ تو بالکل غلط ہے۔

ایک سوال:

ایک دوست نے سوال کیا ہے کہ ہم نماز میں کہتے ہیں ''**اھد نا الصراط المستقیم**'' اے اللہ! ہم کو سیدھی راہ دکھا، سیدھی راہ دکھانا سے مراد ہدایت کرنا ہے اور سیدھی راہ دکھانے والا اللہ تعالیٰ ہے تو پھر انبیاء علیہم السلام کے ہادی ہونے کا کیا مطلب ہے کیا نبی ہدایت نہیں دے سکتا؟ اس شبہ کے متعلق عرض ہے کہ بیشک اللہ تعالیٰ ہی سیدھی راہ دکھاتا ہے لیکن انبیاء کرام علیہم السلام کے ذریعے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا'' **لکل قوم ھاد**''

(الرعد،۷)

یعنی ہر قوم کیلئے ہادی ہوتا ہے یہاں ہادی سے مراد نبی ہے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا'' **انك الیٰ صراط مستقیم**''

(الشوریٰ،۵۲)

یعنی میرے حبیب (ﷺ) بلاشبہ سیدھے راستے کی طرف تو ہی تو ہدایت کرتا ہے۔

اب آپ کہیں گے کہ اگر ایسی بات ہے تو پھر قرآن کریم کی اس آیہ مبارکہ کا کیا مطلب ہے؟'' **انک لا تھدی من اجبت ولکن اللہ یھدی من یشاء** ''

(القصص،۵۶)

یعنی اے حبیب (ﷺ) تو جسے چاہے ہدایت نہیں دے سکتا، اللہ جسے چاہے ہدایت دے۔

ارے بھائی! یہ بتاؤ کہ کیا اللہ تعالیٰ کی مشیت کے بغیر بھی کوئی نبی کچھ کر سکتا ہے؟ یہ تو ہزاروں مرتبہ ہم نے بتایا کہ نبی کوئی کام اللہ تعالیٰ کی مرضی اور اذن کے بغیر نہیں کرتا، نبی جب کوئی ہدایت کرے گا تو اللہ تعالیٰ کی مشیت کے تحت ہو کر کرے گا اور اللہ تعالیٰ ہدایت کرے گا تو کسی مشیت کے ماتحت ہوئے بغیر ہدایت فرمائے گا۔

پس آیہ مبارکہ کا مقصد تو یہ ہے کہ میں کسی کی مشیت کے بغیر کسی کو ہدایت دے سکتا ہوں لیکن اے نبی! تو میری مشیت کے ساتھ ہدایت کرے گا اور اگر میری مشیت نہ ہو تو ہدایت نہیں کر سکتا، اب اگر کوئی اس کا انکار کرتا ہے کہ تو وہ اس آیہ مبارکہ کا انکار کر رہا ہے جس میں فرمایا'' **انک الی صراط مستقیم** ''، یعنی تحقیق بلاشبہ میرے حبیب! (ﷺ) لوگوں کو سیدھے رستے کی ہدایت تو ہی کرتا ہے'' ارے! اللہ تعالیٰ تو اتنی تحقیق کے ساتھ فرما رہا ہے اور اللہ تعالیٰ کی تحقیق پر جسے یقین اور اعتبار نہ ہو تو اسے میری بات پر کیا یقین ہوگا۔

لہٰذا اس آیہ مبارکہ کا مطلب صاف اور واضح ہے کہ میرے پیارے حبیب! (ﷺ) میری ہدایت کسی کی مشیت کے تحت نہیں اور تیری ہدایت میری مشیت کے تحت ہے، اب ایک بات اہل علم کیلئے کہے دیتا ہوں کہ ہدایت کا لفظ جب قرآن و

حدیث میں استعمال ہو تو اہلسنت کے نزدیک اس کے حقیقی اور شرعی معنیٰ '' خلق الاھتدا '' یعنی ہدایت اس کے معنیٰ میں '' بیان الطریق الصواب '' یعنی ٹھیک راستہ بتا دینا، تو اس لحاظ سے معتزلہ '' لکل قوم ھاد '' کا مطلب لیتے ہیں کہ ہر قوم کیلئے سیدھا راستہ بتانے والا۔'' ہم اہلسنت کہتے ہیں کہ یہ معنیٰ بھی ٹھیک ہیں، مگر یہی معنیٰ کیے جائیں تو آیہ مبارکہ '' انک لا تھدی من احببت ولکن اللہ یھدی من یشاء '' کے معنیٰ ہوں گے کہ '' اے نبی (ﷺ)! تو جس کو محبوب رکھے اس کے سامنے صحیح راستہ بیان نہیں کرسکتا، ہاں اللہ جس کیلئے چاہے صحیح راستہ بیان کردے، تو یہ آیہ معتزلہ کے ان معنیٰ (لکل قوم ھاد) یعنی ہر قوم کیلئے سیدھا راستہ بتانے والا کوئی رد کرتی ہے کیونکہ انبیاء علیہم السلام کا کام تو صحیح راستہ بتانا ہی ہے، جس کے یہاں نفی ہو رہی ہے تو ثابت ہوا کہ اہلسنت کے معنیٰ درست ہیں۔ '' خلق الاھتداء '' اہلسنت کا عقیدہ ہے جس کے معنیٰ یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ '' اے نبی (ﷺ) تو ہدایت کی صفت خلق نہیں کرتا، اللہ تعالیٰ جس کیلئے چاہے خلق کردے '' پس معلوم ہو کہ خلق کرنا حضور نبی کریم ﷺ کی صفت نہیں، یعنی ہدایت کا پیدا کرنا اللہ تعالیٰ کا کام ہے اور اس کو چلانا حضور ﷺ کا کام ہے جو کام حضور ﷺ کا نہیں اسکے نہ کرنے سے نہ تو حضور ﷺ کے علم میں کمی آئے گی، نہ اختیارات میں اور نہ مرتبہ میں، حضور ﷺ کا کام تو اللہ تعالیٰ کی ہدایت پر لوگوں کو چلانا ہے، اب اگر کوئی اعتراض کرتا ہے کہ فلاں شخص کو حضور ﷺ نے ہدایت نہ دی تو یہ اعتراض اللہ تعالیٰ پر کرے کہ اے اللہ تو نے ان کو ہدایت کیوں نہیں دی تو تو ہر چیز پر قادر ہے۔'' ارے بھائی! جب اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کیلئے ہدایت خلق ہی نہیں فرمائی، تو حضور ﷺ پر کیسے اعتراض آئے گا کہ آپ نے ان کو ہدایت نہ دی، حضور ﷺ کا ہر کام اللہ تعالیٰ کی مشیت کے ماتحت ہے اور اللہ تعالیٰ کا کوئی کام کسی کی مشیت کے ماتحت نہیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے '' وما الا ان یشاء اللہ ''

(الدھر، ۳۰)

یعنی اور تم نہیں چاہ سکتے جب تک اللہ نہ چاہے۔''

آیت '' **انك لاتھدی من احببت** '' کے معنیٰ یہ نہیں کہ حضور ﷺ ہدایت نہیں دے سکتے، اگر حضور ﷺ ہدایت نہیں دے سکتے تو آیت '' **ھوا الذی ارسل رسوله بالھدیٰ** ''

(الفتح)

یعنی وہ وہی ہے بھجا جس نے اپنے رسول کو ہدایت کے ساتھ، کے کیا معنیٰ ہوں گے؟

'' **انك لا تھدی من احببت** '' کے معنیٰ یہ ہیں کہ اے میرے حبیب (ﷺ)! خالق کائنات میں ہوں، ہر چیز کا پیدا کرنے والا میں ہوں، عدم سے وجود میں لانے والا میں ہوں، ایجاد میری صفت ہے، موجد میں ہوں، اس لیے '' خلق الاہتداء '' یعنی ہدایت کو پیدا کرنا میری شان ہے، جس کیلئے میں نے اہتداء کو پیدا کردیا، اس کیلئے اہتداء کو جاری کرنے والا تو ہے '' انک لاتھدی '' کا معنیٰ یہ نہیں کہ آپ ﷺ ہدایت نہیں دے سکتے بلکہ اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ '' **انك لاتخليق الاھتداء** '' یعنی بیشک آپ ہدایت خلق نہیں کرتے، خلق الاہتداء حضور ﷺ کا کام نہیں ہے، اس میں حکمت یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ جانتا تھا کہ جن کیلئے میں نے اپنے علم ازلی کے مطابق ہدایت پیدا نہیں کی، ان کو میں ہدایت نہیں دوں گا، کیونکہ میرے علم کے خلاف کوئی ظہور ممکن نہیں، بتایئے کہ جو چیز اللہ تعالیٰ کے علم کے خلاف ہو، کیا وہ ہوسکتی ہے؟ ہرگز نہیں ہوسکتی تو جن لوگوں کیلئے اللہ تعالیٰ نے ہدایت کو پیدا نہیں فرمایا، ان میں ہدایت کی استعداد نہ تھی، تو اب بتایئے کہ ان لوگوں کو ہدایت نہ ملنے کا الزام حضور ﷺ پر کیسے آسکتا ہے۔''

(وما علینا الاالبلاغ المبین)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

باب نمبر 23

الصلوٰۃ والسلام علیٰ سیّدنا الانام

حضرت غزالیٔ زماں رحمۃ اللہ علیہ

کا اذان سے پہلے اور بعد درودِ پاک پڑھنے کے ثبوت میں خطاب دلنواز

زیرِ نظر تحریر حضرت غزالیٔ زماں ؒ کی ان تحریروں میں سے انتخاب ہے جو حکمت کے تحت حضرت کی زندگی میں کسی دوسرے شخص سے منسوب کرکے شائع کی گئیں، میاں چنوں کے ایک دیوبندی عالم دین مولوی محمد یوسف رحمانی نے اس وقت وہاں پر موجود حضرت قبلہ مولانا منظور احمد شاہ صاحب ؒ سے صلوٰۃ وسلام کے موضوع پر مباحثہ اور قلمی تحریری مناظرہ شروع کردیا اور ساتھ ہی چھیڑ چھاڑ اور لڑائی جھگڑے کی صورت پیدا کرکے ہراساں کرنے کی کوشش کی، حضرت مولانا منظور احمد شاہ صاحب ؒ اس کی ریشہ دوانیوں اور سازشوں کے روکنے کیلئے میاں چنوں میں سرگرم عمل رہے اور علمی تحریری میدان میں اس کو نیچا دکھانے کیلئے حضرت غزالیٔ زماں ؒ سے رابطہ کیا، حضور غزالیٔ زماں ؒ نے اپنی افتادِ طبع کے تحت صرف حوالہ جات کی فراہمی اور زبانی کلامی راہنمائی پر اکتفاء کرنے کی بجائے باقاعدہ رسالہ تحریر فرمادیا، چونکہ اس وقت محاذ پر حضرت مولانا منظور احمد شاہ صاحب ؒ تھے اس لیے یہ رسالہ بھی ان کے نام سے شائع کرایا، اس زمانے میں حضرت غزالیٔ زماں ؒ نے ایک ادارہ تبلیغ دین اور نشر واشاعت کی غرض سے قائم فرمایا تھا، اور حاجی محمد یعقوب مرحوم کو اس کا صدر مقرر فرمایا تھا، اس کا نام "ادارہ تحفظ دین" تجویز فرمایا تھا، مذکورہ رسالہ اسی ادارے کے زیر اہتمام شائع ہوا تھا، اب جبکہ حالات اپنی ڈگر پر آچکے ہیں تو ہم نے ضروری سمجھا کہ حضرت غزالیٔ زماں ؒ کی تحریریں حضرت کے اپنے نام سے منظرِ عام پر آجائیں۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمدلله رب العٰلمين والصلوٰة والسلام علىٰ رسوله خاتم النبين وعلىٰ اٰله وصحبه اجمين، اما بعد

کسی مسلمان سے یہ بات مخفی نہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ مقدسہ پر کثرت سے صلوٰۃ وسلام اللہ تعالیٰ کو بہت پسند ہے، نبی کریم ﷺ پر صلوٰۃ وسلام بھیجنے والا اللہ تعالیٰ کی طرف سے صلوٰۃ وسلام کا مستحق ہے، صلوٰۃ علی النبی ﷺ وہ محبوب اور پسندیدہ کام ہے جو اللہ تعالیٰ بھی کرتا ہے اور اس کے فرشتے بھی حضور نبی کریم ﷺ پر صلوٰۃ و سلام بھیجتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں کو حکم دیا کہ تم بھی میرے پیارے نبی ﷺ پر صلوٰۃ وسلام بھیجو! اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں ارشاد فرمایا" **ان الله وملكته يصلون على النبى يا ايها الذين آمنوا صلوا عليه وسلموا تسليماً"**

آیتِ قرآنیہ کے بعد مندرجہ ذیل احادیثِ نبویہ ﷺ سے بھی نبی کریم ﷺ پر صلوٰۃ وسلام کی عظمت وفضیلت واضح ہوتی ہے۔

1) **الترغيب والترهيب" عن ابن مسعود ؓ قال قال رسول الله ﷺ ان اولى الناس بى يوم القيامة اكثرهم علىٰ صلوٰة"**

(رواہ الترمذی وابن حبان فی صحیحہ)

"عبداللہ بن مسعود ؓ سے مروی ہے، فرمایا رسول اللہ ﷺ نے" بیشک قیامت کے دن میرا سب سے زیادہ مقرب اور سب سے زیادہ محبوب وہی شخص ہوگا جو سب سے زیادہ مجھ پر درود بھیجتا ہے۔"

2) **" عن انس انه سمع من صلى علىٰ مرة" واحدة ﷺ عشر صلوٰة وحط عنه بها عشر سيئات ورفع بها عشر**

درجات''

(رواہ النسائی) ''حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، انھوں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا کہ حضور ﷺ نے فرمایا'' جس نے مجھ پر ایک دفعہ درود بھیجا اللہ تعالیٰ اس پر دس مرتبہ رحمت بھیجتا ہے، اور اسکی وجہ سے اس کی دس خطائیں معاف کر دیتا ہے اور اس کے دس درجے بلند کرتا ہے اس حدیث کو نسائی نے روایت کیا ہے۔''

3) **''عن عمر رضی اللہ عنہ قال ان الدعاء موقوف بین السماء والارض لا یصعد منه شی حتیٰ تصلی علی نبیك ﷺ''**

(رواہ الترمذی)

''حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں'' بیشک دعا آسمان وزمین کے درمیان ٹھہری رہتی ہے، یہاں تک کہ تو اپنے نبی ﷺ پر درود پڑھے۔''

4) **'' عن عبدالرحمن بن عوف قال فقال (ﷺ) ان جبریل قال لی الا بشرك ان الله عزوجل یقول من صلی علیك صلیت علیه ومن سلم علیك سلمت علیه''**

''حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا'' کہ جبریل علیہ السلام نے مجھ سے کہا: کیا آپ کو اس بات کی خوشخبری نہ سناؤں کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ہے جس نے آپ پر درود بھیجا میں اس پر رحمت بھیجتا ہوں!'' (الترغیب والترہیب)

5) ''مشکوٰۃ شریف باب الصلوٰۃ علی النبی ﷺ میں حضرت ابی ابن کعب رضی اللہ عنہ کی ایک حدیث نقل فرمائی'' اُنھوں نے عرض کیا، یارسول اللہ ﷺ! میں کس قدر درود شریف آپ پر پڑھا کروں؟ فرمایا جس قدر چاہو! عرض کیا چوتھائی پڑھوں، یعنی تین حصے دیگر وظائف اور دعائیں چوتھائی حصہ درود شریف، فرمایا جتنا چاہو، دعائیں اور چوتھائی حصہ درود شریف، فرمایا جتنا چاہو، اگر اور زیادہ کرو تو بہتر ہے، عرض کیا کہ

آدھا؟ فرمایا جتنا چاہو، مگر درود شریف اگر اور زیادہ کرلو بہتر ہے، عرض کیا کہ کل درود شریف ہی پڑھا کروں گا یعنی بجائے دیگر دعاؤں اور وظیفوں کے صرف درود پڑھا کروں گا، فرمایا کہ'' **اذا یکفی همك ویکفر لك ذنبك**'' تو یہ درود تمہارے سارے رنج وغم کو کافی ہوگا، اور تمہارے گناہوں کو مٹادے گا، واللہ الحمد۔''

آیتِ قرآنی اور پانچ احادیثِ نبویہ ﷺ پر اکتفا کیا گیا ہے، جو صاحب قلبِ سلیم اور دماغِ فہیم کیلئے کافی ووافی ہے، ورنہ فضائل درود شریف کا احصاء ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے، محدثین وعلماء کاملین نے اس مقدس موضوع پر مستقل ضخیم کتابیں تحریر فرمائی ہیں۔

امتِ مسلم میں آج تک کسی نے اس بات کا انکار نہیں کیا کہ نبی کریم ﷺ پر صلوٰۃ وسلام بھیجنا حضور ﷺ کی تعظیم اور حضور کا اکرام ہے۔ اس اکرام وتعظیم کو ملحوظ رکھتے ہوئے بلاتخصیص صلوٰۃ وسلام نبی کریم ﷺ پر بھیجنا اللہ تعالیٰ کے نزدیک نہایت محبوب اور پسندیدہ ہے، اذان سے قبل ہو یا اذان کے بعد، یا اس کے علاوہ کسی دوسرے وقت میں، جبکہ حضور ﷺ کی تعظیم وتکریم کے منافی اس میں کوئی پہلو نہ پایا جاتا ہو۔

بعض لوگ صلوٰۃ وسلام قبل الاذان یا بعد الاذان کو ناجائز، حرام اور بدعت قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں جو کام کتاب وسنت سے ثابت نہیں، یا صحابہ کرام نے اس کام کو نہ کیا ہو وہ بدعت اور حرام ہے بعض لوگ کہتے ہیں کہ اذان سے پہلے یا اذان کے بعد صلوٰۃ وسلام پڑھنا دین کی تحریف ہے، اور یہ عمل آیہ مبارکہ ''صلوا علیه وسلمو تسلیما'' کے عموم واطلاق کے منافی ہے، لہٰذا جائز نہیں۔

ان لوگوں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ عموم واطلاق کا مفہوم یہی ہے کہ نبی کریم ﷺ کی تعظیم وتکریم کو ملحوظ رکھتے ہوئے جب بھی صلوٰۃ وسلام پڑھا جائے گا وہ صلوا، اور سلموا، کے تحت امرِ خداوندی کی تعمیل میں شامل ہوگا، ایسی صورت میں اسے ناجائز اور بدعت کہنا ظلم نہیں تو کیا ہے؟ حق یہ ہے کہ اذان سے پہلے ہو یا اذان کے

بعد، ہر صورت میں جائز بلکہ مستحسن اور باعثِ ثواب ہوگا، جولوگ اسے بدعت اور حرام کہتے ہیں ان کو چاہیے کہ وہ اس حقیقت کو سمجھیں کہ عام کا وجود خاص ہی کے ضمن میں پایا جاتا ہے، اور مطلق کا تحقق ہمیشہ مقید ہی کے ضمن میں ہوتا ہے، ایسی صورت میں اذان سے پہلے ہو یا بعد، بہر صورت جائز اور مستحسن ہوگا، البتہ اگر کوئی شخص اذان سے قبل صلوٰۃ وسلام پڑھنے کو سنت اعتقاد کرتا ہے تو یقیناً اس کا یہ اعتقادِ خصوصیت، بدعت قرار پائے گا، کیونکہ اس خصوصیت کے ساتھ اس کے سنت ہونے پر کوئی دلیلِ شرعی قائم نہیں، جائز و مستحسن ہونا سنت کو مستلزم نہیں۔

یہاں یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ بدعت کی یہ تعریف نہیں کیا وہ مطلقاً بدعت ضلالت ہے، بے شمار کام جائز و مستحسن ہیں جو رسول اللہ ﷺ نے نہیں کیے بلکہ ایسے کام بھی مستحسن ہیں۔

جو عہدِ صحابہ اور عہدِ تابعین تک نہیں ہوئے، مگر اس کے باوجود بھی وہ جائز بلکہ موجبِ ثواب ہیں، اسی لیے علمائے امت نے احداث اور بدعت کو اقسامِ خمسہ کی طرف منقسم کیا ہے۔

دیکھئے! علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں " **البدعة بکسر الباء فی الشرع ھی احداث مالم یکن فی عھد رسول اللہ** ﷺ۔ **وھی منقسمة الی حسنة وقبیحة قال الشیخ الامام المجمع علیٰ امامته وجلالته وتمکنه فی انواع العصر وبراعته ابو محمد بن عبدالعزیز بن عبدالاسلام رحمه اللہ ورضی عنه فی آخر کتاب القواعد البدعة منقسمة الی واجبة ومحرمة ومندوبة ومکروھة ومباحه۔ قال والطریق فی ذلك ان تعرض البدعة علی قواعد الشریعة فان دخلت فی قواعد الایجاب فھی واجبة او فی**

قواعد التحریم فمحرمة او الندب فمندوبة اوا المکروہ فمکروھة او المباح فمباحة"

"یعنی لفظ "بدعت" بکسر الباء شریعت میں اس کے معنیٰ ہیں پیدا کرنا اس چیز کا جو رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں نہ تھی اور وہ حسنہ اور قبیحہ کی طرف منقسم ہے، الشیخ الامام ابو محمد ابو العزیز بن عبد السلام رحمۃ اللہ علیہ نے آخر کتاب القواعد میں فرمایا کہ بدعت کی پانچ قسمیں ہیں "واجبہ، محرمہ، مندوبہ، مکروہہ اور مباحہ۔ انھوں نے فرمایا اس میں طریقہ یہ ہے کہ بدعت کو قواعدِ شرعیہ پر پیش کیا جائے گا، اگر قواعدِ ایجاب میں داخل ہو تو واجبہ ہے، یا قواعدِ تحریم میں داخل ہو تو محرمہ ہے، یا قواعدِ ندب میں داخل ہو تو مندوبہ ہے، مکروہہ میں داخل ہو تو مکروہہ ہے، یا مباح میں داخل ہو تو مباحہ ہے۔

اس کے بعد امام موصوف نے ہر قسم کی متعدد مثالیں بیان کی ہیں، مثلاً بدعتِ واجبہ کی مثالوں میں انھوں نے علمِ نحو اور حفظ غریب الکتاب والسنۃ من اللغۃ، اور اصول فقہ اور کلام فی الجرح والتعدیل کو پیش کیا ہے اور بدعتِ محرمہ کی مثالوں میں مذاہب قدریہ، جبریہ، مرجبہ، اور مجسمہ کو بیان کیا اور یہ بھی کہا کہ ان اہلِ بدعت میں انھوں نے بدعتِ واجبہ سے ہے، اور مندوبہ کی مثالوں میں انھوں نے سراؤں اور مدرسوں کے بنانے کو بیان فرمایا، اس کے ساتھ امام موصوف نے فرمایا" **وکل احسان لم یکن فی العصر الاول ومنھا التراویح**" یعنی ہر وہ نیک کام جو عصرِ اول میں نہ تھا جن میں تراویح بھی شامل ہے، بدعتِ مندوبہ ہے۔

اس کے بعد انھوں نے بدعتِ مکروہہ کی مثالوں میں مساجد کے مزخرف کرنے اور مصاحف کی تزویق (منقش کرنا) بیان کیا، اور بدعتِ مباحہ کی مثالوں میں امام موصوف نے فرمایا کہ " **وللبدع المباحة امثلة منھا المصافحة عقب الصبح والعصر**" یعنی بدعتِ مباحہ کی مثالوں میں سے صبح اور عصر کی نماز کے بعد مصافحہ کرنا ہے۔

ماحدث من الخیر میں ہر طریقہ حسنہ شامل ہے۔ نمازِ صبح اور عصر کے بعد مصافحہ بھی مباح ہے اور ازدیادِ محبت بین المسلمین کی نیتِ خیر سے ہو تو اس کے مستحسن ہونے میں کلام نہیں۔

"وروی البیھقی باسنادہ فی مناقب الشافعی عن الشافعی رضی اللہ عنہ، قال المحدثات من الامور ضربان احدھا ماحدث مما یخالف کتابا اوسنۃ او اثر او اجما عافھذہ البدعۃ الضلالۃ والثانیۃ ما احدث من الخیر لا خلاف فیہ لواحد من العلماء وھذہ مجدثۃ غیر مذمومۃ وقد قال عمر رضی اللہ عنہ فی قیام شھر رمضان نعمت البدعۃ ھذہ یعنی انھا محدثۃ لم تکن واذا کانت لیس فیھا رد لما مضی ھذا آخر کلام الشافعی رضی اللہ عنہ"

(التھذیب الاسماء واللغات للامام العلامۃ النووی جلد ۲، صفحہ ۲۲، ۲۳) امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے اس کلام میں حسبِ ذیل امور صراحتاً مذکور ہیں۔

۱) ہر وہ کام جو رسول اللہ ﷺ کے زمانۂ اقدس میں نہ ہو، بدعتِ ضلالت نہیں۔

۲) بدعت کی دو قسمیں ہیں: ایک وہ جو کسی دلیلِ شرعی کے خلاف ہو، بدعتِ ضلالت ہے، دوسری وہ بدعت جو عہدِ اول سے کسی امرِ خیر اور دلیلِ شرعی کے منافی نہ ہو، وہ بدعتِ حسنہ ہے۔

۳) مطلقاً احداث مذموم نہیں جو احداثِ دین کے منافی یعنی دلیلِ شرعی کے خلاف ہو وہی احداث فی الدین ہے اور اسی کو احداث مذموم کہا جائے گا، بدعتِ شرعیہ اور بدعتِ ضلالت بھی اسی احداثِ مذموم کو کہتے ہیں، قبل الاذان یا بعد الاذان صلوٰۃ و سلام ہرگز مذموم نہیں نہ یہ بدعتِ شرعیہ ہے جسے بدعتِ ضلالت کہا جائے بلکہ یہ بدعتِ حسنہ ہے جس کی اصل کتاب وسنت میں موجود ہے، کتاب اللہ میں صلو، وسلموا

کا ارشاد ہے جس میں کوئی تخصیص اور تقیید نہیں، اس کیلئے اصل ہے، بلکہ بعض احادیث میں اذان کے بعد صلوٰۃ وسلام کا حکم صراحتاً وارد ہے چنانچہ علامہ ابن حجر مکی رحمۃ اللہ علیہ نے جو ملا علی قاری حنفی رحمۃ اللہ علیہ کے استاذ ہیں، اپنے فتاویٰ کبریٰ شریف میں صحیح مسلم شریف کی اور ابن ماجہ کے علاوہ سنن اربعہ کی وہ احادیث نقل فرمائی ہیں، جن میں اذان کے بعد اور دعائے وسیلہ سے پہلے نبی کریم ﷺ پر صلوٰۃ بھیجنے کا حکم وارد ہے، مثلاً یہ حدیث نقل فرمائی "انہ ﷺ قال اذا سمعتم الموذن فقولو امثل مایقول ثم صلوا علی فانہ من صلی علی صلوٰۃ ﷺ بھا عشراً ثم سلو اللہ تعالیٰ لی الوسیلہ" یعنی حضور ﷺ نے فرمایا "جب تم موذن سے سنو تو اسی طرح کہو جیسے وہ کہتا ہے پھر مجھ پر درود پڑھو، جس نے مجھ پر ایک مرتبہ درود پڑھا اور اللہ تعالیٰ اس پر دس مرتبہ رحمت بھیجتا ہے، پھر میرے لیے اللہ سے وسیلہ طلب کرو۔"

(الحدیث فتاویٰ کبریٰ جلد اول، صفحہ ۱۳۰ طبع مصر)

علامہ ابن حجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کے علاوہ علامہ ابن قیم جوزی "جلاء الافہام فی الصلوٰۃ والسلام علیٰ خیر الانام" کے صفحہ ۷۱ پر سنن ابی داؤد سے یہ حدیث نقل کرتے ہیں" **عن عبداللہ بن عمرو بن العاص سمع النبی ﷺ یقول اذا سمعتم الموذن فقولو امثل مایقول ثم لو علیٰ فانہ من صلی علیہ صلوٰۃ ﷺ عشرم سلوا للہ لی الوسیلہ فانبہ منزلہ فی الجنۃ لاتنبغیٰ الا لعبد من عباد اللہ واد جو ان کون ان ھو فمن سائل لی الوسیلہ حلت علیہ الشفاعۃ"**

یعنی حضرت عبداللہ بن عمر بن العاص سے مروی ہے، انھوں نے نبی کریم ﷺ سے سنا، آپ نے فرمایا "جب تم موذن سے سنو تو اسی طرح کہو ع جیسے وہ کہتا ہے پھر مجھ پر درود پڑھو تو جس نے مجھ پر ایک مرتبہ درود پڑھا، اللہ تعالیٰ اس پر دس مرتبہ رحمت

بھیجتا ہے، پھر اللہ سے میرے لیے وسیلہ کی دعا مانگو جو ایک مقام ہے جنت میں اللہ تعالیٰ کے بندوں میں سے ایک ہی بندہ کو دیا جائے گا امید رکھتا ہوں وہ میں ہوں گا تو جس نے میرے لیے وسیلہ طلب کیا اس کیلئے شفاعت واجب ہوگئی۔''

(رواہ مسلم عن محمد بن سلمہ جلاء الافہام ص ۷۱)

ان مذکورہ احادیث سے یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح ہوگئی کہ اذان کے بعد اور دعائے وسیلہ سے پہلے درود شریف پڑھنے کا حکم خود حضور تاجدار مدینہ ﷺ نے فرما دیا ہے۔ اس کے باوجود صلوٰۃ قبل الاذان کے بارے میں اگرچہ احادیث میں کوئی واضح ذکر موجود نہیں، لیکن آیتِ قرآنی اور احادیثِ نبویہ کے عموم واطلاق سے یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ صلوٰۃ وسلام قبل الاذان جائز ہے، اور اس کی اصل کتاب وسنت میں موجود ہے اور پر کوئی منع شرعی وارد نہیں۔

دیکھئے علامہ ابن حجر موصوف سے اذان کے متعلق چند سوالات کیے گئے جن میں یہ تین سوال بھی شامل تھے۔

1) یہ کہ صلوٰۃ النبی ﷺ قبل الاذان مسنون ہے یا نہیں؟ جیسا کہ بعد الاذان مسنون ہے۔

2) یہ کہ اذان ختم ہونے کے بعد صلوٰۃ علی النبی ﷺ سے پہلے محمد رسول اللہ (ﷺ) کہنا مسنون ہے یا نہیں؟

3) یہ کہ اذان کے فوراً بعد محمد رسول اللہ (ﷺ) کہنے اور قبل الاذان صلوٰۃ علی النبی ﷺ سے روکا جائے گا یا نہیں؟

" اما الصلوٰۃ و السلام علی النبی ﷺ بعد الذان والاقامه فانها مندوبان!''

یعنی اذان اور اقامت کے بعد نبی کریم ﷺ پر صلوٰۃ وسلام پڑھنا مستحب ہے، یہاں یہ امر ملحوظ رہے کہ امام موصوف نے مسئلہ تو یہ بیان کیا کہ اذان اور اقامت

دونوں کے بعد نبی کریم ﷺ پر صلوٰۃ وسلام مندوب ہے، لیکن کوئی حدیث ایسی وارد نہیں کی جس میں اقامت کے بعد صلوٰۃ علی النبی ﷺ کا ذکر ہو۔

اس کے بعد فرمایا'' **ولم ترٰی فی شی منها التعرض للصلوٰۃ علیه ﷺ قبل الاذان ولا الیٰ محمد رسول الله بعده ولم ترٰی ایضاً فی الکلام ائمتانا تعرضا لذالك ایضا فیحنذ کل واحد من هذین لیس بسنة فی محله المذکور فیه فمن اتی بواحد منها فی ذلك معتقد اسنیته فی ذالك المحل المخصوص نهی عنه ومنع عنه لا نه تشریع بغیر دلیل ومن شرع بلا دلیل یزدجر عن ذالك وینهی عنه''**

جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اذان کے بعد حضور ﷺ پر درود، صلوٰۃ وسلام کا امر حدیث میں صراحتاً وارد ہے، اور قبل الاذان ہم نے یہ حکم کسی حدیث میں نہیں دیکھا اور اذان کے بعد محمد رسول اللہ کہنے کا حکم بھی ہم نے کسی حدیث میں نہیں پایا لہٰذا ان میں سے کوئی بھی اپنے محل مذکور میں سنت نہیں جو شخص ان دونوں میں سے کسی ایک کام کو بھی اس کے محلِ مخصوص میں اس کے سنت ہونے کا معتقد ہو کر کرے گا اسے روکا جائے گا۔

اس عبارت سے صاف ظاہر ہے کہ صلوٰۃ وسلام قبل الاذان اور لفظِ محمد رسول اللہ ﷺ بعد الاذان مطلقاً منہی عنہ نہیں، نہی اس وقت کی جائے گی جب ان کے محلِ مخصوص میں ان کی سنیت کا اعتقاد کر کے یہ کام کرے یعنی اس کا یہ اعتقاد ہو کہ صلوٰۃ و سلام قبل الاذان سنت ہے اور اگر اس محل کی خصوصیت کے ساتھ اس کی سنیت کا معتقد نہ ہو بلکہ آیت کریمہ ''**صلوا علیه وسلمو تسلیما**'' کے مطابق وہ مطلقاً صلوٰۃ و سلام علی النبی ﷺ کو مطلوب عندالشرع اعتقاد کر کے اذان سے پہلے صلوٰۃ وسلام پڑھتا ہے تو وہ یقیناً صلوٰۃ وسلام کے اجر وثواب کا مستحق ہوگا، اور اس کا یہ صلوٰۃ وسلام

ممنوع نہ ہوگا اور اسے اس صلوٰۃ وسلام سے ہرگز روکا نہ جائے گا، کیونکہ نہی اور زجر کی علت تشریع بلا دلیل ہے اور یہ تشریع بلا دلیل اسی وقت پائی جائے گی، جب کہ وہ اس کے محلِ مذکور کی خصوصیت کے ساتھ مقید کر کے اس کے سنت ہونے کا اعتقاد کرے، یعنی اس کا اعتقاد یہ ہو کہ اذان سے پہلے صلوٰۃ وسلام سنت ہے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ اذان سے پہلے صلوٰۃ وسلام پڑھنے والے ہرگز اس اعتقاد سے نہیں پڑھتے کہ قبل الاذان کی خصوصیت سنت ہے، بلکہ وہ قرآن وسنت کی روشنی میں مطلقاً صلوٰۃ وسلام کو موجب اجر وثواب جان کر پڑھتے ہیں، لہٰذا انہیں زجر کرنا اور روکنا اور ان کے اس صلوٰۃ وسلام کو بدعت سیئہ اور ناجائز قرار دینا سراسری تعدی اور ظلم وستم ہے......اس عبارت کے بعد متصلاً امام ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے (فائدہ) کا عنوان قائم کر کے ارقام فرمایا" **قد احدث الموذنون الصلوٰة و السلام على رسول الله ﷺ عقب الاذان للنرائض الخمس الاالصبح والجمعة فانهم لايقلمون ذلك فيهما علىٰ الاذان والاالمغرب فانهم يفعلونه غالباً ليق وتتها وكان ابتداء حدوث ذلك فى ايام السلطان الناصر صلاح الدين بن ايوب وبامره فى مصر و اعمالها وسبب ذلك ان الحاكم المخذول لماقتل امرت اخته الموذنين ان يقولوا فى حق ولده السلام على الامام الطاهر ثم استمر السلا م على الخلفاء بعده الى ان ابطله صلاح لادين المذكور و جعل بذله الصلوٰة و السلام على النبى ﷺ ونعم مافعل فجزاه الله خيراً ولقد استغنىٰ مشائخنا وغيرهم فى الصلوٰة و السلام عليه ﷺ بعد الا ذان على االكيفية التى يفلها الموذنون فافتو بان الاصل سنة**

والكيفية بدعة وهو ظاهر كما علم مما قررته من الاحاديث" (فتاویٰ کبریٰ جلد اول۔ صفحہ ۱۳۱)

خلاصہ" جاری کیا مؤذنوں نے صلوٰۃ وسلام رسول اللہ ﷺ پر پانچوں فرض نمازوں کی اذان کے بعد سوائے صبح اور جمعہ کے کیونکہ ان دونوں میں وہ صلوٰۃ وسلام کو اذان پر مقدم کرتے تھے اور سوائے مغرب کے کیونکہ مغرب میں وقت کی تنگی کی وجہ سے وہ اکثر صلوٰۃ وسلام نہ پڑھتے تھے، اس کے جاری ہونے کی ابتداء سلطان ناصر صلاح الدین بن ایوب کے زمانہ میں اس کے حکم سے مصر اور اس کے علاقوں میں ہوئی، اس کا سبب یہ ہوا کہ حاکم مخذول جب قتل کر دیا گیا تو اس کی بہن نے موذنوں کو حکم دیا کہ وہ اس مقتول حاکم کے بیٹے کے حق میں کہیں" **السلام على الامام الطاهر**" پھر اس کے بعد یہ سلام خلفاء پر استمرار کے ساتھ جاری رہا، یہاں تک کہ اسے صلاح الدین مذکور نے روکا اور اس کی بجائے اس نے نبی کریم ﷺ پر صلوٰۃ وسلام شروع کرادیا" **فنعم مافعل فجزاه الله خيرا**" یعنی اس نے بہت اچھا کیا پس اللہ تعالیٰ اس کو بہترین جزا عطا فرمائے اور ہمارے مشائخ شافعیہ اور اس کے علاوہ دیگر مشائخ سے فتویٰ طلب کیا گیا کہ نبی کریم ﷺ پر صلوٰۃ وسلام کے بارے میں اذان کے بعد اسی کیفیت پر جس کے مطابق موذنین کرتے ہیں تو انھوں نے فتویٰ دیا کہ اصل سنت ہے اور کیفیت بدعت ہے اور وہ ظاہر ہے جیسا کہ احادیث کی روشنی میں میں نے اسے ثابت کیا۔

اُس عبارت سے یہ امر واضح ہے کہ موذنین نے جو صلوٰۃ وسلام علی النبی ﷺ کا طریقہ جاری کیا وہ یہ تھا کہ صبح اور جمعہ میں صلوٰۃ وسلام علی النبی ﷺ قبل الاذان تھا، اور مغرب کے سوا باقی نمازوں میں بعد الاذان اور صلوٰۃ وسلام کا یہ طریقہ جس میں صلوٰۃ وسلام قبل الاذان اور بعد الاذان دونوں شامل ہیں، سلطان ناصر صلاح الدین ایوبی کے حکم سے جاری ہوا اور اجراء کا سبب تفصیلاً مذکور ہو چکا جس کی بناء پر علامہ ابن

حجر رحمۃ اللہ علیہ نے سلطان ناصر صلاح الدین کے حق میں فرمایا "فنعم مافعل" یعنی اسنے اچھا کیا "فجزاه الله خيراً" اللہ اسے جزائے خیر دے۔ جس کام پر امام موصوف نے سلطان موصوف کی تعریف کی، اور اسے جزائے خیر کی دعا دی وہ کام یہی تھا کہ صبح اور جمعہ میں صلوٰۃ وسلام علی النبی ﷺ قبل الاذان تھا اور مغرب کے سوا باقی نمازوں میں بعدالاذان اگر صلوٰۃ قبل الاذان یا بعدالاذان علامہ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک معاذ اللہ فعل قبیح یا بدعت سیہ تھا تو بدعت سیہ اور فعلِ قبیح کی وہ ہرگز تعریف نہ کرتے، نہ وہ ایسے ناجائز فعل پر اس کے حق میں دعائے خیر کے الفاظ بولتے۔ علامہ موصوف کی عبارت "فنعم مافعل فجزاه الله خيراً" سے یہ حقیقت آفتاب سے زیادہ روشن ہوگئی کہ وہ صلوٰۃ و سلام قبل الاذان اور بعدالاذان دونوں فعلِ مستحسن قرار دیتے ہیں۔

رہا یہ امر کہ مشائخ نے صلوٰۃ وسلام بعدالاذان کی اصل کو سنت اور اس کی کیفیت کو بدعت قرار دیا تو اسے بدعت سیہ پر محمول کرنا باطل محض ہے۔ کیونکہ علامہ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے اسی کیفیت محدثہ کے باوجود "فنعم مافعل فجزاه الله خيراً" فرمایا معلوم ہوا کہ یہ حدیثِ حسنہ نعمت البدعۃ ہذہ کے قبیل سے ہے، جیسا کہ ہم تفصیلاً بیان کر چکے ہیں، البتہ اگر نفس کیفیت مخصوصہ ہی کو کوئی شخص سنت اعتقاد کرے تو یقیناً یہ بدعت سیہ ہوگی، کیونکہ یہ تشریع بلا دلیل ہے، لیکن کوئی مسلمان یہ اعتقاد نہیں رکھتا بلکہ مطلق صلوٰۃ وسلام ہی کو باعثِ برکت اور موجب اجر وثواب سمجھتا ہے، کسی خاص محل کا حدیث بدعتِ سیہ ہونے کی دلیل نہیں۔

دیکھئے! صلوٰۃ بعدالاقامۃ کو علامہ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے مندوب کہا، ایسی صورت میں صلوٰۃ قبل الاذان کو معاذ اللہ قبیح کہنا کس قدر قولِ قبیح ہے، صلوٰۃ وسلام قبل الاذان و بعد الاذان نے تحریر فرمایا ہے بالکل وہی مضمون علامہ سخاوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب "القول البدیع فی الصلوٰۃ علی الحبیب الشفیع" میں "ما احدثه الموذنون عقب الاذان" کا عنوان قائم کر کے ارقام فرمایا ہے، ملاحظہ فرمائیے۔

(القول البديع في الصلوٰة على الحبيب الشفيع للامام العلامه الحافظ شمس الدين بن محمد بن عبدالرحمن بن محمد ابن ابی بكر السخاوی الشافعی المولود ۷۳۱ھ المتوفى بالمدينه المنوره ۹۰۲ھ، وجزاه عناو عن السلمين جزاء حناً، مطبعة الانصاف بيروت، ص ۱۹۲، ۱۹۳)۔

یہاں یہ شبہ وارد کرنا کہ صلوٰۃ وسلام قبل الاذان ہو یا بعدالاذان، اذان کے حدود وقیود کے خلاف ہے اور زیادہ فی الاذان ہے زیادہ فی الاذان چونکہ منع ہے لہٰذا صلوٰۃ و سلام قبل الاذان ہو یا بعدالاذان، جائز نہیں۔

اس کا ازالہ یہ ہے کہ صلوٰۃ وسلام قبل الاذان ہو یا بعدالاذان نہ تو اذان کے حدود وقیود کے خلاف ہے اور نہ ہی زیادہ فی الاذان ہے۔ گذشتہ اوراق میں صحیح مسلم شریف اور سنن ابی داؤد شریف کے حوالے سے یہ ثابت کر چکے ہیں کہ اذان کے بعد اور دعائے وسیلہ سے پہلے درود شریف پڑھنے کا حکم خود نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے جب اذان کے بعد درود شریف پڑھنا اذان کے حدود وقیود کے خلاف نہیں تو قبل الاذان کیونکر خلاف ہوگا! نیز فی الاذان کا اعتراض بھی لغو ہے۔ اس لیے کہ کسی شے پر زیادہ اس کے جنس سے متحقق ہوتی ہے، مثلاً پانچ نمازوں پر چھٹی نماز کا زیادہ کرنا اور اس کو مباح قرار دینا ہرگز جائز نہیں، لیکن صلوٰۃ وسلام قبل الاذان کو اس قبیل سے قرار دینا صریح جہالت۔ چھٹی نماز، نماز کی جنس سے قرار پائے گی اور صلوٰۃ وسلام قبل الاذان ہو یا بعدالاذان، جنسِ اذان سے ہرگز نہیں لہٰذا اس کو زیادہ علی الاذان کہنا باطل محض ہے اس کی واضح دلیل یہ ہے کہ فقہاء نے نماز کے درود میں لفظِ "سیدنا" کی زیادہ کو مستحب اور افضل قرار دیا ہے، صاحب درمختار نے فرمایا "وندب السيادة لان زيادة الاخبار الواقع عين السلوك الادب فهو افضل من تركه" یعنی نماز میں

درودشریف میں (سیدنا) کا لفظ مستحب ہے، کیونکہ اخبار واقعی کا زیادہ کرنا عین ادب کی راہ پر چلنا ہے، لہٰذا اس کا پڑھنا اس کے چھوڑنے سے افضل ہے...... اور شامی میں ہے" **والا فضل الا یتان بلفظ السیادة کما قاله ابن ظهیر وصرح به جمع وبه افتی الشارع لان فیه الایتان بما امر نا به وزیادة الاخبار بالواقع الذی هوا ادب فهو افضل من ترکه"**

(شامی جلد اول، صفحه ۴۷۹)

یعنی لفظِ "سیدنا" لانا افضل ہے، یعنی نماز کے درودشریف میں "اللهم صلی علیٰ سیدنا محمد" کہنا افضل ہے جیسا کہ ابن ظہیرہ نے کہا اور فقہاء کی ایک جماعت نے اس کی تصریح کی، اور اسی کے مطابق شارح (صاحبِ درمختار) نے بھی فتویٰ دیا، کیونکہ اس میں اس چیز کا لانا ہے جس کا ہمیں حکم دیا گیا ہے (یعنی حضور ﷺ کی تعظیم وتوقیر) اور زیادہ اخبار ہے اس واقع کی جو عین ادب ہے، لہٰذا اس کا کہنا افضل ہے اس کے ترک سے!"

دیکھئے! نماز بالاتفاق عبادت ہے اور عبادت میں لفظ سیدنا کی زیادہ فقہاء کے نزدیک افضل ہے فقہاء کرام کی اس تصریح سے دو باتیں واضح ہوئیں۔

1) یہ کہ زیادہ فی العبادۃ مطلقاً جائز نہیں۔

2) یہ کہ ہر وہ چیز جو عہدِ اول میں نہ ہو اسے حرام و ناجائز اور بدعتِ ضلالات کہنا باطل محض ہے۔

الحمدللہ! قرآن وحدیث اور فقہاء کرام کے ارشادات کی روشنی میں اذان سے پہلے اور اس کے بعد صلوٰۃ وسلام کے پڑھنے کا جواز واضح ہوکر سامنے آگیا، تعصب سے بالاتر ہوکر بنظرِ تحقیق اگر عدل وانصاف سے کام لیا جائے تو انشاء اللہ اس مسئلہ میں کوئی تردد باقی نہ رہے گا اور ہر منصف مزاج کو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اذان سے پہلے

اور اس کے بعد صلوٰۃ وسلام جائز، مستحسن اور اللہ تعالیٰ کی رحمتوں کے نزول کا باعث ہے اور اسے بدعتِ سیہ ناجائز وحرام کہنا قرآن وحدیث کی رو سے گناہِ عظیم ہے!!!

(صلی الله تعالیٰ علیٰ حبیب الکریم واله وصحبه اجمعین)



بسم اللہ الرحمن الرحیم

باب نمبر 24

فقہی تدبُّر

بیع خنزیر کے متعلق ایک استفسار کا جواب

تحریر حضرت امام اہلسنت غزالی زماں

علامہ سید احمد سعید کاظمی رحمۃ اللہ علیہ

ماہنامہ السعید امام اہل سنت نمبر ۱۹۹۸ صفحہ ۸۹ تا ۹۴

سوال: ایک تجارتی ادارے نے جو "انٹرفانا" کے نام سے موسوم ہے، اس بات کی حکومت سے اجازت چاہی ہے کہ انہیں زندہ جنگلی خنزیر برآمد کرنے کیلئے اختیار دیا جائے۔

ہمارے ملک میں جنگلی خنزیر کی تعداد بڑھتی جارہی ہے اور روز بروز ان میں اضافہ ہوتا جارہا ہے، ان کی تعداد میں اضافہ کی وجہ زراعت بری طرح متاثر ہوتی ہے کیونکہ یہ جنگلی جانور فصلوں کو شدید نقصان پہنچاتے ہیں، ہماری حکومت وقتاً فوقتاً مختلف تدابیر اختیار کرتی رہی ہے تاکہ کسی طرح اسی موذی جانور پر قابو پالیا جائے اور زرعی فصولوں کو نقصان سے بچایا جائے، فوج کے جوانوں کو خنزیر مارنے پر تعینات کیا گیا، عوام کو انعامات دے کر خنزیر مارنے پر آمادہ کیا گیا مختلف انواع کے زہر استمال کیے گئے۔ لیکن ان تمام اقدامات کے باوجود خنزیر پر قابو نہ پایا جاسکا، یہ نئی پیشکش اس تجارتی ادارے نے کی ہے اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جارہا ہے کہ اگر زندہ خنزیر بڑی تعداد میں برآمد کرنے کی اجازت دے دی جائے تو ان سوروں کی تعداد میں نمایاں کمی ہوجائے گی اور وقت گزرنے کے ساتھ ہماری زرعی فصلوں کو نقصانات سے بچایا جاسکے گا۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس تجارتی ادارے کیلئے سوروں کو برآمد کرنا اسلامی نقطۂ نظر سے جائز قرار دیا جاسکتا ہے؟ دوسرے یہ کہ ہماری حکومت کو خنزیر برآمد کرنے کی اجازت دینے کا استحقاق اسلامی نقطۂ نظر سے حاصل ہے یا نہیں؟

قرآن شریف کے احکامات جو سورہ المائدہ، البقرہ اور سورہ انعام میں موجود ہیں وہ خنزیر کے گوشت سے متعلق ہیں۔ بخاری شریف میں قتل الخنزیر کے سلسلہ میں ایک حدیث ہے لیکن اس سے بھی برآمد کرنے کے سلسلہ میں بات واضح نہیں ہوتی، تفسیر الحقانی پارہ دوم آیت "انما حرم علیکم المیتہ" کے تحت اور تفسیر روح المعانی۔، پارہ دوم میں بھی اس کا ذکر موجود ہے، لیکن خنزیر برآمد ہونے کا معاملہ اس

سے بھی واضح نہیں ہوتا۔ تفسیرِ طبری سورہ المائدہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ پوری طرح حرام ہے اور اس میں کسی چیز کی تخصیص نہیں ہے، تفسیر الماجدی میں یہ بھی لکھا ہے کہ حرمت اور نجاست دونوں کا ذکر صراحت کے ساتھ بائبل میں بھی موجود ہے بلکہ خود یہود کے ہاں بھی یہ حرام ہے، تاہم یہ معاملہ کہ پاکستان سے زندہ سور برآمد کیے جائیں اس کا کوئی جواز نہیں ملتا، صحیح بخاری باب قتل الخنزیر میں حضرت جابر ؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے سور کے بیچنے سے منع فرمایا ہے۔ یقیناً پاکستان سے سور کو برآمد کرنا بیچنے کے مترادف ہوگا۔

باب بیع الفاسد ہدایہ آخرین سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاید سور کو برآمد کرنا اسلامی نقطۂ نظر سے غیر مناسب ہوگا، مصنف عبدالرحمٰن الجزیری کی کتاب ''الفقہ علی المذاہب الاربعہ'' کے صفحہ ۱۹۴، جلد دوم سے پتہ چلتا ہے کہ سور کو مال قرار نہیں دیا جاسکتا اور اس لیے اسے بیچنا بھی غلط ہے، حصاص بحوالہ تفسیر ماجدی آیت'' انما حرم علیکم'' سے ظاہر ہوتا ہے کہ خنزیر کے بالوں سے انتفاع کے جواز میں ائمہ میں اختلاف ہے، ابوحنیفہ ؓ، اور امام محمد ؒ اور امام اوزاعی ؒ کہتے ہیں کہ فائدہ حاصل کرنا جائز ہے اور امام شافعی ؒ فرماتے ہیں کہ جائز نہیں ہے۔

میں نے ان حوالہ جات کا اشارہ محض اس لیے کیا ہے کہ آپ کو تحقیق کرنے میں سہولت ہو۔ میرا مقصد یہ معلوم کرنا ہے کہ آپ حکومت کو بذاتِ خود بھی مشورہ دیں اور آپ کے دائرہ اثر میں جو حضرات ہیں ان سے بھی رائے لے کر مجھے یقینی طور پر ہدایت فرمائیں کہ حکومت کا لائحہ عمل کیا ہونا چاہیے، اگر حکومت خنزیر کو برآمد کرنے کی اجازت نہیں دیتی تو کیا موقف اختیار کرنا چاہیے تاکہ بحث ومباحثہ کی کوئی گنجائش باقی نہ رہے اور حکومت کے احکامات مدلل ہوں۔

اس سلسلے میں یہ بھی غور فرمائیں کہ کتا حرام ہے تاہم کتے خرید وفروخت کیے جاتے ہیں اور مسلمان یہ کاروبار اسی ملک میں کرتے ہیں۔

شیر حرام ہے اس کی کھال کی خرید وفروخت ہوتی ہے، مسلمان خریدتے بھی ہیں، بیچتے بھی ہیں، اگرچہ یہ محض زینت وزیبائش کیلئے تجارت ہوتی ہے۔

ہر مردار حرام ہے اگرچہ وہ بصورت زندہ حلال ہے، مثلاً گائے، بھینس جب مر جاتے ہیں، ان کی کھال کو فروخت کر دیا جاتا ہے۔

ایسی صورت میں کہ آپ حضرات کا اجتماعی اور انفرادی فیصلہ یہ ہو کہ خنزیر یا سور کو زندہ حالت میں اس ملک سے باہر کے ممالک کو برآمد کرنا شرعاً اور اسلامی نقطۂ نظر سے بالکل نامناسب اور غلط ہوگا اور حکومت یہ اجازت ہرگز نہ دے تو یہ بھی غور فرمایا جائے کہ دوسرے ممالک کے غیر مسلم باشندوں کے ہمارے ملک سے خنزیر سور برآمد کرنے کی اجازت دی جاسکتی ہے یا نہیں؟ اس میں کیا قباحت ہوگی کہ اگر حکومت غیر ملکی تجارتی اداروں کو جو غیر مسلم ہیں یا غیر مسلم افراد میں سے کسی کو اجازت دے کہ وہ پاکستان میں جنگلی خنزیر، سور ماریں اور جس حالت میں بھی چاہیں یہاں سے لے جائیں اور حکومت کسی قسم کی اجرت نہ لے۔

تاہم جس بات کو مدِنظر رکھنا بہر صورت ضروری ہے وہ یہ کہ جنگلی خنزیر، سور اس وقت ہماری زراعت کو شدید نقصان پہنچا رہے ہیں جس سے ہماری معیشت بری طرح متاثر ہوتی ہے، آزادی سے قبل سور مارنے اور کھانے والے موجود تھے اب بہت کم ہیں، علاوہ ازیں اس کی افزائشِ نسل بے حد تیز رفتاری سے ہوتی ہے، ایک مادہ سال میں تقریباً ۱۲ بچے جنتی ہے، اس ملک میں عیسائیوں میں اکثریت ایسی ہے جو نہ خنزیر مارتے ہیں نہ کھاتے ہیں، بعض خطوں میں قدرتی توازن اس طرح قائم رہتا ہے کہ خنزیر کے کھانے والے درندے بھی ہوتے ہیں مثلاً شیر سور کا شکار کرتا ہے اور کھاتا ہے۔ پاکستان میں کوئی درندہ ایسا نہیں جو سور کو کھاتا ہو۔

سوال نامے کا اصل مقصد یہ ہے کہ اپنے ملک کی زراعت کو خنزیروں کی تباہ کاری سے بچانے کیلئے اور اس لعنت سے نجات حاصل کرنے کیلئے ایسا طریق کار اور

شریعتِ اسلامیہ کی رو سے جائز ہو اور جائز طریقہ سے یہ مقصد حاصل ہو جائے۔

جواب: اس ضمن میں پہلا سوال یہ کیا گیا ہے کہ "انٹر فانا" تجارتی ادارہ کیلئے سوروں کو برآمد کرنا اسلامی نقطۂ نظر سے جائز قرار دیا جاسکتا ہے؟

دوسرا سوال یہ کیا گیا ہے کہ ہماری حکومت کو خنزیر برآمد کرنے کی اجازت دینے کا استحقاق اسلامی نقطۂ نظر سے حاصل ہے یا نہیں؟

اس کے بعد سوال نامے میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ یقیناً پاکستان سے سور برآمد کرنا بیچنے کے مترادف ہوگا۔ سوال نامے کے آخر میں تیسرا سوال کچھ اس طرح کیا گیا ہے کہ اگر پہلی دونوں صورتیں آپ کے اجتماعی یا انفرادی فیصلے کی رو سے شرعاً غلط ہوں اور اسلامی نقطۂ نظر کے مطابق نہ ہوں تو اس بات پر غور کیا جائے کہ دوسرے ممالک کے غیر مسلم باشندوں کو ہمارے ملک سے سور برآمد کرنے کی اجازت دی جاسکتی ہے یا نہیں؟ اس طرح کہ وہ جس طرح چاہیں جس حالت میں جیسے چاہیں خنزیروں کو لے جائیں اور حکومت ان سے کوئی اجرت نہ لے۔

تینوں سوالوں کو غیر ضروری طوالت دی گئی ہے اور بعض بے معنیٰ الفاظ لکھے گئے ہیں، جس سے سوالات کے مفہوم میں الجھن پیدا ہوگئی مثلاً "کسی قسم کی اجرت حکومت نہ لے لفظ "اجرت" سے یہ الجھاؤ پیدا ہوگیا کہ برآمدگی کا یہ کام بلا اجرت ہے بغیر قیمت کے نہیں، کیونکہ لفظِ "اجرت" کے معنیٰ "قیمت" نہیں، بہر حال تینوں سوالوں کے جوابات نمبر وار لکھتا ہوں، ساتھ ہی ان مسائل پر تبصرہ کروں گا جو ان سوالات کے ضمن میں کیے گئے ہیں اور ان کے لکھے جانے سے ایک قسم کا الجھاؤ اور ابہام پیدا ہوسکتا ہے۔

1 سوال) خنزیر کا برآمد کرنا جب یقیناً بیع کے مترادف ہے تو کسی تجارتی یا غیر تجارتی ادارے یا کسی مسلمان کیلئے کتاب وسنت کی روشنی میں خنزیر برآمد کرنے کی اجازت نہیں، از روئے شریعتِ اسلامیہ خنزیر مال نہیں اس لیے اس کی بیع حرام ہے،

اسکے قتل کا حکم شرع میں وارد ہے۔ جس کے منسوخ ہونے کا قول کسی سے مذکور نہیں، جس جانور کے قتل کا حکم محکم شرع میں وارد ہو وہ نہ مال ہے نہ اس کی بیع جائز ہو سکتی ہے، نیز خنزیر حرام لعینہ اور نجسِ لعینہ ہے، رسول اللہ ﷺ نے اس کی تجارت کو حرام قرار دیا ہے۔

2 سوال) ہماری حکومت یا کسی مسلمان کو اسلامی شریعت کی رو سے خنزیر برآمد کرنے یا اس کی اجازت دینے کا کوئی استحقاق نہیں۔

قرآن مجید میں چار جگہ حرمتِ خنزیر کا واضح بیان موجود ہے، اور سورہ انعام میں حکمِ حرمت کے ساتھ اس کیلئے "انہ رجس" بھی وارد ہے، جو اس امر کی واضح دلیل ہے کہ خنزیر حرام لعینہ اور نجسِ لعینہ ہے، وہ شرعاً مال ہی نہیں جس کی بیع ہوسکے۔

بخاری شریف میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فتح مکہ کے سال مکہ مکرمہ میں ارشاد فرمایا کہ "اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے خنزیر کی بیع کو حرام کر دیا" عہدِ رسالت وعہدِ صحابہ وتابعین میں کسی نے خنزیر کی حرمت اور نجاست لعینہ کا انکار نہیں کیا، نہ کسی نے قرآن وحدیث کے خلاف اس کی بیع کو جائز قرار دیا، امتِ مسلمہ میں آج تک کسی نے اللہ اور اس کے رسول کی حرام فرمائی ہوئی اس بیع خنزیر کو جائز نہیں کہا، تفسیرِ مظہری میں ہے "**اجمعوا علیٰ ان الخنزیر نجس عینہ لا یجوز بیع شئی من اجزائہ حتیٰ شعرہ**" (۱) مسلمانوں کا اس بات پر اجماع ہے کہ خنزیر نجس العین ہے، اور اس کے اجزاء میں سے کسی جز کا بیچنا قطعاً جائز نہیں، حتیٰ کہ اس کے بال کا فروخت کرنا بھی حرام ہے۔

تفسیرِ کبیر میں ہے "**اجتمعت الامة علیٰ ان الخنزیر بجمیع اجزائه محرم**" (۲) یعنی امتِ محمد یہ اس بات پر مجتمع ہے کہ خنزیر اپنے، تمام اجزاء کے ساتھ حرام ہے، اور یہی عبارت تفسیر خازن میں بھی ہے۔ (۳) ہدایہ میں صاف موجود ہے "**ولا یجوز بیع شعر الخنزیر لانہ نجس**

العین" (۴) خنزیر (تو در کنار اس) کے بالوں کی بیع بھی جائز نہیں، کیونکہ وہ نجس العین ہے۔

سوال نامے میں لکھا گیا ہے کہ "قرآن مجید کے احکامات جو سورہ مائدہ، سورہ انعام میں موجود ہے وہ خنزیر کے گوشت سے متعلق ہیں" حالانکہ یہ صحیح نہیں، "لحم" کا لفظ تو صرف اس لیے وارد ہوا کہ جانور کھانے والے کیلئے کھانے میں گوشت ہی سل ہے اور کھانیکا فائدہ حاصل کرنے میں سب سے بڑی چیز جانور کا گوشت ہی ہے، باقی اجزاء اس کے تابع ہیں اور جو حکم کسی اصل کیلئے بیان کیا جائے وہ اصل ہی میں منحصر نہیں ہوتا بلکہ اس کے تابع کیلئے بھی وہی حکم ہوتا ہے، اصل کا حکم یقیناً فرع کو شامل ہوگا، لیکن جو حکم محض فرع کیلئے وارد ہو وہ اصل کو شامل نہیں ہوتا جیسے **"حرمنا علیھم شحومھما"** یعنی ہم نے یہودیوں پر گائے، بکری کی چربیاں حرام کیں، چربی چونکہ تابع ہے اس لیے اس کی حرمت کا حکم لحم کو شامل نہیں لیکن حرمت لحم کا حکم یقیناً چربی کو شامل ہے، اس لیے کہ لحم متبوع اور شحم تابع ہے، گوشت اصل اور متبوع ہے اور چربی اس کی فرع اور تابع ہے، فرع اور تابع اپنی اصل اور متبوع کے حکم میں شامل ہوتا ہے، خنزیر کے بقیہ اجزاء بھی اس کے لحم کے تابع ہیں اس لیے حرمت کا حکم لحم خنزیر میں منحصر نہ ہوگا اس کے بقیہ اجزا بھی حرام قرار پائیں گے، لغت اور عرف سے بھی یہی مفہوم ہوتا ہے کہ لفظ "لحم" جمیع اجزا کو عام ہے (۵) تفسیر ابن کثیر میں اسی طرح مرقوم ہے کہ لحم کا ذکر تو صرف چار جگہ وارد ہے ان کے علاوہ سات جگہ لفظ "لحم" اور ایک جگہ لفظ "لحوم" قرآن پاک میں مذکور ہے، ہر جگہ اباحت و رغبت یا کراہیت کا جو حکم لحم کیلئے بیان ہوا، دیگر اجزا جو کھانے میں لحم کے تابع ہیں سب کیلئے وہی حکم ہے، ملاحظہ فرمائیے!

" ایحب احدکم ان یاکل لحم اخیہ فکرھتموہ"(٦)

اس آیہ کریمہ میں لفظ "لحم" مذکور ہونے کے باوجود...... کراہیت، لحم میں منحصر نہیں

دیگر اجزا جائز بھی اسی حکم میں شامل ہیں، یقیناً ہر شخص کے نزدیک اپنے مردہ بھائی کا صرف گوشت کھانا ہی ناپسند نہیں بلکہ گوشت کے علاوہ بقیہ اجزا کا کھانا بھی ناپسند ہے، اسی طرح محض لحم خنزیر ہی حرام نہیں بلکہ اس کے بقیہ اجزا بھی حرام ہیں۔

" وامددناھم بفاکھۃ ولحم مایشتھون" (۷)

یہاں بھی اللہ تعالیٰ کی کثرتِ عطا اور بندوں کی رغبت و اشتہا کا حکم لحم میں منحصر نہیں بلکہ اس کے ماسوا دیگر اجزا بھی اس میں شامل ہیں، لفظِ لحم کا ذکر اس کے اصل ہونے پر مبنی ہے۔

"ولحم طیر مایشتھون"(۸)

اس آیہ کریمہ میں بھی پرندوں کا صرف گوشت ہی مراد نہیں بلکہ وہ سب اجزا بھی اس میں شامل ہیں جو مرغوب و پسندیدہ ہوں۔

"ثم نکسوھا لحما (۹) فکسونا العظام لحما "(۱۰)

ان دو آیتوں میں ہڈیوں پر گوشت جو پہنانا وارد ہے وہ گوشت کے ساتھ خاص نہیں بلکہ دیگر اجزا چربی کھال وغیرہ کو بھی عام ہے۔"

" وھوالذی سخر البحر لتاکلوا منہ لحما طریاً(۱۱) ومن کل تاکلون لحماً طریاً "(۱۲)

ان دونوں آیتوں میں "**لحماً طریا**" سے مچھلی مراد ہے اور کھانے کا حکم اس کے گوشت میں منحصر نہیں بلکہ چربی وغیرہ دیگر اجزا کو بھی شامل ہے۔

" لن ینال اللہ لحومھا ولا دماؤھا ولکن ینالہ التقوی منکم" یعنی اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں قربانی کے جانوروں کے گوشت نہیں پہنچتے بلکہ مومن کا تقویٰ پہنچتا ہے۔" قربانی کے گوشت کا اللہ تعالیٰ تک نہ پہنچنا جو اس آیت میں مذکور ہے وہ گوشت میں منحصر نہیں بلکہ چربی وغیرہ دیگر جزا کو بھی شامل ہے، کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ اس آیت کی رو سے قربانی کے جانروں کے صرف گوشت

نہیں پہنچتے، دیگر اجزا اللہ تعالیٰ تک پہنچ جاتے ہیں۔لغت وعرف کے مطابق لفظِ لحم کے ان قرآنی استعمالات پر غور کرنے سے یہ حقیقت آفتاب سے زیادہ روشن ہوکر سامنے آجاتی ہے کہ کسی کے لحم کیلئے حرمت یا حلت کا جو حکم ثابت ہو وہ لحم کے علاوہ اس جاندار کے بقیہ اجزا کو بھی شامل ہوتا ہے۔ لہٰذا لحم الخنزیر کیلئے حرمت کا وجود حکم وارد ہے وہ اس کی بقیہ اجزا چربی وغیرہ کو بھی عام ہے اور چونکہ ''انہ رجس'' صرف خنزیر کیلئے وارد ہوا، اس لیے نجس العین خنزیر ہی ہے اور اس کی یہ حرمت ونجاست لعینہ اس کی بیع کے حرام ہونے کی دلیل ہے، اور یہ ایسی دلیل ہے جسے پوری امتِ مسلمہ نے دلیلِ شرعی تسلیم کیا ہے جس کے بعد خنزیر کی بیع کتاب وسنت کی روشنی میں جائز ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، داؤد ظاہری کا مذہب کتابوں میں منقول ہے کہ وہ صرف لحم خنزیر کی حرمت کا قائل تھا لیکن لغت وعرف کے مطابق لفظ ''لحم'' کے قرآنی استعمالات کی روشنی میں اس کے مذہب کا بطلان واضح ہو گیا علاوہ ازیں اجماعِ امت کے خلاف کوئی مذہب قابلِ قبول نہیں، پھر یہ کہ صدیوں سے داؤد ظاہری کا یہ مذہب ''نسیاً منسیا'' ہو چکا ہے، ان سب امور سے قطعِ نظر کے بعد بھی داؤد ظاہری کا مذہب کوئی الجھن پیدا نہیں کرسکتا کیونکہ ہمارے پیشِ نظر خنزیر کے بیع کا مسئلہ ہے جس کے جواز کا قول داؤد ظاہری نے بھی نہیں کیا، المحلی میں ابن حزم نے بھی بیع خنزیر کے حرام ہونے کا قول کیا ہے'' **ولا یحل بیع الخمر لا مومن ولا لکافر ولا بیع الخنازیر کذلک''** (۱۴) یعنی شراب کی بیع مومن و کافر کسی کیلئے جائز نہیں، اور اسی طرح خنزیر کی بیع بھی حرام ہے۔''

خنزیر کے بالوں سے بر بنائے ضرورت انتفاع کا قول جو بعض علماء مثلاً امام اوزاعی امام ابوحنیفہ اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے، ہمارے موقف کے خلاف نہیں کیونکہ ان حضرات نے خنزیر کے بالوں سے بر بنائے ضرورت جواز انتفاع کا قول کرنے کے باوجود خنزیر کے بالوں کی بیع کو جائز قرار نہیں دیا جیسا کہ ابوبکر جصاص

نے واضح طور پر تحریر فرمایا'' **انما استحسنوا اجازۃ الانتفاع بہ للخرز دون جواز بیعہ وشرائہ''** (۱۵) یعنی خنزیر کے بال کی طہارت اور اس کی بیع کا جواز روا ایت ضعیفہ ہے، صحیح یہ ہے کہ خنزیر کا بال نجس ہے اس کی بیع جائز نہیں۔''

مختصر یہ کہ کسی قولِ ضعیف میں خنزیر کے بال کی طہارت یا اس کی بیع کا جواز کسی قولِ ضعیف میں بھی منقول نہیں، مطلقاً کتے کی بیع بھی کسی کے نزدیک جائز نہیں، صحیح یہ ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے انہیں کتوں کی بیع کے جواز کا قول کیا جن کا رکھنا حدیث شریف کی رو سے جائز ہے جیسے شکاری کتا یا مال مویشی یا کھیتی کی حفاظت کیلئے، جبکہ خنزیر کا رکھنا کسی صورت میں جائز نہیں۔ بیشک کتا حرام ہے لیکن اس کیلئے انہ رجس کا لفظ کسی نص میں وارد نہیں، یہ حکم خنزیر ہی کیلئے کتاب اللہ میں وارد ہے، اس لیے کتے کی بیع کا قیاس خنزیر پر درست نہیں، اگر یہ قیاس درست ہوتا تو خود امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اس کی بنیاد پر خنزیر کی بیع کو جائز قرار دے دیتے جبکہ انھوں نے خنزیر کا بال بیچنا بھی جائز قرار نہیں دیا۔

درندے حرام ہیں لیکن وہ بھی نجس العین نہیں، دباغت کے بعد ان کی کھالیں پاک ہوسکتی ہیں لیکن خنزیر نجس العین ہے اس کی کھال کسی حال میں پاک نہیں ہوسکتی، اس لیے علماء امت جنھوں نے دباغت کے بعد کھال میں تجارت جو جائز قرار دیا، خنزیر کی کھال میں تجارت کو جائز نہیں کہتے تو خنزیر کا بیچنا ان کے نزدیک کیونکر جائز ہوسکتا ہے۔

گائے، بھینس وغیرہ حلال جانور اگر مردار ہوجائیں تو ان کی کھال سے فائدہ اٹھانا بعض علماء کے نزدیک مطلقاً اور بعض کے نزدیک دباغت کے بعد اس لیے جائز ہے کہ وہ خنزیر کی طرح نجس العین نہیں، یہی وجہ ہے کہ احادیث میں ان کی کھالوں سے نفع حاصل کرنے کی اجازت واباحت وارد ہے، لیکن ان احادیث کو بیع خنزیر کے جواز

کی دلیل قرار نہیں دیا جا سکتا کیونکہ خنزیر نجس العین ہے، خنزیر تو درکنار اس کی کھال بیچنے یا اس سے نفع حاصل کرنے کا جواز بھی ان احادیث سے ثابت نہیں ہو سکتا بالفرض دباغت کے بعد کسی نے جلد خنزیر کی طہارت کا قول کیا بھی ہو تب بھی یہ لازم نہیں آتا کہ اس قائل کے نزدیک خنزیر کی بیع جائز ہو، دیکھئے! ''میتۃ'' کی کھال دباغت کے بعد اسے پاک کہنے والوں اور اس کی کھال کی بیع کو جائز قرار دینے والوں میں سے کسی نے ''میتۃ'' کی بیع کو جائز نہیں کہا۔

سوال نامے میں بحث کی بہت سی راہیں نظر آتی ہیں لیکن بحث کے میدان میں آنے کیلئے جو راہ اختیار کی جائے بحث کا نتیجہ بیع خنزیر کی حرمت اور اجماعِ امت سے بیع خنزیر کی حرمت ثابت ہو چکی تو اس کے بالوں سے انتفاع کا قول کرنے کے باوجود بالوں کا بیچنا بھی حرام قرار دیا جائے کہ وہ خنزیر کی بیع کو جائز قرار دیں، اس طرح کتے کی تجارت کا مسئلہ درمیان میں لانا بھی قطعاً بے معنیٰ ہے، جبکہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے صرف شکاری، مال مویشی اور کھیتی کیلئے رکھے جانے والے کتے کی بیع کو جائز کہا ہے، ہر کتے کی بیع ان کے نزدیک ہرگز جائز نہیں، اور خنزیر کی بیع جائز ہونا تو ان کے تصور سے بھی دور ہے ان کے نزدیک تو خنزیر کے بال کا بیچنا بھی حرام ہے۔

پھر درندوں کی کھالوں اور اسی طرح حلال جانوروں کی مردار ہو جانے کے بعد ان کی کھالوں سے نفع اٹھانے کا مسئلہ بھی اس مقام پر لکھنا بیع خنزیر کیلئے مفید نہیں ہو سکتا، ان میں سے کوئی چیز بھی نجس لعینہ نہیں، اور خنزیر نجس لعینہ ہے، ان علماء میں سے کوئی بھی درندے یا مردار کی کھال بیچنے کو جائز قرار دینے کے باوجود خنزیر کی بیع کو ہرگز جائز قرار نہیں دیتا ان علماء میں سے کسی نے بھی حکم حرمت کو لحم خنزیر میں منحصر نہیں کیا وہ تو خنزیر کو حرام لعینہ سمجھتے ہیں پھر کس طرح خنزیر کی بیع کو وہ جائز قرار دیں گے۔

داؤد ظاہری جس نے اجماعِ امت کے خلاف حکم حرمت کو لحم خنزیر میں منحصر کیا وہ بھی خنزیر کی بیع کو نا جائز قرار نہیں دیتا، آج تک اس کا کوئی قول بیع خنزیر کے جواز میں

منقول نہیں ہوا، پھر کس طرح ان پیش کردہ اقوال کی روشنی میں بیع خنزیر کے جواز کی طرف راہ مل سکتی ہے، سوال نامے میں صرف بیع خنزیر کا مسلہ پیش کیا گیا ہے اس کا عدم جواز قطعاً ثابت ہو چکا اس کے علاوہ کوئی اور مسئلہ سوال نامے میں ہمارے پیشِ نظر نہیں، بحث کا نتیجہ حرمت خنزیر کے سوا کچھ نہ نکلا۔

ہم نے پوری طرح واضح کر دیا کہ عہدِ رسالت ﷺ سے لے کر آج تک کسی مسلمان نے خنزیر کی بیع کو جائز نہیں کہا، اور اقوال منقولہ میں سے کسی قول کی رو سے بیع خنزیر کے جواز کی طرف کوئی راہ نہیں مل سکتی۔ اب اس حقیقت کو تسلیم کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ کتاب و سنت اجماعِ امت کے مطابق ہر مسلمان کا مذہب یہی ہے کہ خنزیر کی بیع قطعاً حرام ہے۔

اپنے ملک کی زراعت کو خنزیر کی تباہی سے بچانے اور اس لعنت سے نجات پانے کیلئے یہی موقف کتاب و سنت اور شریعت کی رو سے متعین ہے کہ ہماری حکومت غیر اسلامی ممالک کے غیر مسلم باشندوں کو ہمارے ملک سے خنزیر برآمد کرنے کی اجازت دے دے جبکہ یہ برآمد کرنا بیع کے مترادف نہ ہو اور برآمد کرنے والوں سے کوئی قیمت نہ لی جائے، جسے سوال نامہ میں اجرت سے تعبیر کیا گیا ہے جبکہ قیمت و اجرت میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔''

حواشی اور حوالہ جات:

۱) تفسیرِ مظہری، جلد اول، صفحہ ۱۷۰۔
۲) تفسیرِ کبیر، جلد دوم، صفحہ ۱۲۷۔
۳) تفسیر خازن، جلد اول، صفحہ ۱۰۳۔
۴) ہدایہ، جلد سوم، صفحہ ۵۸۔
۵) تفسیر ابن کثیر، جلد دوم، صفحہ ۷۔
۶) القرآن، الحجرات۔

۷) القرآن، الطور۔

۸) القرآن، الواقعہ۔

۹) القرآن، البقرہ۔

۱۰) القرآن، المومنون۔

۱۱) القرآن، النحل۔

۱۲) القرآن، الفاطر۔

۱۳) القرآن، الحج۔

۱۴) المحلی، جلد ۹، صفحہ ۸۔

۱۵) احکام القرآن، للجصاص۔

۱۶) بدائع الصنائع، جلد پنجم، صفحہ ۱۴۲۔



علم کا کوہِ گراں

مفتی محمد ابراہیم القادری الرضوی (سکھر)

ماہنامہ السعید امام اہل سنت نمبر جنوری ۲۰۰۰ صفحہ ۷۸ تا ۸۰

بسم اللہ الرحمن الرحیم

باب نمبر 25

علم کا کوہِ گراں

مفتی محمد ابراہیم القادری الرضوی

(سکھر)

ماہنامہ السعید امام اہل سنت نمبر جنوری ۲۰۰۰ صفحہ ۷۸ تا ۸۰

مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ غزالی زماں امام اہلسنت نائبِ اعلیٰ حضرت علامہ سید احمد سعید کاظمی رحمۃ اللہ علیہ علم وفضل کا بحرِ بیکراں عجز وانکسار میں نمونۂ اسلاف تھے، ذہانت وفطانت اور حاضر جوابی میں اپنا ثانی نہیں رکھتے، معاصر علماء میں ان کا قد سب سے بلند تھا، میں نے اپنی زندگی میں ان جیسا قادر الکلام عالم دین نہیں دیکھا، علمی گتھیوں کو سلجھنا اور مشکل سے مشکل مسائل کی توضیح اور سہل انداز میں حل فرمانا انہیں کا حصہ تھا، جو ایک بار ان کا خطاب سن لیتا پھر بڑے سے بڑا خطیب اس کی نظر میں نہیں جچتا تھا، ان کی تقریر کی خاص بات یہ تھی کہ وہ جب کوئی سوال قائم کرتے تو سننے والا اسے لاینحل خیال کرتا اور جب اس کا جواب ارشاد فرماتے تو سننے والا اسے انتہائی معمولی سمجھتا، عشقِ سرکار ﷺ ان کی تقریر کا خاص موضوع ہوتا تھا، وہ جب اس موضوع پر بولتے تو ان پر محویت کا عالم طاری ہوجاتا، ان کی تقریر میں آنکھیں اشکبار اور دل حبِ سرکار ﷺ سے سرشار ہوتے تھے۔

ان کی شخصیت انتہائی پروقار اور چہرہ ''ذکر اللہ'' کا مظہر تھا جو ان سے ایک بار ملتا بار بار ملنے کی آرزو کرتا، وہ صرف خطابت ہی کے نہیں میدانِ تصنیف کے بھی شہسوار تھے۔ التبشیر بردالتحذیر اور تسکین الخواطر فی مسئلہ الحاضر وناظر ان کی تالیفات میں تحقیق وتدقیق کا نادر نمونہ ہیں، بلاشبہ اعلیٰ حضرت مجددِ دین وملت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ علیہ اور قبلہ عالم عارف باللہ پیر سید مہر علی شاہؒ کے بعد آپ ہی کی ذات علوم دینیہ اور فیوضاتِ ربانیہ کی امین ٹھہری، میں نے پہلی بار حضرت غزالیٔ زماں رحمۃ اللہ علیہ کی زیارت ۱۹۶۸ء میں کی تھی، جب آپ حضرت استاذ العلماء قبلہ مفتی محمد حسین قادری علیہ الرحمہ کی دعوت پر سکھر میں منعقدہ کل پاکستان سنی کانفرنس میں تشریف لائے تھے۔

۱۹۷۵ء میں جن دنوں میں جامعہ امدادیہ مظہریہ بندیال میں حضرت استاذ الکل علامہ عطاء محمد بندیالوی گولڑوی رحمۃ اللہ علیہ کے سایۂ شفقت میں زیرِ تعلیم تھا، جامعہ تعلیماتِ صوفیہ دولت گیٹ ملتان مین دورۂ میقات ومیراث کا پروگرام رکھا گیا، دورہ کیلئے بحر

العلوم قبلہ مفتی سید محمد افضل حسین شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمات حاصل کی گئی تھیں، راقم نے اپنے چند ہم سبق ساتھیوں کے ساتھ دورہ میں داخلہ لیا، انہیں ایام میں ہم ایک روز حضرت کی زیارت کیلئے ان کی رہائش گاہ پر حاضر ہوئے، عصر ومغرب کے درمیان وقت تھا، حضرت نے انتہائی شفقت سے نوازا اپنی اقامت گاہ کے قریب ایک چھوٹی سی مسجد میں نمازِ مغرب ادا فرمانے کیلئے تشریف لے گئے نماز سے فراغت کے بعد آپ نے درس دیا، آپ کے صاحبزدگان میں ایک کم سن صاحبزادہ صاحب آپ کا درس ٹیپ کرنا چاہتے تھے، میں نے دیکھا کہ خطبہ کے دوران ٹیپ ریکارڈر پلگ کی خرابی کی بناء پر آپ کو چار پانچ بار سلسلۂ کلام منقطع کرنے کے باوجود نہ صاحبزادہ صاحب کو ڈانٹ رہے ہیں نہ پیشانی پر شکن پڑ رہی ہے، ان کی جگہ کوئی اور ہوتا تو صاحبزادہ صاحب کو جھاڑ پلانے میں دیر نہ کرتا۔

اس نشست میں آپ نے قریباً ایک گھنٹہ خطاب فرمایا، وہ خطاب کیا تھا شرح عقائد خیالی شرح مواقف کے مضامین عالیہ اور مباحث سنیہ کا خلاصہ تھا، ملتان میں ہمارا قیام تقریباً چالیس روز رہا، شدید گرمی کے ان ایام میں ایک جمعہ کے سوا تمام جمعات حضرت کی اقتداء میں شاہی عید گاہ میں ادا کیے، ہر جمعہ میں دولت گیٹ اور شاہی عید گاہ کا راستہ آتے جاتے پیدال چل کر طے ہوتا تھا، ایک بار جمعہ کے خطاب میں فرمایا کہ ''اگر رسول اللہ ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے مختار بنایا ہوتا آپ نے عبداللہ بن ابی منافق کی نمازِ جنازہ پڑھی اس کے منہ میں اپنا لعاب ڈالا اور اسے اپنے جسم سے مس شدہ کپڑا پہنایا مگر ان چیزوں سے اسے کچھ فائدہ نہیں ہوا، اگر حضور ﷺ مختار ہوتے تو عبداللہ بن ابیٔ کی بخشش ہوجاتی حالانکہ اس کی بخشش نہیں ہوئی، اس کے جواب میں جو آپ نے تقریر فرمائی اس کا حاصل یہ تھا کہ ان اشیاء کا رئیس المنافقین عبداللہ بن ابیٔ کے حق میں نافق نہ ہونا سرکار ﷺ کے عدمِ اختیار کی نہیں بلکہ حضور ﷺ کے مختار ہونے کی دلیل ہے۔''

آپ نے فرمایا جب عبداللہ بن ابیّ کا انتقال ہونے لگا تو اس نے وصیت کی کہ حضور ﷺ میری نمازِ جنازہ پڑھیں اور مجھے لعابِ دہن عطا فرمائیں اور مجھے اپنا کرتہ پہنائیں، جب اس کا انتقال ہوگیا تو اس کے بیٹے حضرت عبداللہ جو ایک مخلص صحابی تھے، سرکار ﷺ سے اپنے باپ کی خواہش کی تکمیل کیلئے درخواست گزار ہوئے، حضور ﷺ نے اپنے مخلص صحابی کی بہ پاس خاطر ابن ابیّ کا جنازہ پڑھا اور اسے کرتہ پہنایا اور لعابِ دہن اس کے منہ میں ڈالا۔

جب آپ اس کی نمازِ جنازہ پڑھنے کیلئے بڑھے تو حضرت عمر ؓ نے آپ کا پیچھے سے دامن پکڑا اور عرض کرنے لگے یا رسول اللہ ﷺ: آپ اس منافق کا جنازہ پڑھنا چاہتے ہیں حالانکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو منافقین کی نماز جنازہ پڑھنے سے منع کیا ہے **ان تستغفرلهم سبعين مرة فلن يغفر الله لهم**" اے حبیب ﷺ آپ منافقین کیلئے مغفرت طلب کریں یا نہ کریں اگر آپ ستر بار ان کیلئے طلبِ مغفرت کریں گے تو اللہ تعالیٰ انہیں نہیں بخشے گا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا" اے عمر ؓ مجھے میرے رب نے منافقین کی نمازِ جنازہ پڑھنے سے کب منع فرمایا ہے، اس نے تو مجھے ان کے حق میں طلبِ مغفرت اور عدمِ طلبِ مغفرت کا اختیار دیا ہے، میں چاہوں تو ان کیلئے" استغفرلہم" کے مطابق مغفرت طلب کروں اور چاہو تو" اولا تستغفرلہم" کے مطابق مغفرت طلب نہ کروں، چنانچہ آپ نے اس اختیار کو استعمال فرماتے ہوئے اس کی نمازِ جنازہ پڑھی۔

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے" فلن یغفر اللہ لہم" اللہ تعالیٰ انہیں ہرگز نہیں بخشے گا تو پھر سرکار ﷺ نے اس کی نمازِ جنازہ کیوں پڑھی، اس کا جواب یہ ہے کہ گویا اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے محبوب اگر آپ ان کیلئے طلبِ مغفرت کریں تو یہ آپ کی فطری رحمت کا تقاضہ ہے لیکن میں وہ کروں گا جو میری شان کے لائق ہے، محبوب کے مجرم کو معاف کرنا محب کی شان کے لائق نہیں ہے، لہٰذا حبیب ﷺ میں

آپ کے مجرم کو معاف نہیں کروں گا جیسا کہ اس کے بعد خود فرماتا ہے" **ذالك بانهم كفرو بالله ورسوله**" اس لیے کہ یہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے منکر ہیں۔

اس کا دوسرا جواب یہ ہے کہ جب حضرت عمر ؓ نے پیچھے سے آپ کا دامن پکڑا تو آپ نے فرمایا" **اخر عني يا عمرفان صلوتي وقميصي لا يغنيه من الله شيا**" اے عمر پرے ہٹ جاؤ میری نماز اور قمیص میں سے کوئی چیز بھی اسے اللہ تعالیٰ کے عذاب سے نہیں بچائے گی۔ یعنی اسے نہ میری نماز سے نفع ہوگا نہ میری قمیص سے فائدہ ہوگا لیکن امید رکھتا ہوں کہ میرے اس حسنِ سلوک سے اس کی قوم کے ایک ہزار آدمی مسلمان ہوجائیں گے، حدیث شریف میں ہے کہ ادھر حضور ﷺ نے نماز ختم فرمائی اور ادھر کھڑے اس کی قوم کے ایک ہزار آدمی مسلمان ہوگئے۔ جب نماز ختم فرما چکے اور نماز پڑھانے کا منشاء پورا ہوچکا تو اللہ تعالیٰ نے منافقین کی نمازِ جنازہ پڑھنے سے ان کی قبر پر کھڑے ہونے سے روک دیا" **ولا تصل على اهلمنهم مات ابدا ولا تقم علىٰ قبره**" حضرت نے گفتگو سمیٹے ہوئے فرمایا، دیکھئے حضور ﷺ کی نماز کیسی ہے؟ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے" **وصل عليهم ان صلوتك سكن لهم**" محبوب ان پر نماز پڑھیے کہ تمہاری نماز ان کیلئے سکون ہے، چین ہے، اور دیکھئے ان کا لعابِ دہن کیسا ہے؟ جب یہ لعاب مبارک حضرت علی ؓ کی دکھتی آنکھوں میں پڑتا ہے تو وہ ہمیشہ کیلئے ٹھیک ہوجاتی ہیں اور جب یہی لعاب شریف کھاری کنویں میں پڑتا ہے تو اسے میٹھا کردیتا ہے، اور دیکھے میرے آقا ﷺ کی قمیص کیسی ہے؟ حدیث شریف میں ہے کہ صحابہ کرام آپ کے وصال کے بعد آپ کے جبہ مبارک کے دھوون کو پیتے اور اس سے شفا حاسل کرتے تھے بلکہ تمام انبیاء علیہم السلام کے لباس کی یہ شان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان میں شفا رکھی ہے، جب حضرت یوسف علیہ السلام کے لباس کی یہ شان ہے کہ اللہ تعالیٰ

نے ان میں حضرت یعقوب علیہ السلام کی بینائی پہلے جیسی نہ رہی اور حضرت یوسف علیہ السلام کا بھیجا ہوا کرتہ ان کے چہرے پر ڈالا گیا تو قرآن مجید فرماتا ہے "**فارتد بصیرا**" کرتہ ڈالتے ہی حضرت یعقوب علیہ السلام کی بینائی لوٹ آئی۔

پتہ چلا حضور ﷺ کی نماز میں نفع ہے قمیص میں نفع ہے اور لعاب شریف میں نفع ہے حضرت نے گرجدار لہجہ میں فرمایا "میں کہتا ہوں کہ حضور ﷺ کے اختیار میں ہے جسے چاہیں اپنے تبرکات سے نفع پہنچائیں اور جس سے چاہیں نفع روک دیں چونکہ عبداللہ بن ابی اس کا اہل نہ تھا اس لیے آپ نے اس سے نفع روک دیا فرمایا "**اخر عنی یا عمر فان صلوتی وقمیصیلایغنیه من الله شیا**" دیکھئے آگ کا کام جلانا ہے مگر جب حضرت خلیل علیہ السلام کو آگ میں ڈالا گیا تو اللہ تعالیٰ نے "**یا نار کونی براد وسلام ما علٰی ابراهیم**" فرما کر آگ کے اثر کو روک دیا۔ جس طرح اللہ تعالیٰ نے آگ کے اثر کو روک دیا اس طرح اس کے حبیب نے اپنی نماز، قمیص اور لعابِ دہن کے اثر کو روک دیا، آپ دنیا میں کوئی ایسا طبیب دکھا سکتے ہیں جو نافع اور مجرب دوا کسی مریض کو کھلائے اور دوا کے نفع کو روک دے، آپ ایسا طبیب نہیں دکھا سکتے کیونکہ فطری نفع کو کوئی نہیں روک سکتا مگر اللہ کے محبوب ﷺ کی شان یہ ہے کہ جب چاہیں چیزوں کے فطری نفع کو روک دیں لہٰذا یہ واقعہ سرکار کے عدم اختیار کی نہیں بلکہ انکے اختیار کی چمکتی ہوئی دلیل ہے۔

غالباً ۱۹۸۱ء کی بات ہے کہ آپ سکھر میں جامع مسجد آدم شاہ کے افتتاح کے وقت اپنی خدمات کے ضمن میں ایک واقعہ ارشاد فرمایا کہ "میں کمسن تھا، ابھی میری داڑھی نہیں اتری تھی کہ میں قادیان گیا اور قادیانی علماء سے مناظرہ کیا، میں نے ان سے پوچھا کہ بخاری کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میری اور گزشتہ انبیاء علیہم السلام کی مثال ایسی ہے جیسے کسی شخص نے ایک مکان بنایا" **فاکملها فاحسنها**" اس نے اسے مکمل اور حسین بنایا مگر اس میں ایک اینٹ کی جگہ چھوڑ دی،

لوگ اس گھر میں داخل ہوتے ہیں اور اس کے حسنِ تعمیر پر تعجب کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ کاش یہ اینٹ کی جگہ خالی نہ ہوتی۔"

میں نے قادیانی علماء سے پوچھا کہ نبوت کی عمارت میں فقط ایک اینٹ کی گنجائش تھی جسے حضور سید عالم ﷺ نے پر کردیا اب تم بتاؤ مرزا غلام احمد قادیانی کو کہاں ڈالو گے؟ وہ سب سوچ میں پڑ گئے، پھر ان میں سے ایک بولا، عزیز بات یہ ہے کہ جب عمارت بنائی جاتی ہے تو اس کا پلستر بھی کیا جاتا ہے تو ہم مرزا صاحب کا پلستر کردیں گے، میں نے کہا تم مرزا صاحب کا پلستر بھی نہیں کرسکتے۔ سرکار ﷺ نے فرمایا "**فاکملها**" بنانے والے نے عمارت کو مکمل کردیا اور پلستر کے بغیر عمارت مکمل نہیں ہوسکتی۔"

پھر ایک اور نے ہمت کی وہ کہنے لگا کہ دیکھو عزیز ٹھیک ہے پلستر کے بغیر عمارت مکمل نہیں ہوتی مگر عمارت کا رنگ وروغن بھی تو کیا جاتا ہے، ہم مرزا صاحب کا رنگ وروغن کردیں گے، میں نے کہا تم مرزا صاحب کا رنگ وروغن بھی نہیں کرسکتے، میرے آقا ﷺ نے فرمایا "**فاحسنها**" بنانے والے نے عمارت کو حسین وجمیل بنایا اور عمارت کا حسن رنگ وروغن سے ہی ہوتا ہے، میرے اس استدلال نے اس کا ناطقہ بند کردیا، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ حضرت کے درجات کو بلند فرمائے ان کے فیوض کو عام فرمائے۔ (آمین)



بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باب نمبر 26

ضیغمِ اسلام غزالیٔ زماں رحمۃ اللہ علیہ

از سیّد علامہ سید احمد سعید کاظمی رحمۃ اللہ علیہ

غیروں کی نظروں میں

صوبیدار (ر) جلال الدین ڈیروی)

ماہنامہ السعید امام اہل سنت نمبر ۴ ۲۰۰۴ صفحہ ۲۷ تا ۳۵

صوبیدار (ر) جلال الدین ڈیروی فرماتے ہیں کہ مجلسِ اخوۃ کے زیرِ اہتمام ڈپٹی کمشنر صاحب ملتان کی صدارت میں ایک اجلاس منعقد ہوا جس میں ہر فرقہ کے علماء موجود تھے دورانِ اجلاس دیوبندیوں کے مشہور و معروف عالم محمد علی جالندھری نے کہا، اگر کوئی دکاندار اپنے سودے کی تعریف کرتا ہے تو ٹھیک ہے لیکن اس دوسرے کے سودے کی برائی نہیں کرنی چاہیے، مطلب یہ کہ ہر ایک کو صرف اپنا عقیدہ ظاہر کرنا چاہیے اور کسی مخالف کے عقیدہ کی برائی بیان نہیں کرنی چاہیے، اس پر حضرت علامہ سید احمد سعید کاظمی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ یہ قاعدہ قرآن پاک کی تعلیم کے خلاف ہے کیونکہ قرآن پاک میں جہاں توحید کا ذکر کیا گیا ہے وہاں ساتھ ہی شرکت کی مذمت بھی کی گئی ہے اور جہاں مومنین مخلصین کا ذکر فرمایا گیا ہے وہاں ساتھ ہی کفار و منافقین کا رد بھی کیا گیا ہے لہٰذا جہاں اپنا عقیدہ بیان ہوگا وہاں منکرینِ شانِ رسالت کی تردید بھی ہوگی اور مثبت بیان کے ساتھ منفی بیان بھی ہوگا دوسری بات جالندھری صاحب نے یہ کہی کہ ہمارے اکابر میں سے کسی نے کسی پر کفر کا فتویٰ چسپاں نہیں کیا، جبکہ بعض لوگوں نے کفر کے فتوے جاری کرنے، کافر بنانے کی مشینیں بنائی ہوئیں ہیں، اس پر حضرت علامہ کاظمی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا جہاں تک ہمارا معاملہ ہے۔۔ چونکہ ہمارے چھوٹے بڑے کسی عالم نے کبھی شانِ رسالت میں اہانت یا گستاخی کا تصور بھی نہیں کیا اس لیے ان پر کوئی فتویٰ لگنے کی نوبت کیسے آسکتی ہے؟ لیکن ابھی تو مولانا صرف اپنے سودے کی بات کر رہے تھے اب ہم پر کافر بنانے کی مشینیں ہونے کا طعنہ کیوں دے رہے ہیں؟ تیسری بات مولانا جالندھری صاحب نے یہ کہی کہ میں لوہے کی لٹھ دیوبندی ہوں، اگر کسی نے مجھ سے اختلافی مسئلہ پوچھنا ہو تو مسجد میں میرے پاس آئے، یہاں نہیں بتاؤں گا، اس کے جواب میں حضرت علامہ کاظمی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ لوہا تو بھٹی میں پگھل جاتا ہے اور مختلف سانچوں میں ڈھال دیا جاتا ہے لیکن میں اپنے میں پتھر کی طرح بھاری اور مستحکم ہوں اس لیے اگر کوئی مجھ سے مدرسہ یا اس اجلاس میں کوئی مسئلہ مثلاً یہ پوچھے کہ

دیو بندی کے پیچھے نماز اور دیو بندی مدرسہ میں کھالیں دینا جائز ہے یا نہیں؟ تو میں کہوں گا کہ ہرگز جائز نہیں وہ اس لیے کہ یہ عظمت رسالت کا مسئلہ ہے اس میں سکوت وگریز مومن کی شان کے خلاف ہے۔(۱)

اس واقعہ سے بات نکھر کر سامنے آگئی کہ حضرت علامہ سید احمد سعید کاظمی رحمۃ اللہ علیہ اپنے مسلک پر مضبوطی سے قائم تھے، اہلِ علم جانتے ہیں کہ انھوں نے زندگی بھر اپنے عقائد کو چھپانے یا ان میں لچک پیدا کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی لیکن ان کے باوجود تمام مکاتبِ فکر کے سرکردہ رہنما ان کا بے حد ادب واحترام کرتے تھے، اور بعض اوقات تو مخالف مکاتبِ فکر کے بڑے بڑے علماء انہیں متفقہ طور پر اپنا قائد نامزد کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے تھے، اس کی بنیادی وجہ یہ کہ وہ دلیل کی زبان میں بات کرتے تھے اور مخالفین پر طنز و تشنیع کے تیر برسانے اور ان کی دل آزاری کرنے کی بجائے ان کو دعوتِ غور وفکر دیتے اور صحیح وغلط کا شعور بیدار کرنے کی کوشش کرتے تھے پھر ان کی صاف گوئی، تقویٰ، علمی وجاہت اور خاص کر حضور نبی کریم ﷺ سے ان کی بے پناہ عقیدت و محبت اس پر مستزاد تھی اختصار کے پیشِ نظر یہاں چند سرکردہ راہنماؤں کے تاثرات پیشِ خدمت ہیں۔

ابوالاعلیٰ مودودی اور ممتاز دیو بندی علماء:

۱۹۶۶ء کا جب آئین بن رہا تھا اس وقت بھی قومی سطح پر بحث ہوتی تھی کہ فقہ حنفی پبلک لاء بن جائے، مولانا مودودی اس کے خلاف تھے، ان کے نزدیک صرف کتاب وسنت ہی آئین کی بنیاد ہونی چاہیے ان کا یہ بھی خیال تھا کہ فقہ حنفی پبلک لاء بننے کی صلاحیت نہیں رکھتی، مولانا مودودی ملتان آئے، پھول ہٹ کی مسجد میں قیام کیا اور حنفیت کے دعویدار علماء دیو بندی کو مباحثہ کی دعوت دی، حضرت قبلہ کاظمی رحمۃ اللہ علیہ سے رابطہ کیا، اس وقت ملتان میں دیو بندی اکابرین میں مولانا خیر محمد جالندھری، سید عطاء اللہ

شاہ بخاری، مفتی محمود جیسے لوگ موجود تھے، ان سب حضرات نے غزالی زماں امامِ اہلسنت علامہ سید احمد سعید کاظمی رحمۃ اللہ علیہ کو اپنا قائد منتخب کیا اور مولانا مودودی سے تین روز مباحثہ میں غزالی زماں رحمۃ اللہ علیہ نے فقہ حنفی کی جامعیت پر ناقابلِ شکست دلائل دیے اور علمی اعتبار سے ثابت کیا کہ فقہ حنفی ہی پبلک لاء بننے کی صلاحیت رکھتی ہے، مولانا مودودی نے عدل وانصاف سے کام لیا، حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے دلائل کو تسلیم کرلیا اور عمر بھر فقہ حنفی پبلک لاء بنانے کی حمایت کرتے رہے۔(انٹرویو علامہ سید مظہر سعید کاظمی)(۲)

سابقہ رکن قومی اسمبلی جناب جاوید پراچہ (دیو بندی):

حضرت (مولانا شمس الحق) افغانی صاحب (دیو بندی) اور (علامہ سید احمد سعید کاظمی رحمۃ اللہ علیہ) دونوں اپنے اپنے میدان میں یعنی تفسیر وحدیث میں اپنے وقت کے امام تھے اور علم کا پہاڑ تھے، اس لیے اس میدان میں تو ان کا تقابل دشوار ہے، البتہ ان دونوں بزرگوں میں دو بہت نمایاں واضح فرق تھے، ایک تو یہ کہ حضرت کاظمی رحمۃ اللہ علیہ بہت خوش لباس تھے اور اس بارے میں بہت اہتمام کرتے تھے جبکہ حضرت افغانی صاحب اس سلسلے میں بہت بے نیاز بلکہ لا پرواہ واقع ہوئے تھے بلکہ کئی کئی دن تک لباس تبدیل نہ فرماتے تھے اور دوسرا فرق یہ تھا کہ علامہ کاظمی رحمۃ اللہ علیہ بہت زیادہ مہمان نواز تھے، جامعہ (اسلامیہ بہاولپور) سے کوئی شاگرد بھی اگر آپ کے گھر جاتا تو وقت کے لحاظ سے کھانا کھائے یا چائے پیے بغیر کبھی واپس نہ آتا تھا جبکہ حضرت افغانی صاحب کے گھر سے اگر کبھی چائے مل جاتی تھی تو وہ ہفتوں اس کا تذکرہ کرتا رہتا۔(۳)

مولانا سید حامد میاں مرکزی صدر جمعیت علماء اسلام:

حضرت علامہ سید احمد سعید کاظمی رحمۃ اللہ علیہ ایک جید عالمِ دین تھے، ان کے انتقال پر بے حد افسوس ہوا ہے، ان کے قائم مقام افراد کو چاہیے کہ وہ مسلمانوں میں اتحاد پیدا کریں اور حضرت صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی روح کو تسکین پہنچائیں۔(۴)

جناب حفیظ الرحمٰن جماعتِ اسلامی:

اسی عرصے میں دو ایسی شخصیتوں نے کوچ کیا جو اپنے اعتدال پسند مسلک کی بناء پر علمائے دین میں معروف و ممتاز تھیں، ہماری مراد سید احمد سعید کاظمیؒ (متوفی ۴ جون، ملتان) اور مولانا گلزار احمد مظاہری (متوفی ۱۰ ستمبر لاہور) سے ہے، اول الذکر مولانا مظاہری ہمارے انتشار آمادہ معاشرے میں اتحاد و یگانیت کی علامت تھی، ایسی شخصیتوں کی مساعیٔ جمیلہ کی جو فضا پیدا ہوتی ہے وہ دراصل ادب کے مقاصد عالیہ ہی کی تکمیل کا ایک وسیلہ بنتی ہے۔

جو شخصیتیں ہمارے درمیان سے اٹھ گئیں ان کی جدائی پر ہمارے دل سوگوار ہیں ایسی قیمتی شخصیتوں کی مفارقت معاشرے کا ایک ایسا نقصان ہے جس کی تلافی کسی دوسری صورت میں ممکن نہیں ہوتی۔ (۵)

دیوبندی علماء و طلباء:

ملتان میں دیوبندیوں کا ایک بہت بڑا مشہور مدرسہ قاسم العلوم جو انوار العلوم کے مقابلے میں بنایا گیا تھا اور مفتی محمود اس کے کرتا دھرتا تھے، اس مدرسے کے طالب علموں کو کوئی الجھن پیش آتی یا کسی مشکل کا سامنا ہوتا تو مفتی محمود امتحان لینے کی نیت سے ان طالب علموں کو مدرسہ انوار العلوم میں حضرت قبلہ کاظمیؒ کے درسِ حدیث میں بھیجتے اور وہ طلباء آپ کے جوابات سے مطمئن ہو کر لوٹتے بلکہ انوار العلوم میں داخل ہو جاتے، دیوبندی علماء میں مولوی رسول خان اور مولانا کشمیری علمِ حدیث میں مستند ترین مانے جاتے تھے اور مولوی خیر محمد جالندھری بھی دیوبندیوں میں بڑا درجہ رکھتے تھے، یہ سب لوگ ملتان میں ہوتے تھے، علامہ کاظمیؒ اپنی تبلیغی مصروفیات کے باوجود درسِ حدیث کا انتظام کرتے اور یہ لوگ آپ کے درس سے باخبر رہتے اور اپنی اپنی محفلوں میں برملا کہتے کہ علامہ کاظمیؒ اس دور کے بے مثال محدث ہیں۔ (۶)

میاں طفیل محمد سابق امیر جماعتِ اسلامی:

علامہ کاظمیؒ عالم باعمل اور روحانی شخصیت تھے، ان کی وفات ملک و قوم کیلئے بہت بڑا صدمہ ہے۔ (۷)

سید عطاء اللہ شاہ بخاری:

عطاء اللہ شاہ بخاری، حضرت علامہ سید احمد سعید کاظمیؒ سے بے حد محبت اور عقیدت رکھتے تھے، بخاری شاہ صاحب اگرچہ عمر میں کاظمی صاحبؒ سے بہت بڑے تھے لیکن ان کے علم و فضل کے بہت معترف تے، جب علامہ کاظمیؒ مدرسہ انوار العلوم میں درسِ حدیث دیتے تو کبھی کبھار عطاء اللہ شاہ بخاری صاحب سننے کیلئے آ جاتے، حضرت کاظمیؒ سے میں (مولانا محمد شفیع صاحب سعیدی) نے سنا کہ کبھی کبھار ایسا ہوتا کہ درسِ حدیث آئے اور میری بے خبری کے عالم میں طلباء کے پیچھے آ کر بیٹھ گئے۔ (۸)

ایک مرتبہ علامہ کاظمیؒ ''میبذی'' (فلسفے کی ایک نہایت ادق کتاب) پڑھا رہے تھے اور مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری اسی دوران وہاں آ گئے، جب انھوں نے علامہ کاظمیؒ کا درس سنا تو بہت حیران ہوئے اور دورانِ درس دخل اندازی کر کے پوچھ بیٹھے کہ آپ نے میبذی کس سے پڑھی ہے؟ علامہ کاظمیؒ نے کہا'' میں نے یہ باقاعدہ تو کسی سے نہیں پڑھی، ہاں اس کے چند اسباق اپنے مرشدِ کریم حضرت سید محمد خلیل کاظمی شاہ امروہویؒ سے پڑھے تھے۔ (۹)

یہ ۱۹۵۳ء، ۵۴ کی تحریکِ ختمِ نبوت کے دور کی بات ہے حضرت قبلہ کاظمیؒ نے ارشاد فرمایا کہ ''ختمِ نبوت کی تحریک میں تمام مکاتبِ فکر کے علماء اکھٹے تھے، نبی معظم ﷺ کے اوصاف و کمالات اور خصوصیات کا تزکرہ ہوتا تھا، جلسوں میں ختمِ نبوت کا عنوان سرکارِ دو عالم نور مجسم ﷺ کے دیگر محاسن و محامد کے ہمراہ خوب نکھر کر سامنے آتا

تھا، اس پس منظر میں ایک جلسے میں خطاب کرتے ہوئے میں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا وہ واقعہ بیان کیا کہ حضرت عزرائیل علیہ السلام بغیر اذن کے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بارگاہ میں قبضِ روح کیلئے حاضر ہوئے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے آپ کو طمانچہ مار دیا، جس سے ملک الموت کی آنکھ نکل آئی، میں نے یہ بھی بیان کیا کہ اگر تقدیرِ الٰہی حائل نہ ہوتی تو بات صرف ایک آنکھ پر نہ ٹلتی کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے طمانچے میں وہ طاقت تھی کہ ساتوں آسمانوں اور ساتوں زمینیں اس کی تاب نہ لاسکتیں اور چور چور ہو جاتیں۔

اس واقعے کا اس ماحول اور عوام کے جذبات کے پیشِ نظر ایسا اثر ہوا کہ سارا مجمع بھڑک اٹھا، نعرہ ہائے تکبیر و رسالت اور لوگوں کے جزبات نے وہ سماں باندھا کہ عطاء اللہ شاہ بخاری نے سٹیج پر کھڑے ہو کر خود نعرے لگوائے اور بار بار کہا کہ کاظمی میرا پیر ہے، کاظمی میرا پیر ہے، (رحمۃ اللہ علیہ) (۱۰)

ممتاز شیعہ رہنما سید علی نواز گردیزی:

علامہ سید احمد سعید کاظمی رحمۃ اللہ علیہ عہدِ حاضر میں مدینۃ الاولیاء کے روحانی تاجدار تھے، وہ سچے عاشقِ رسول ﷺ اور محبِ اہلِ بیت تھے، علم و عمل کے پیرِ طریقت علامہ سید احمد سعید کاظمی رحمۃ اللہ علیہ کو ان کے اتحاد بین المسلمین کی وجہ سے امام اہلسنت نہیں بلکہ امامِ امتِ مسلمہ کہنا چاہیے، انہیں صرف امام اہلسنت کہہ کر آپ ہم اہلِ تشیع کو ان کے قائدانہ استفادہ سے کیوں محروم کرتے ہیں؟ بلاشبہ آپ کی وفات ایک عظیم قومی اور ملی سانحہ ہے۔ (۱۱)

سابق صدرِ مملکت جنرل محمد ضیاء الحق:

مرحوم (حضرت قبلہ کاظمی رحمۃ اللہ علیہ) ایک ممتاز مسلم سکالر تھے جو اپنے تقویٰ، سچائی اور مذہبی معاملات میں غیر جانبدارانہ خیالات کیلئے معروف تھے، وہ اسلامی اقدار کی روشن اور تابندہ مثال تھے، جنھوں نے اپنی پوری زندگی اسلامی تعلیمات کیلئے وقف کر دی

تھی۔ (۱۲)

مولانا معین الدین لکھنوی مرکزی جماعت اہلِ حدیث:

مسلکی اختلاف کے باوجود حضرت علامہ سید احمد کاظمی رحمۃ اللہ علیہ کی دل سے قدر کرتا ہوں، اس کے علم کی بناء پر جو اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے فضلِ خاص سے عطا کیا تھا، آپ نقطہ رس عالمِ دین تھے اور علم و فضل، زہد و تقویٰ اور قوتِ بیان میں اپنی مثال آپ تھے، علامہ کاظمی رحمۃ اللہ علیہ کی رحلت سے نہ صرف اہل سنت کا بلکہ پوری دنیائے اسلامی کا نقصانِ عظیم ہوا ہے۔ (۱۳)

علامہ منظور احمد رحمت (دیوبندی):

(ایڈیٹر ہفت روزہ "مدینہ" بہاولپور)

حضرت احمد سعید شاہ کاظمی رحمۃ اللہ علیہ کا شمار ان مشاہیر میں ہوتا ہے جن کا متبادل کہیں نظر نہیں آتا اور جن کا خلا کبھی پورا نہ ہوگا اور یہ ایک ایسی عظمت ہے جو خاص بندوں کو حاصل ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ یہ عظمت صرف ان ہستیوں کو عطا کرتا ہے جو اپنی ذات کے اعتبار سے آفتاب و مہتاب ہوتے ہیں اور اگر آفتاب و مہتاب خلاؤں میں گم ہو جائیں یا ڈوب جائیں تو پھر دنیا میں تاریکی پھیل جاتی ہے اور تاریکی موت کا دوسرا نام ہے۔

حضرت مولانا احمد سعید کاظمی رحمۃ اللہ علیہ کا مزاج درویشانہ تھا اور ادائیں قلندرانہ تھیں، ان کا علم بحرِ بیکراں تھا اور ان کا فکر ہمالیہ سے بلند تھا، ان کی سوچ قرآن و حدیث کا پرتو تھی اور ان کی اقامت نور کا ہالہ ان کی ذات میں فرشتوں کا جمال تھا اور ان کی صفات میں رشد و ہدایت کی روشنی تھی وہ متقدمین کی تقدیس کا عکس تے، اور اکابرین کے علم و ہنر کے امین تھے، ان کا وجود خیر و برکت کا نقیب تھا اور رحمتوں کا منبع اور مرکز تھا۔ آہ!۔

حضرت مولانا سید احمد سعید کاظمی رحمۃ اللہ علیہ بلند پایہ محدث تھے، یکتا مفسر تھے، بالغ نظر

فقیہہ تھے اور بے مثال اور بے نظیر خطیب تھے، ان کی تقریر دریاؤں کی روانی کو شرماتی تھی، ان کا استدلال پہاڑو سے زیادہ مستحکم تھا، ان کا لب ولہجہ پھولوں سے زیادہ شگفتہ تھا اور ان کا اندازِ تدریس حکیمانہ اور کلیمانہ تھا، جب مولانا رحمۃ اللہ علیہ جامعہ اسلامیہ بہاولپور میں شیخ الحدیث کے عہدہ جلیلہ پر فائز رہے تو ان کے درس میں نامور علماء بھی اکتسابِ فیض کیلئے شرکت کرتے تھے، چنانچہ اس وقت کے عالمِ دین نے کہا تھا کہ ”جب مولانا کاظمی رحمۃ اللہ علیہ درس کیلئے لب کشائی کرتے ہیں اور احادیث کی تشریح کیلئے نکات پر بحث فرماتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے گویا انشراح صدر کیلئے انہیں ارواحِ قدسیہ کا تعاون حاصل ہو چکا ہے۔ (۱۴)

مولانا وصی مظہر ندوی، حیدر آباد:

علامہ سید احمد سعید کاظمی رحمۃ اللہ علیہ نے علم کا جو خزانہ اپنی تصانیف اور شاگردوں کی صورت میں چھوڑا ہے وہ ہمارے لیے گراں بہا اثاثہ ہے وہ راسخ فی العلم تھے علامہ کاظمی رحمۃ اللہ علیہ نے ہمیشہ وجودِ اختلاف کو دور کرنے کی کوشش کی، ہمیں انکے مشن کو آگے بڑھانے کیلئے امتِ مسلمہ کی وحدت واتحاد اور صحیح العقیدہ افراد کو منظم کرنے کیلئے علامہ کاظمی رحمۃ اللہ علیہ کی تقلید کرنا ہوگی۔ (۱۵)

مودودی صاحب نے فقہ حنفی کو پبلک لاء بنانے کی حمایت کرتے ہوئے اپنے ایک مکتوب میں لکھا ہے۔

”جس طرح ایران میں پبلک لاء جعفری فقہ کے مطابق ہے اور وہاں کے سنیوں کو یہ پوزیشن قبول کرنی چاہیے اسی طرح پاکستان میں پبلک لاء حنفی اکثریت کی فقہ پر مبنی ہونا چاہیے اور یہاں بھی اہلِ تشیع کو یہ پوزیشن کر لینی چاہیے۔

(عاصم نعمانی، مکاتیب سید ابوالاعلیٰ مودودی حصہ دوم، اسلامک پبلی کیشنز لاہور، ۱۹۸۱ء ص ۲۲۵)

حواشی

1) ہفت روزہ رضائے مصطفیٰ گوجرانوالہ، ۱۸ جولائی ۱۹۵۸ء ص ۶۔

2) ماہنامہ ندائے اہلسنت لاہور نومبر ۱۹۹۵ء ص ۲۴۔
3) ماہنامہ السعید ملتان جنوری، ۲۰۰۰ء امام اہلسنت نمبر ص ۴۷۔
4) ماہنامہ نوائے انجمن لاہور مارچ، اپریل ۱۹۹۳ء کاظمی نمبر، ص ۶۵۔
5) ماہنامہ سیارہ لاہور ستمبر اکتوبر ۱۹۸۶ء سالانہ ص ۱۰، ۱۱۔
6) الف، ماہنامہ ندائے اہلسنت لاہور، مئی ۱۹۹۰ء ص ۷۔
(ب) ماہنامہ السعید ملتان فروری ۱۹۹۶ء امام اہلسنت نمبر ص ۸۷، ۸۸۔
7) ماہنامہ السعید ملتان مارچ ۱۹۹۷ء ص ۴۲۔
8) ماہنامہ السعید ملتان مارچ ۱۹۹۵ء امام اہلسنت نمبر ص ۱۲۳، ۱۴۔
9) ایضاً، ص ۱۶۴۔
10) ماہنامہ السعید ملتان دسمبر، ۲۰۰۱ء امام اہلسنت نمبر ص ۱۹۔
11) ماہنامہ ضیائے حرم لاہور، جولائی ۱۹۸۶ء غزالی دوراں نمبر ص ۲۲۔
12) روزنامہ دی پاکستان ٹائمز، راولپنڈی ۶ جون ۱۹۸۶ء۔
13) ماہنامہ ضیائے حرم لاہور، جولائی ۱۹۸۶ء غزالی دوراں نمبر ص ۲۲۔
14) ماہنامہ السعید ملتان جنوری ۲۰۰۰ء ص ۸۱۔
15) ماہنامہ ضیائے حرم لاہور، جولائی ۱۹۸۶ء غزالی دوراں نمبر ص ۲۲۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

باب نمبر 27

ماضی کے جھروکوں سے

جگر گوشہ غزالی زماں

سیّد علامہ سید احمد سعید کاظمی رحمۃ اللہ علیہ

ماہنامہ السعید امام اہل سنت نمبر۲۰۰۴ صفحہ ۵۹ تا ۶۸

صاحب زادہ سیّد حامد سعید کاظمی دامت برکاتہم العالیہ فرماتے ہیں کہ اباجی قبلہ علیہ الرحمۃ نے اپنی تمام تر علمی، تدریسی، تحقیقی اور تنظیمی مصروفیات کے باوجود اپنے اہلِ خانہ پر بھرپور توجہ دیتے تھے اور اپنی اولاد کی دیکھ بھال کیلئے تعلیم و تربیت کیلئے وقت بھی نکالتے تھے آج کل کسی مستند عالمِ دین، شیخ الحدیث اور شیخ التفسیر سے اگر یہ تقاضہ کیا جائے کہ وہ مبادیات پر سبق دے اور بالکل ابتدائی دینی تعلیم پر توجہ صرف کرے تو یقیناً یہ اس کیلئے بڑا مشکل ہوگا، وہ عالمِ دین اس کو اپنے لیے سبکی اور توہین تصور کرے گے کہ میں اصولِ حدیث وفقہ پر سبق دینے والا، میں تفسیری نقطوں کو باریکیوں کو اجاگر کرنے والا، مجھ سے الف ب جیسی باتیں کی جائیں تو یہ میرے لیے نہایت شرم کی بات ہے لیکن اباجی قبلہ نے اس بات کو کبھی اپنے لیے عزت کا مسئلہ نہ سمجھا بلکہ تفہیمِ دین کے ہر مرحلے پر رہنمائی وہ اپنا فرضِ منصبی تصور کرتے تھے۔ اسی لیے ان سے سوال کرتے ہوئے لوگ ہچکچاتے نہیں تھے، ان کے رعبِ علم کے باعث کچھ بزرگ اگر گریز کرتے ہوں تو علیحدہ بات ہے لیکن میں نے ہمیشہ یہی دیکھا کہ نوجوان ہوں یا پختہ عمر کے افراد یا معمر بزرگ سبھی اپنی سطح کے مطابق جواب عطا فرماتے، ان کے رویے کے باعث میں اکثر ان سے اس انداز میں سوال کر گزرتا تھا جو گستاخی کی حدوں کو چھور ہا ہوتا تھا، لیکن وہ میرے سوال کا شافی جواب اس انداز سے دیتے تھے کہ اگر کوئی اور الجھن ہوتو اس کا ذکر کرنا اور کوئی نیا سوال پوچھنے میں تذبذب نہ ہو۔

اباجی قبلہ اپنے علم کے باوجود اپنی مجتہدانہ شان اور قرآن و حدیث سے اپنے گہرے شغف کے باوجود انتہائی انکساری کا مظاہرہ فرماتے تھے، بہت سے بزرگوں نے اور دوستوں نے ان کو کہتے ہوئے سنا ہوگا کہ ''بھئی ہم تو بہت بے وقوف ہیں'' ''ہم تو کسی قابل نہیں'' ''ہم تو علماء کے قدموں کی خاک کے برابر نہیں'' اس قسم کے بیسیوں جملے اکثر ادا فرماتے تھے اور یہ بات ہمیں بہت عجیب لگتی تھی کہ جسے حضرت محدث کچھوچھوی علیہ الرحمۃ جیسی ہستی نے غزالی زماں اور رازیٔ دوراں کہا ہو، جس کے ہم

عصر علماء اس کے علم و دانش اور فہم و فراست کے بانگ دہل معترف ہوں، جس کے مخالف بھی ان کی قوتِ استدلال اور علمی گرفت کو تسلیم کرتے ہوں، جس نے میدانِ مناظرہ میں بڑے بڑے بتوں کو گرایا ہو اور جس کے علم کا دنیا میں طوطی بولتا ہو وہ یہ کہے میں تو "میں کچھ بھی نہیں ہوں" علماء کے قدموں کی خاک بھی نہیں، یہ سننا ہمیں عجیب بھی لگتا تھا اور ناگوار بھی گزرتا تھا۔

سوال: اس لیے ایک دن پوچھ ہی بیٹھے، اباجی! دنیا آپ کے علم کا لوہا مانتی ہے، اور عقلی علوم میں آپ کی دسترس اب ضرب المثل بن چکی ہے، آپ یہ سب کچھ فرما دیتے ہیں کہ میں کچھ نہیں تو ہم سمجھتے ہیں کہ آپ انکسار سے کام لے رہے ہیں، یہ آپ کی طبیعت میں عاجزی اور تواضع ہے، بیشک ایسا ہوگا لیکن مجھے یہ ارشاد فرمادیجئے کہ انکسار اور جھوٹ میں کیا فرق ہے؟ ہمارے اس منہ پھٹ انداز پر محفل میں موجود سب لوگ ششدر رہ گئے، اباجی قبلہ نے بھی ایک بار ذرا غور سے مجھے دیکھا اور پھر روایتی دل آویز تبسم آپ کے ہونٹوں پر کھلنے لگا اور حاضرین سے فرمایا "بھئی ماشاءاللہ، آپ نے حامد میاں کی اٹھان دیکھی ہے؟ سوال بھی ذہانت کا معیار ہوتا ہے؟" پھر میری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا کہ بیٹا آپ نے بہت اچھا کیا، یہ سوال مجھ سے پوچھ لیا ورنہ پتہ نہیں کسی اور کے جواب سے آپ کی تسلی ہوتی یا نہ ہوتی۔ پھر فرمایا کہ بیٹے! علم و عقل کے مختلف درجے ہوتے ہیں، اس دنیا میں کیسے کیسے ذہین لوگ موجود ہیں، اس کا اندازہ کرنا آسان نہیں ہے، علم و عقل کیا انتہاء کا ہم تصور نہیں کر سکتے۔ تو بیٹے میں جو کہتا ہوں کہ "میں بے وقوف ہوں میں بے علم ہوں تو آپ کو کیا خبر میں کس بارگاہ کا تصور کررہا ہوں۔ اگر کوئی میرے علم یا میری عقل کا معترف ہے تو وہ میرا تقابل مجھ سے کم تر درجے کے لوگوں سے کررہا ہوتا ہے اور اگر میں اپنی بے وقعتی اور کم مائیگی کا ذکر کرتا ہوں تو میں اپنے سے بلند تر ہستیوں کے سامنے اپنی فروتنی کا اقرار کررہا ہوتا ہوں، اس لیے عاجزی وانکساری جھوٹ نہیں ہوتی، امور اعتباری میں مختلف اعتبارات کا لحاظ

ہوتا۔"

ایک بار اباجی قبلہ نے تمام اہلِ خانہ کو اکٹھا فرمایا، اور فرمایا "سب افرادِ خانہ، چھوٹے بڑے سب مجھے نماز سنائیں، ہم سب کیلئے یہ سعادت بھی تھی اور بہر حال آزمائش بھی، چونکہ اباجی قبلہ کا فرمان تھا اس لیے ہم سب باری باری نماز سناتے گئے، اتفاق ایسا ہوا کہ مجھ سے پہلے جن افراد نے نماز سنائی انھوں نے التحیات کے آخر میں جو دعا پڑھی وہ یہ تھی" **ربنا اٰتنا فی الدنیا حسنة وفی الاٰخرة حسنة وقنا عذاب النار**" میں اگرچہ" **ربی جعلنی مقیم الصلوٰة ومن ذریتی ربنا وتقبل دعا**" پڑھا کرتا تھا لیکن جب مجھ سے پہلے یہ دعا پڑھی گئی تو میں نے یہ سوچ کر کہ شاید یہ دعا سنانا زیادہ بہتر ہوگا، اپنی باری پر التحیات میں آخری دعا" **ربنا اٰتنا**" سنائی اب میرے بعد میرے چھوٹے بھائی راشد سعید کی باری تھی، راشد نے جب نماز سنائی تو انھوں نے" **رب جعلنی**" والی دعا پڑھی اس پر اباجی قبلہ خوش ہوئے اور انہیں داد دی، اب سوچتا ہوں تو خیال آتا ہے کہ شاید ان کی کم عمری کے باعث حوصلہ افزائی کیلئے کیا ہوگا، یا چونکہ اس وقت تک یہ دعا پہلے کسی نے نہ پڑھی تھی اس لیے اس کی انفرادیت کا اعتراف ہوگا، لیکن اس وقت نہایت شدید قلق ہوا کہ ہم روزانہ نماز میں تو وہی دعا پڑھتے تھے جو راشد میاں نے سنائی لیکن دوسروں کو دیکھا دیکھی" **ربنا اٰتنا فی الدنیا حسنة**" پڑھ دی، اب اگر یہ کہہ بھی دوں کہ میں بھی یہی دعا پڑھتا ہوں تو وہ دادو تحسین تو بہر حال نہ ملے گی جو راشد میاں سمیٹ چکے۔

حافظ اللہ یار فریدی پرنسپل گورنمنٹ ڈگری کالج جلالپور پیروالا راوی ہیں کہ ایک بار اباجی قبلہ ﷫ ملتان سے خاصی دور دیہاتی علاقے میں تشریف فرما تھے، اتفاقاً آپ کو کچھ تکلیف ہوئی جو زیادہ شدید نہ تھی، اس لیے مقامی طور پر مشق کرنے والے ایک ڈاکٹر صاحب سے رجوع کرنے کا سوچا گیا، چونکہ تکلیف معمولی نوعیت کی تھی اس لیے

ابا جی قبلہ رحمۃ اللہ علیہ نے ڈاکٹر صاحب کو گھر بلانے کی بجائے ان کی دوکان پر جانے کو ترجیح دی، یہ بھی ان کی انسان دوستی کا ایک انداز تھا، آپ نے فرمایا کہ ڈاکٹر کے پاس تو ہر طرح کے مریض آتے ہیں، ان میں سے کچھ کی حالت بہت خراب ہوتی ہے، وہ ڈاکٹر کی فوری توجہ کے مستحق ہوتے ہیں اگر ڈاکٹر صاحب کو ہم یہاں بلائیں گے تو ایسے کسی مریض کی حق تلفی ہوسکتی ہے اور اس کیلئے کوئی شدید پریشانی بھی پیدا ہوسکتی ہے۔ اس لیے ہم اگر خود ان کی دوکان پر چلے جائیں تو یہ زیادہ بہتر ہوگا۔

بہر حال ابا جی قبلہ رحمۃ اللہ علیہ اس ڈاکٹر کی دوکان پر پہنچے، چند ایک مریض دوکان پر موجود تھے، لیکن کوئی ایمرجنسی نہ تھی اس لیے ڈاکٹر صاحب نے ابا جی کو پہلے دیکھنے کو ترجیح دی، بیماری کی علامت، تکلیف کی نوعیت پوچھنے کے بعد اور معائنہ سے فارغ ہوکر جب وہ نسخہ تحریر کرنے لگے تو ساتھ ہی گفتگو شروع کردی اور کہا رات آپ جلسے سے خطاب کر رہے تھے میرے گھر کے قریب جلسہ گاہ تھی اس لیے آواز صاف گھر ہی میں سنائی دے رہی تھی، آپ دلائل اور زورِ بیان کے ذریعے ثابت کر رہے تھے کہ نبی کریم ﷺ اپنی قبرِ انور کے اندر جسمانی حیات کے ساتھ متصف ہیں اور اسی طرح زندہ ہیں جس طرح دنیا میں تشریف فرما تھے، ابا جی نے ان کی تائید فرمائی کہ بالکل میں نے یہ سب کچھ کہا تھا اور جو کچھ کہا تھا اس کیلئے دلائل پیش کیے تھے، کوئی بات بغیر دلیل کے بغیر ثبوت کے تو نہ کی تھی۔

ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ جناب میں کوئی عالمِ دین تو نہیں ہوں کہ ان دلائل کا تنقیدی جائزہ لے کر فیصلہ کرسکوں کہ وہ دلائل کس حد تک درست اور صحیح تھے اور قابلِ قبول تھے میں تو ایک ڈاکٹر ہوں اور عملی زندگی پر یقین رکھتا ہوں، آپ جو بات کر رہے ہیں وہ طبی اور عقلی اعتبار سے ناقابلِ یقین ہے، اگر آپ کا اصرار ہے کہ آپ نے درست کہا ہے تو آیئے ایک تجربہ کرلیتے ہیں، اسی جگہ ہم ایک قبر کھودتے ہیں، آپ کو اس میں لٹاتے ہیں اور دو چار دن کے بعد یہ قبر سب کے سامنے کھولتے ہیں، زبانی

کلامی باتوں کے مقابلے میں تجربے کی بات زیادہ آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہے، پتہ چل جائے گا کہ آپ نے جو کچھ کہا اس میں کتنی حقیقت ہے۔

ابا جی قبلہ رحمۃ اللہ علیہ کے ہمراہی ڈاکٹر صاحب کے اس انداز اور گفتگو سے بہت جزبز ہوئے اور انہیں بہت غصہ آیا، لیکن ابا جی قبلہ رحمۃ اللہ علیہ بڑے تحمل سے مسکراتے ہوئے ان کی گفتگو سنتے رہے اور ہمراہیوں کو بھی حوصلے کی تلقین کرتے رہے، جب ڈاکٹر صاحب نے بات مکمل کی تو ابا جی قبلہ رحمۃ اللہ علیہ فرمایا "میں نے انبیاء کرام کی جسمانی حیات کی بات کی تھی میں تو نبی نہیں ہوں لیکن آقا کریم ﷺ کی غلامی کے صدقے میں اس تجربے اور آزمائش کیلئے بھی تیار ہوں لیکن قبر کھودنا، مجھے لٹانا اور پھر دو چار دن انتظار کرنا پھر قبر دوبارہ کھودنا اس طرح تجربہ کرنا ان سب بکھیڑوں کی بجائے اگر ابھی یہاں اپنی بات ثابت کردوں تو کیسا ہے؟ ڈاکٹر صاحب بہت حیران ہوئے "یہاں آپ یہ بات کیسے ثابت کرسکتے ہیں؟ وہ دیہاتی علاقہ تھا مریض کو ڈاکٹر لانے کیلئے ایمبولینس اور کاریں وغیرہ میسر نہ تھیں ویسے بھی وہ آج کل سے ۳۰، ۳۵ برس پہلے کی بات ہے، مریض بیل گاڑیوں پر گھوڑوں پر اونٹوں پر مطب تک آتے تھے، اتفاق سے ایک مریض ایک اونٹ پر آیا تھا اور وہ اونٹنی کلینک کے سامنے بیٹھی تھی، وہ اونٹنی حاملہ تھی۔

ابا جی قبلہ رحمۃ اللہ علیہ نے ڈاکٹر صاحب سے پوچھا کہ آپ تو ماشاء اللہ علمِ طب میں دسترس رکھتے ہیں، آپ بتایئے اس اونٹنی کے پیٹ میں جو بچہ ہے وہ زندہ ہے یا مردہ؟ ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ اگر بچہ پیٹ میں مرجاتا تو یہ اونٹنی اس اطمینان سے کیسے رہ سکتی تھی؟ خود اس کی جان کے لالے پڑے ہوتے، اس کی حالت بتارہی ہے کہ اس کے پیٹ میں جو بچہ ہے وہ زندہ ہے اور ٹھیک ٹھاک ہے، ابا جی قبلہ رحمۃ اللہ علیہ مسکرائے اور فرمایا اگر میں آپ کی بات کو چیلنج کروں اور کہوں کہ یہ کیسے ممکن ہے۔ اونٹنی کے پیٹ میں بچہ زندہ ہو، آیئے چلیں تجربہ کرتے ہیں، میں آپ کو ایک اور اونٹنی کے پیٹ میں ڈال کر اس کا پیٹ سی دیتا ہوں اور دو دن کے بعد پھر پیٹ چاک کرکے دیکھ لیں گے آپ زندہ

بچتے ہیں کہ نہیں تو آپ کیا اس تجربے کیلئے تیار ہو جائیں گے؟۔

ڈاکٹر صاحب کی خاموشی ہی ان کا جواب تھی، اس لیے ابا جی قبلہ رحمۃ اللہ علیہ نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے فرمایا کہ "آپ کہیں گے کہ پیٹ میں بچے کی زندگی کیلئے اللہ تعالیٰ نے خصوصی انتظام فرمایا ہے، اس کو غذا ماں کے خون سے ملتی ہے اس کو زندگی کیلئے ہوا بھی ماں کے توسط سے میسر آتی ہے، اس لیے وہ بچہ تو زندہ ہے میں زندہ نہیں رہ سکوں گا لیکن بہر حال آپ یہ مانتے ہیں اور جانتے ہیں کہ پیٹ میں بچہ زندہ ہے تو وہ اللہ جو اس طرح ماں کے پیٹ میں بچے کو زندگی دیتا ہے وہ اگر قبر میں اپنے محبوبوں کو زندگی عطا فرمائے تو اس میں ایسی کون سی ناقابلِ یقین بات ہے۔"

وہ ڈاکٹر صاحب جو عقیدے کے اعتبار سے دوسرے خیالات کے حامل تھے اس طرزِ استدلال کے سامنے ششدرہ گئے۔ یہ تو نہیں معلوم کہ ان کے عقائد درست ہوئے یا نہیں لیکن اس وقت بہر حال وہ ابا جی قبلہ رحمۃ اللہ علیہ کے علم اور قوتِ استدلال کے بے حد معترف ہوئے اور اس اعتراف کے اظہار میں انھوں نے بخل سے کام نہیں لیا۔

"

ایک بار ملتان کے نشتر ہسپتال میں آپ عارضۂ قلب کے باعث انتہائی نگہداشت کے وارڈ میں معروف ماہر امراضِ قلب ڈاکٹر فاروق نذیر صاحب کے زیرِ علاج تھے، رمضان کا مہینہ تھا، ڈاکٹر صاحب آتے تھے تو اپنی پیشہ ورانہ تربیت کے مطابق مریض سے اس کے مزاج اور افتادِ طبع کے مطابق ہلکی پھلکی گفتگو بھی کرتے تھے، چنانچہ ابا جی قبلہ رحمۃ اللہ علیہ کے پاس آتے تھے تو کوئی دینی مسئلہ کوئی روحانی معاملہ زیرِ غور لے آتے تھے، ایک دن جب وہ ابا جی قبلہ رحمۃ اللہ علیہ کا معائنہ کرنے کیلئے آئے تو روزے کے حوالے سے مسئلہ چھیڑ دیا کہ کان میں دوا ڈالنے سے روزہ ٹوٹتا ہے کہ نہیں؟ ابا جی قبلہ رحمۃ اللہ علیہ نے بتایا کہ فقیہ کا یہی حکم ہے کہ کان میں دوا ڈالنے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے، ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ کان کے اندر تو پردہ ہوتا ہے آپ باہر سے تیل ڈالیں،

دوا ڈالیں اور پھر چاہیں تو سر ٹیڑھا کر کے وہ دوا واپس انڈیل لیں، کان کے ذریعے جو چیز ڈالی جائے وہ جسم کے اندر تو نہیں جا سکتی، ہاں آہستہ آہستہ مساموں کے ذریعے جذب ہوتی ہے تو مساموں کے ذریعے تو غسل کرتے ہوئے پانی بھی جذب ہوتا ہے اسی لیے شدید گرمی میں غسل کرنے سے روزہ کی شدت میں کمی واقع ہو جاتی ہے،۔ چونکہ کان کی دوا جسم کے اندر پردے سے گزر کر داخل نہیں ہو سکتی اس لیے اس کے ذریعے روزہ ٹوٹنا زیادہ معقول بات نہیں ہے۔

ابا جی قبلہ رحمۃ اللہ علیہ نے پوچھا کہ کان کے پردے کے باعث دوا اندر نہیں جا سکتی تو کیا اس کے پردے میں کبھی سوراخ بھی ہوتا ہے کہ نہیں؟ دراصل ابا جی قبلہ کے اپنے دائیں کان میں تکلیف رہتی تھی اور ڈاکٹروں نے بتایا تھا کہ اس کے پردے میں سوراک ہے اسی پس منظر میں ابا جی قبلہ نے سوال کیا تھا ڈاکٹر فاروق نذیر نے کہا کہ کان کا پردہ پھٹ جانا اور اس میں سوراخ ہو جانا تو کوئی بعید از قیاس بات نہیں ہے، بہت سے لوگوں کو یہ شکایت ہو جاتی ہے اور اکثر اوقات تو تکلیف بڑھنے پر معائنہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ کان کا پردہ پھٹا ہوا ہے یا اس میں سوراخ ہے، اس سے پہلے علم نہیں ہوتا۔

ابا جی قبلہ رحمۃ اللہ علیہ مسکرائے اور فرمایا ڈاکٹر صاحب آپ خود بتائیے کہ بہت سے لوگوں کے کان کے پردے میں سوراخ ہوتا ہے اور انہیں علم نہیں ہوتا، اب بتائیے ہم سے کوئی مسئلہ پوچھے کہ کان میں دوا ڈالنے سے روزہ ٹوٹتا ہے کہ نہیں تو کیا ہم اسے یہ کہیں کہ پہلے کان کا معائنہ کرا کے آؤ، کہیں تمہارے کان کے پردے میں سوراخ تو نہیں، اس کے مقابلے میں اگر فقہاء نے احتیاط کے تقاضے کے تحت اور اس حکمت کے تحت کہ بہت سے لوگوں کے کانوں کے پردے میں سوراخ ہوتا ہے اس لیے عمومی فتویٰ یہی دیا جائے گا کہ کان میں دوا ڈالنے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے تو اس میں کیا خرابی ہے۔

دراصل اباجی قبلہ رحمۃ اللہ علیہ کی حکمت تھی اور اکابر علماء وفقہاء پر اعتراض وطعنہ زنی سے بچنے کا طریقہ تھا، وگرنہ آج کل تو بہت سے علماء اپنی ذات اور شخصیت کو منوانے کیلئے مسلمہ اکابر وفقہاء سے اختلاف کرتے ہیں تاکہ ان کی علمی ثقاہت اور تبحر کا سکہ دنیا ماننے لگے، اباجی قبلہ رحمۃ اللہ علیہ فرما سکتے تھے کہ پرانے فقہاء چونکہ علم الدایان سے واقف نہیں تھے اس لیے انہوں نے یہ حکم دیا اب میں نئی تحقیق کی روشنی میں فتویٰ دوں گا۔

اباجی قبلہ رحمۃ اللہ علیہ سے میں نے اور بہت سے دوسرے دوستوں نے یہ واقعہ سنا ہوگا، فرماتے ہیں کہ میں جب امروہہ سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد لاہور آیا اور جامع نعمانیہ میں تدریس کا سلسلہ شروع کیا تو ابھی کم سنی اور نوعمری کا زمانہ تھا، بیس برس کا بھی نہ ہو پایا تھا، اسی دوران لاہور کی ایک مسجد میں کسی محفل میں دعوتِ خطاب دی گئی، اتفاق سے ڈاکٹر علامہ محمد اقبال رحمۃ اللہ علیہ شاعرِ مشرق صدرِ تقریب تھے، میں نے تقریر شروع کی تو اسمِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم '' پر کلام کیا اور بزرگوں سے جو فیض ملا تھا اس کے صدقے میں علمی نکات اور اندازِ استدلال ایسے تھے کہ ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ بہت محظوظ ہوئے، میں نے دیکھا کہ دورانِ خطاب وہ مسلسل میری طرف متوجہ رہے اور سر ہلا کر داد دیتے رہے، چونکہ وہ خود بھی عاشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم تھے اس لیے کہیں کہیں تو ان پر وجد کی سی کیفیت طاری ہونے لگتی تھی، ابھی میں نے تقریر ختم نہ کی تھی کہ ایک رقعہ آیا، جس میں تحریر تھا کہ ڈاکٹر محمد اقبال رحمۃ اللہ علیہ مغربی تہذیب سے متاثر ہیں...... سکول و کالج اور یورپ میں تعلیم حاصل کرنے کے باعث مشرقی روایات میں سے بعض کے زیادہ پاسدار نہیں رہے، اس لیے وہ عورت کے چہرے کے پردے کے قائل نہیں ہیں، آپ اس بارے میں کیا ارشاد فرماتے ہیں؟

میں نے یہ رقعہ پڑھا تو مصلحتاً ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ذکر حذف کرتے ہوئے مجمع کو بتایا کہ مجھ سے سوال کیا ہے کہ عورت کے لیے پردہ کس حد تک ضروری ہے، خصوصاً عورت کے چہرے کے بارے میں استفسار ہے، تو اس ضمن میں گزارش ہے کہ فقہ کا

مسئلہ ہے ''سترِ عورت فرض ہے'' فقہی اصطلاح میں ''عورت'' جسم کے اس حصے کو کہتے ہیں جس کو چھپانا اور جس کا پردہ کرنا واجب ہے، مرد کے جسم میں ناف سے گھٹنوں تک جسم ''عورت'' کہلاتا ہے اور اس کیلئے کہا گیا ہے کہ ''سترِ عورت فرض ہے'' یعنی ناف سے گھٹنوں تک مرد کیلئے بھی جسم چھپانا اور جسم کے اس حصے کا پردہ کرنا لازم ،اب اگر کوئی شخص اپنی عورت یعنی اپنی بیوی کیلئے پردہ ضروری نہ سمجھتا ہو تو اس کو چاہیے کہ پہلے اپنے جسم کی عورت (یعنی اس کے جسم کا وہ حصہ جو عورت کہلاتا ہے اور جس کو چھپانا فرض ہے) کو بے پردہ کرے پھر اپنی عورت یعنی اپنی بیوی کے بارے میں کوئی حکم لگائے، میرے اس جواب پر ڈاکٹر علامہ محمد اقبال رحمۃ اللہ علیہ بہت کھل کر مسکرائے اور تقریر کے اختتام پر کھڑے ہو کر مجھے گلے لگایا اور داد دیتے ہوئے کہا '' برخوردار لگتا ہے کہ علم کے زور پر بہت نام کماؤ گے۔''

ابھی ہندوستان کی آزادی یا پاکستان کی تحریک نے زور نہیں پکڑا تھا، امروہہ (یو پی) میں مسلم آبادی کی اکثریت تھی لیکن انگریز کی ہندو نوازی کے باعث ادبی برتری کے باوجود مسلمان کچھ دباؤ میں رہتے ہیں امروہہ کے ایک چوراہے پر مجمع لگا تھا ایک ہندو پنڈت اور مسلمان عالم کے درمیان مناظرہ ہو رہا تھا ہلکی پھلکی محاذ آرائی اور اس قسم کی چھیڑ چھاڑ معمول کی بات تھی، پنڈت نے مولوی صاحب سے سوال کیا، مولوی جی! آپ کے نبی جی نماز پڑھتے تھے؟ یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے، بالکل پڑھتے تھے ان کے حکم پر تو ہم نماز پڑھتے ہیں۔

تو آپ کے نبی جی نے آخری بار نماز کب پڑھی تھی، ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی نماز نہیں چھوڑی وصال سے قبل جس آخری نماز کا وقت آیا تھا، آپ نے وہ بھی ادا فرمائی تھی۔

سنا ہے کہ آپ لوگ نماز میں سورۃ فاتحہ پڑھتے ہیں کہ آپ کے نبی بھی پڑھتے تھے۔ ہمارے نبی پاک نے جس طرح نماز پڑھی تھی ہم بھی ویسے نماز پڑھتے ہیں ظاہر ہے کہ

وہ بھی سورۃ فاتحہ پڑھتے تھے تو کیا آخری نماز میں بھی آپ کے نبی جی نے سورۃ فاتحہ پڑھی تھی۔

بالکل پڑھی تھی سورۃ فاتحہ کے بغیر نماز ہی نہیں ہوتی، سورۃ فاتحہ پڑھنا واجب ہے، اب پنڈت مجمع کی طرف متوجہ ہوئے جس میں ہندو اور مسلمان دونوں ہیں آپ سب لوگ گواہ ہیں کہ مولوی صاحب نے یہ بتا دیا ہے کہ ان کے نبی نماز پڑھتے تھے، اس میں سورۃ فاتحہ بھی پڑھتے تھے اور آخری دم تک وہ نماز پڑھتے رہے۔

پھر وہ مسلمان عالم سے مخاطب ہوئے، مولوی جی تھوڑا بہت قرآن میں نے بھی پڑھا، سورۃ فاتحہ تو مجھے زبانی یاد ہے، اس میں لکھا ہے'' **اھدنا الصراط المستقیم**'' آپ عربی بھاشا جانتے ہیں مجھے ان الفاظ کا مطلب بتا دیجیے! مولوی صاحب نے ترجمہ بتایا ''اے اللہ ہمیں سیدھے راستے پر چلا'' پنڈت کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ ابھری، بولے۔

مولوی صاحب آپ کے نبی آخری دم تک اپنے اللہ سے بنتی کرتے رہے کہ مجھے سیدھے راستے پر چلا، اگر ان کو سیدھا راستہ مل گیا تھا تو سوال کیوں کرتے تھے، جو چیز مل چکی ہو وہ بار بار مانگنا تو بے تکی بات ہے اور اگر ان کو سیدھا راستہ نہیں ملا تھا تو آپ کو سیدھا رستہ کیسے مل سکتا ہے؟ کتنی صدیاں گزر گئیں آپ ابھی تک روز یہی سوال کرتے ہیں۔

مجمع میں اضطراب کی لہر اٹھی ہندو مسکرائے، کچھ منچلوں نے آوازے بھی کسے جبکہ مسلمان پریشان اور بے چین ہوئے امید بھری نگاہوں سے اپنے عالم کی طرف دیکھنے لگے لیکن انکی حالت قابلِ رحم نظر آنے لگی پیشانی پسینے میں تر، جملے ہونٹوں میں ٹوٹنے لگے، آواز مدھم ہوگئی، ادھر پنڈت جی اپنا داؤ کارگر ہوتا دیکھ کر لطف لینے لگے، مولوی صاحب کو چھیڑنے لگے۔

مولوی جی! بتاؤ نا آپ کے نبی جی کو سیدھا رستہ ملا کہ نہیں؟ آپ بھی ہر نماز میں

مانگتے ہیں آپ کو کب ملے سیدھا رستہ؟

مسلمانوں کو جیسے سانپ سونگھ گیا ہندو فاتحانہ انداز سے مسلمانوں کو چڑانے لگے، صورتحال کشیدہ ہونے لگی، اتنے میں تقریباً 14 برس کا ایک نوجوان مجمع چیرتا ہوا آگے بڑھا اور پنڈت سے پوچھنے لگا۔

پنڈت جی! اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو میں کچھ جواب دوں؟

پنڈت جی ہنس پڑے اپنی مضبوط دلیل اور ناقابلِ شکست داؤ پر ان کو بھرپور اعتماد تھا اس لیے فراغ دلی سے بولے، ضرور ضرور، بلکہ چاہو تو کسی بڑے کو اپنے کسی بزرگ کو بھی بلالاؤ۔

نوجوان نے آگے بڑھ کر مولوی صاحب سے بات کرنے کی اجازت طلب کی، وہ حواس باختہ تھے، جواب دینے کا بھی یارا نہ تھا یہ کیفیت بھانپ کر نوجوان نے خود ہی بات شروع کر دی۔

پنڈت جی آپ پوچھ رہے ہیں کہ ہمارے نبی کریم ﷺ کو سیدھا رستہ ملا کہ نہیں؟ جواب سے پہلے یہ فیصلہ کرنا ضروری ہے کہ سیدھے رستے سے کون سا رستہ مراد ہے؟ پنڈت جی نے لاپرواہی سے کہا یہ بھی تم خود ہی بتاؤ یہ قرآن تمہاری کتاب ہے۔

اگر مجھ سے پوچھتے ہو تو میں کہتا ہوں کہ سیدھا رستہ وہ ہے جو بندے کو اللہ کی طرف لے جاتا ہے رب سے ملاتا ہے، پنڈت جی نے اثبات سے سر ہلایا ''ہاں'' یہ تو ٹھیک جو رستہ منش کو بھگوان سے ملائے وہی سیدھا رستہ ہوگا، اب نوجوان نے ذرا بلند آواز سے خطیبانہ انداز سے بات شروع کی، پنڈت جی اب میرا جواب ذرا غور سے سن لیجیے اگر آپ کی سمجھ میں نہ آئے تو یہ قصور ہوگا آپ کی عقل اور آپ کے عقیدے کا، سیدھا رستہ وہ ہے جو بندے کو اللہ کی طرف لے جاتا ہے، آپ کا بھگوان تو ایک مورت اس کی مخصوص جسامت اور حجم ہے ایک نظر دیکھ کر پتا چل جاتا ہے کہ یہ کہاں سے شروع اور کہاں پر ختم ہو رہا ہے، اس لیے جو رستہ آپ کے بھگوان کی طرف آ رہا ہے وہ تو اس

مورتی کے پاس آ کر ختم ہو جائے گا لیکن ہمارا اللہ ایسا نہیں جس کی حد بندی ہو سکے وہ لا محدود ہے اس لیے اس کی طرف جانے والا راستہ بھی لامحدود ہے اس پر چلتے رہیں وہ کبھی ختم نہ ہوگا رب کے قرب کی ایک منزل پائیں گے تو اگلی آگے نظر آئے گی وہاں پہنچ گئے تو پھر اگلا مرحلہ سامنے دکھائی دے گا، ہم اپنے رب سے سیدھے راستے کی دعا کرتے رہیں گے وہ ہمیں اپنے قرب کے درجات طے کراتا رہے گا، یہ سلسلہ جاری رہے گا اس لیے قرآن میں اللہ نے اپنے محبوب سے فرمایا "**وللاخرة خير لك من الاولىٰ**" اے محبوب آپ مسلسل سیدھے راستے پر چل رہے ہیں آپ قرب کے درجات طے کر رہے ہیں اس لیے آپ کیلئے ہر آنے والا لمحہ گزشتہ لمحے سے بہتر ہے، تو سیدھے راستے پر ہمارے نبی مسلسل منزلیں طے کر رہے ہیں اور ان کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے ہم بھی سیدھے راستے پر گامزن ہیں۔

جیسے جیسے یہ نوجوان بول رہا تھا ویسے ویسے مولوی صاحب کے چہرے کی رونق بحال ہو رہی تھی، جیسے ہی بات مکمل ہوئی پنڈت جی ششدر رہ گئے مولوی صاحب نوجوان سے لپٹ گئے مجمع میں ہندو ساکت و خاموش کھڑے تھے اور مسلمان فرطِ جذبات سے بے حال ہو رہے تھے نعرے لگاتے ہوئے انھوں نے اس نوجوان کو کاندھوں پر اٹھا لیا ناواقف ایک دوسرے سے پوچھنے لگے یہ نوجوان کون ہے؟ چند لوگوں نے بتایا کہ یہ حضرت محدثِ امروہی (علیہ الرحمہ) کا چھوٹا بھائی احمد سعید کاظمی رحمۃ اللہ علیہ ہے۔

سوئی گیس کے شعبے میں حضور غزالی زماں رحمۃ اللہ علیہ کے نہایت پیارے بلکہ چہیتے مرید عبدالرشید ارشد حال ہی میں ترقی پا کر چیف انجینئر (ڈیزائن اینڈ کنٹیکٹس) پراجیکٹس بنے ہیں، اس سے پیشتر ڈپٹی چیف انجینئر پراجیکٹس کے طور پر خدمات انجام دیتے رہے، گیس کے فیلڈز کو ٹرانسمیشن نیٹ ورک کے ساتھ جوڑنے اور گیس سے محروم علاقوں کو گیس فراہم کرنے کے منصوبے ان کی نگرانی میں زیرِ تکمیل ہیں، اور

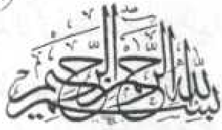
اللہ کے فضل و کرم سے اور مرشدِ کریم کی نگاہِ کرم کے تصدق سے اپنے شعبے میں انھوں نے اتنی نیک نامی اور عزت کمائی کہ کسی سیاسی بیساکھی کے بغیر، کسی اثر و رسوخ یا سفارش کے بغیر محض اپنی استعداد اور قابلیت کی بنیاد پر اس عہدے پر پہنچے، ابھی نوجوان ہیں انشاء اللہ ان کیلئے آئندہ بھی ترقی کے زینے کھلے رہیں گے، بہت پکے اور سچے عاشقِ رسول ﷺ ہیں اور اپنے عقیدے اور نظریے کو چھپانے اور مصلحت کوشی کے قائل نہیں، ایسے نوجوان یقیناً ہمارا سرمایہ اور مستقبل میں امید کی کرن ہیں، اباجی قبلہ رحمۃ اللہ علیہ سے عقیدتِ خاص اور ربط و ضبط ایسا کہ سبھی کیلئے قابلِ رشک، ایک بار مرشدِ کریم سے ملاقات کیلئے آستانے پر حاضر ہوئے، دوپہر کا وقت تھا ظہر کی اذان ہونے والی تھی، جب یہ آئے تو انہیں بتایا گیا کہ غزالی زماں رحمۃ اللہ علیہ کی طبیعت کچھ ناساز ہے اور آپ محوِ استراحت ہیں، یہ سن کی عبدالرشید ارشد واپس چلے گئے۔ آئندہ ملاقات پر اباجی قبلہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ آپ اس روز واپس کیوں چلے گئے؟ انھوں نے عرض کی حضرت مجھے بتایا گیا تھا کہ آپ آرام میں ہیں اور طبیعت بھی کچھ ٹھیک نہیں ہے تو اباجی قبلہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ بھائی آپ نے یہ کیوں نہیں سوچا کہ میں مسلمان ہوں، ظہر کی نماز جس کا اتنا بہت سا وقت ہوتا ہے قضا کیسے کر سکتا ہوں؟ نماز کیلئے تو لازماً اٹھنا ہی تھا، آپ سے ملاقات بھی ہو جاتی۔

جب سندھ سانگھی میں سوئی گیس کی نئی پائپ لائن بچھانے کے سلسلے میں سائٹ کیمپ قائم ہوا تو قواعد و ضوابط اور روایت کے مطابق جنگل میں منگل کی کیفیت ہوگئی، یہاں حسبِ روایت مسجد بھی بنانا تھی جس میں باقاعدہ نماز کی ادائیگی کا اہتمام ہوتا ہو، عبدالرشید ارشد بیان کرتے ہیں کہ "سڑک کے کنارے ایک چھوٹی سی مسجد موجود تھی جس کو عرف میں "مصلیٰ" کہا جاتا ہے کہ بس دو چار افراد نماز ادا کر سکیں، نہ جانے میں نے یہ سوچا کہ یہ جگہ بہت اچھی اور مبارک لگتی ہے نہ جانے اللہ کے کسی نیک بندے نے اس جگہ رب کی بارگاہ میں سجدے کیے ہوں، ہمیں اس کا احترام ملحوظ رکھنا

چاہیے اور مسجد تو ہمیں بنانا ہی ہے تو کیوں نہ اس مصلیٰ کی جگہ کو کشادہ کر کے مسجد کی باقاعدہ شکل دے دی جائے، ۔اس بارے میں مالک زمین ناصر شاہ (ناظم سکھر) سے بھی بات کر لی گئی، ہم نے وہ مسجد بنائی، وہاں نمازیں ادا کرتے رہے، جب ہمارا اس ''سائٹ'' پر کام مکمل ہوگیا اور ہم روانہ ہونے لگے تو گھوٹکی میں مقیم مولانا عبدالکریم سعیدی مجھ سے ملنے آئے اور انھوں نے کہا کہ مجھے تو اب معلوم ہوا کہ اس کیمپ کے انچارج ہمارے سعیدی بھائی ہیں اور ایسے سعیدی جنھیں اپنی نسبت کا بھی پاس رہتا ہے۔اب آپ جا رہے ہیں لیکن میں اپ کو یہ بتانے آیا ہوں کہ آپ نے جس مصلیٰ کو باقاعدہ مسجد کی شکل دے دی ہے۔ایک بار اپنے اور آپ کے مرشد حضور غزالی زماں رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ دورانِ سفر ہم یہاں رکے تھے اور حضرت کی اقتداء میں ہم نے یہاں نماز ادا کی تھی۔

ان سے یہ بات سن کر مجھے خیال آیا کہ میں نے مسجد بناتے ہوئے یہی سوچا تھا کہ نہ جانے اللہ کے کس محبوب بندے کے سجدے کے صدقے میں یہ جگہ مسجد بن رہی ہے تو اب پتہ چلا کہ یہ میرے اپنے مرشدِ کریم کا فیض تھا۔''





باب نمبر 28

حضور غزالیٔ زماں رحمۃ اللہ علیہ بحیثیت مناظرِ اسلام

علامہ مفتی

عبدالمجید سعیدی، رحیم یار خان

ماہنامہ السعید امام اہل سنت نمبر جنوری ۲۰۰۵ صفحہ ۷۹ تا ۱۰۰

اس مضمون میں ''غزالیِ زماں بحیثیتِ مناظرِ اسلام'' کے موضوع پر سیر حاصل بحث کر کے یہ واضح کیا گیا ہے کہ امام اہلسنّت ضیغمِ اسلام محدثِ اعظم حضرت سیدنا و مرشدنا علامہ مولانا سید احمد سعید کاظمی رحمۃ اللہ علیہ بلا مبالغہ میدانِ مناظرہ کے بھی ایک عظیم القدر شہسوار تھے، اور شواہد سے ثابت کیا گیا ہے کہ مخالفین بھی حضرت کے اس وصف و کمال کے معترف تھے اور حضرت کی جلالتِ علمی کے آگے آپ کا مدِ مقابل ہتھیار ڈال دیتا اور آپ سے مرعوب ہو جاتا تھا، جس کی ایک واضح مثال یہ بھی ہے کہ تحریکِ ختمِ نبوت کے موقع پر مرزائیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دلانے کیلئے جب اہلسنت اور بعض دیوبندیوں نے آپس میں سیاسی اتحاد کر کے مل کر کلام کیا تو اس دوران قاسم باغ قلعہ کہنہ ملتان میں ایک جلسہ عام منعقد کیا گیا جس میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو بھی تقریر کی دعوت دی گئی، آپ وہاں تشریف لے گئلے اور اپنے مسلک کو نہایت اچھوتے انداز میں کھل کر بیان فرمایا، امیرِ شریعت احرار جناب عطاء اللہ شاہ بخاری اس جلسے میں صدرِ محفل تھے انھوں نے جب اپنی صدارتی تقریر کا آغاز کیا تو کسی نے ایک پرچی کے ذریعہ ان سے یہ سوال کیا کہ ''امام اہلسنت مولانا احمد رضا خان قادری بریلوی رحمۃ اللہ علیہ نے علماء دیوبند کی تکفیر کی ہے اور آپ لوگ اہلسنت کو مشرک کہتے ہیں تو آپ کا ایک دوسرے کے ساتھ اتحاد کیونکر جائز ہے، اب آپ ایک تو مولانا احمد رضا خان رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں اپنا موقف بیان کریں، نیز یہ بھی بتائیں کہ علامہ سید احمد سعید کاظمی رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے، آپ انہیں کیا سمجھتے ہیں؟؟؟

بخاری صاحب جانتے تھے کہ اگر انھوں نے حضرت کی موجودگی میں امام اہلسنت حضرت مولانا احمد رضا خان رحمۃ اللہ علیہ کے خلاف لب کشائی کی تو ان کی خیر نہیں ہو گی اور حضرت رحمۃ اللہ علیہ عوام پر علماء دیوبند کی کفریہ اور گستاخانہ عبارات کھول کھول کر بیان کر دیں گے، اس لیے انہیں اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خان رحمۃ اللہ علیہ کے خلاف کوئی ہمت نہ ہوسکی اور انھوں نے حضرت سے مرعوب ہو کر آپ کی تائید شروع کر دی اور کہا کہ

بھائی! بات یہ ہے کہ مولانا احمد رضا خان قادری رحمۃ اللہ علیہ کا دماغ عشقِ رسول ﷺ سے معطر تھا اور وہ اس قدر غیور آدمی تھے کہ ذرہ برابر بھی توہینِ الوہیت و رسالت ﷺ کو برداشت نہیں کر سکتے تھے، پس جب انھوں نے ہمارے علماء دیوبند کی کتابیں دیکھیں تو ان کی نگاہ علمائے دیوبند کی بعض ایسی عبارات پر پڑی کہ جن میں سے انہیں توہینِ رسول ﷺ کی بُو آئی، اب انھوں نے محض عشقِ رسول ﷺ کی بناء پر ہمارے ان علماء دیوبند کو کافر کہہ دیا اور وہ یقیناً اس میں حق بجانب ہیں، اللہ کی ان پر رحمتیں ہوں آپ بھی سب مل کر کہیں مولانا امام احمد رضا خان قادری رحمۃ اللہ علیہ، بخاری صاحب نے سامعین سے کئی مرتبہ اعلیٰ حضرت کیلئے (رحمۃ اللہ علیہ) کے دعائیہ کلمات کہلائے پھر دوسرے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا'' رہا علامہ کاظمی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں سوال، تو میں کہتا ہوں کہ علامہ کاظمی صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) تو میرے پیر (مرشد) ہیں۔''

یہ واقعہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے راقم الحروف نے خود سنا جس سے یہ بات اظہر من الشمس ہو جاتی ہے کہ مخالفین بھی حضرت کے علمی وقار کے قائل اور معترف تھے، اور بخاری صاحب نے اپنے مذکورہ بالا کلمات حضرت سے مرعوب ہو کر کہے، ورنہ کیا ان کے پیروکار یعنی احراری حضرات بخاری صاحب کے اس بیان سے متفق ہیں؟ اور اگر وہ یہ کہیں کہ بخاری صاحب حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے مرعوب نہیں ہوتے تھے بلکہ انھوں نے ایک حقیقت کو آشکار کیا تھا تو اصولی طور پر انہیں بھی اس حقیقت کا اقرار کر کے ان گستاخ دیوبندی علماء کی تکفیر کر کے حق بولنا چاہیے۔

اس مضمون کی تیاری کے وقت بعض حضرات سے بالمشافہ رابطہ کے علاوہ درج ذیل رسائل کو بھی پیشِ نظر رکھا گیا۔

۱) ماہنامہ الاشرف علامہ کاظمی رحمۃ اللہ علیہ۔

۲) دیباچہ مقالاتِ کاظمی رحمۃ اللہ علیہ ج اول۔

۳) رُوئیدادِ مناظرہ رحیم یار خان۔

۴) مکالمہ کاظمی علیہ الرحمہ و مودودی۔

۵) دیدہ ور۔

۶) ''آفتاب'' علامہ کاظمی علیہ الرحمہ نمبر اور جو مندرجات بندہ کے مسموعات یا مشاہدات سے متعلق ہیں ان کی وہاں متعلقہ مقام پر تصریح کر دی گئی ہے۔

اس مضمون میں مناظر کی خصوصیات کے بیان اور حضرت کیلئے ان خصوصیات کے اثبات کے ساتھ ساتھ چند ضروری اصطلاحاتِ مناظرہ بھی ذکر کر دی گئی ہیں، اس مضمون میں حضرت کے پندرہ معرکۃ آلاراء مناظروں کا تذکرہ ہے جن میں سے آپ کے سات مناظرے، دیوبندی وہابیوں، دو مناظرے نجدی وہابیوں، ایک مناظرہ غیر مقلد وہابیوں، ایک مناظرہ مودودی وہابیوں، ایک مناظرہ شیعوں کے ساتھ، ایک مناظرہ عیسائی کے ساتھ اور دو مناظرے ہندوؤں کے ساتھ ہیں، ان سب میں فتح و ظفر نے حضرت علیہ الرحمہ کے قدم چومے، تفصیل آپ آئندہ سطور میں پڑھیں گے۔

نوٹ: اس مضمون کی تیاری کے دوران ایک شب بندہ نے عین سحری کے وقت عالمِ رؤیا میں حضرت علیہ الرحمہ کی زیارت کی کہ آپ اپنے دولت کدے کے باہر ایک چار پائی پر لیٹے ہوئے ہیں، میں نے دست بوسی کے بعد عرض کی حضور میں آپ کے متعلق ایک مضمون لکھ رہا ہوں، حضرت بہت خوش ہوئے، میں نے عرض کیا کچھ لکھ رکھا ہے اسے سماعت فرمایئے، میں نے تو اس کی تیاری میں کچھ رسائل پیشِ نظر رکھے ہیں، آپ نے فرمایا تم نے اچھا کیا، فی الحال تو وقت نہیں ہے کسی اور وقت آپ سے وہ سنوں گا، اتنے میں میری آنکھ کھل گئی، بہت خوشی بھی ہوئی کہ حضرت کی روحانیت بندہ کے شاملِ حال ہے اور حضرت کے فراق پر دل نے خون کے آنسو بھی بہائے، واللہ العظیم وہ وقت مجھے کبھی نہیں بھولے گا کہ حضرت نے مجھے اپنی وفات والے سال رمضان المبارک میں ساری رات جگاتے اور اپنی خدمت میں رکھتے، ۲۵ کی شام کو آپ کی وفات ہوئی اور غالباً ۲۴ کی صبح کو تبسم کرتے ہوئے شفقت بھرے لہجے میں مجھ

سے فرمایا جاگ جاگ کر تم تنگ آ گئے ہو گے اور جلالپور جا کر اپنے استاذ مفتی صاحب سے ہماری شکایت لگاؤ گے کہ مجھے آرام نہیں کرنے دیتے تھے، میں نے کہا نہیں حضور بلکہ آپ کی شفقتیں یاد رہیں گی۔

غزالیِ زماں بحیثیتِ مناظرِ اسلام:

یہ ایک نا قابلِ تردید حقیقت ہے کہ صحیح معنیٰ میں ''فنِ مناظرہ'' میں ماہر شخص بیک وقت علومِ عقلیہ ونقلیہ کا جامع، ایک عظیم مدرس، بہت بڑا مقرر اور نہایت ہی ذی وقار مدبر بھی ہوتا ہے اور یہ بھی ایک مسلم امر ہے کہ ہمارے حضرت امام اہلسنت غزالیِ زماں سیدنا علامہ احمد سعید کاظمی علیہ الرحمہ بھی علمِ مناظرہ میں نابغۂ روزگار ہستی تھے، جس کا یقینی نتیجہ یہ نکلا کہ آپ علیہ الرحمہ جمیع معقول ومنقول کے جامع ذیشان مقرر اور عظیم مدرس بھی تھے اور یہ بات خود ساختہ صغریٰ وکبریٰ سے ماخوذ نتیجہ اور محض آپ سے عقیدت کی بناء پر نہیں بلکہ ایک حقیقتِ ثابتہ کی بنیاد پر ہے جسے اپنے بیگانے سب تسلیم کرتے ہیں ''**والفضل ماشهدت به الاعداء**'' اور ہر شخص مانتا ہے کہ بلا شبہ آپ علیہ الرحمہ بیک وقت بہت بڑے مفسر، عظیم الشان محدث، جلیل القدر فقیہ، بلند پایہ مفتی، فقید المثال عربی دان، زبر دست منطقی وفلسفی، علمِ معانی، بیان بدیع کے درخشاں سورج، فصاحت وبلاغت کے شمسِ تاباں، آسمانِ رشد وہدایت کے قمرِ منیر اور فلک فضل ومعرفت کے نیرِ اعظم تھے، مگر اس قدر خصوصیات کے حامل ہونے کے باوجود آپ کی ذاتِ گرامی تکبر سے مبرا اور دور تھی اور آپ مجسمۂ تواضع تھے، پس اگر یہ کہا جائے تو کچھ مبالغہ نہیں ہوگا کہ بہت سے لوگوں کو اپنے علم پر ناز ہوتا ہے اور حضرت علیہ الرحمہ ان نفوسِ قدسیہ میں سے ہیں کہ آپ کی ذات پر خود علم کو فخر اور ناز تھا۔

سرِ دست میں نے بعض سعیدی برادران کی فرمائش پر ''غزالیِ زماں بحیثیتِ مناظرِ اسلام'' کے عنوان سے حسبِ استطاعت حضرت علیہ الرحمہ کی صرف مناظرانہ خصوصیات اور آپ کے موصول شدہ معرکۃ الآراء چند مناظروں کے بارے میں قلم کو

جنبش دینا اور یہ بتانا ہے کہ آپ رحمۃ اللہ علیہ میدانِ مناظرہ کے عظیم شہسوار تھے، بیدار مغزی، قوتِ گویائی، حاضر جوابی اور معاملہ فہمی کی صلاحیتیں آپ کے اندر علی الوجہ الاتم پائی جاتی تھیں، آپ کی گرجدار آواز سے مخالفینِ اسلام کے جگر پھٹ جاتے تھے، آپ نے بڑے بڑے جغادریوں کو چت کیا، آپ کی للکار سے ایوانِ نجد، دارِ رفض اور سرائے قادیانیت میں تہلکہ برپا ہوجاتا تھا، آپ کے سامنے کی تاب کس ماں کے لال میں تھی، اسلام کے خلاف اٹھنے والی تمام طاغوتی طاقتیں ااپ کے نام سے بھی لرزتی اور کانپتی تھیں، لیکن اس سے قبل کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے موصول شدہ مناظروں کی روئیداد لکھوں اور شواہد اور واقعات کی روشنی میں حضرت کی اس شان پر حسبِ بساط کچھ تحریر کروں ''مناظرہ'' اور اس کے بعض متعلقات ''مناظرہ'' اور اس کی خصوصیات کی توضیح بھی خالی از فائدہ نہیں ہوگی۔

لفظِ مناظرہ کی بحث:

اصطلاحِ علماء میں اظہارِ حق و سواب کی نیت سے دو مدمقابلوں کا دو چیزوں کے مابین نسبت کے بارے میں متوجہ ہونا ''مناظرہ'' کہلاتا ہے، یہ لفظ، کس لفظ سے ماخوذ ہے؟ اس کے متعلق علماء میں دو مختلف قول سامنے آئے ہیں، چنانچہ بعض علماء نے کہا کہ لفظِ مناظرہ لفظِ نظیر کا ہم ماخذ ہے اور بعض دوسرے علماء کے نزدیک اس کا ماخذ لفظِ نظر ہے۔

اگر اسے لفظِ نظیر کا ہم ماخذ مانا جائے تو چونکہ نظیر بمعنیٰ مثیل ہے اس لیے اس میں یہ راز پنہاں ہوگا کہ دونوں مناظروں کو علم وغیرہ میں ایک دوسرے کے متماثل ہونا چاہیے اور ایسا ہرگز نہ ہو کہ ایک مناظر تو علو کمال کے اعلیٰ پائے کا حامل ہو اور دوسرا نائب و ناقص کے نچلے درجے میں، اور اگر اسے لفظِ نظر سے ماخوذ کیا جائے تو اس تعزیر پر علماء نے اس کے درج ذیل معانی ارقام فرمائے ہیں۔

۱) آمنے سامنے ہونا۔
۲) انتظار کرنا۔
۳) دیکھنا۔
۴) ذہن کو معقولات اور ان میں تامل کی طرف متوجہ کرنا۔

پس ان لغوی معانی میں آدابِ مناظرہ کی جانب یہ لطیف ارشادات پائے جاتے ہیں کہ دونوں مناظروں کو قطع کلامی کی بجائے اس کی گفتگو کے اختتام کی انتظار کرنی چاہیے، اسی طرح دونوں مناظر گفتگو کے دوران ادھر ادھر دیکھنے کی بجائے ایک دوسرے کی طرف دیکھیں اور مناظر کو چاہیے کہ بات نہایت ہی غور و فکر اور تامل کے بعد کرے۔

مناظرہ، مجادلہ اور مکابرہ میں فرق:

بحث کا مقصد اگر اظہارِ حق ہو تو اسے ''مناظرہ''، خصم کو ساکت کرنا مقصود ہو اور اظہارِ حق مقصود نہ ہو تو اسے ''مجادلہ'' اور اگر اس سے اظہارِ حق یا الزام خصم کچھ بھی مقصود نہ ہو بلکہ اپنے جہل پر پردہ ڈالنا یا علمیت کا اظہار مقصود ہو تو اس فن کو علماء کی اصطلاح میں ''مکابرہ'' کہا جاتا ہے۔

خصم، دلیل، مدعی، سائل، دعویٰ:

از روئے اصطلاح، مناظرہ میں ہر ایک مدمقابل کو ''خصم'' کہتے ہیں اور جو دلیل یا تنبیہ سے کسی امر کے اثبات کی ذمہ داری اٹھائے تو اسے ''مدعی'' اور اس امر کی نفی کیلئے خود کو پیش کرنے والے کو ''سائل'' کہا جاتا ہے، اور جس بات کے اثبات کی مدعی، ذمہ داری قبول کرے، اسے ''دعویٰ'' اور اس کے ثبوت میں دو قضیوں سے مرکب جو کلام پیش کیا جائے اسے دلیل کہا جاتا ہے۔

مستدل کی دلیل کے خلاف دلیل قائم کرنے کو ''معارضہ'' مستدل کی دلیل کو نا

قابلِ استدلال ثابت کرنے کو ''نقض''، خصم کی دلیل کے کسی مقدمہ معینہ یا اس کے جمیع مقدمات پر اس سے دلیل طلب کرنے کو ''منع'' اور مدعی کا اپنی دلیل کے کسی جزء یا اس جزء کے لازم کو اپنا دعویٰ قرار دینے کو ''مصادرہ علی المطلوب'' کہتے ہیں۔

خصوصیاتِ مناظرہ:

یہ تو اولاً معلوم ہو چکا کہ صحیح معنوں میں مناظر شخص ایک زبردست ماہر علوم وفنون بھی ہوتا ہے، الا اینکہ کسی کو محض کسی ایک ہی موضوع پر مناظرہ کی مہارت حاصل ہو اور اس کا عکس لازم نہیں یعنی یہ ضروری نہیں کہ علوم وفنون کا جاننے والا ہر شخص مناظر بھی ہو، لہٰذا اس کے لیے ایک معیار اور کسوٹی کی حاجت ہے جس کے ذریعہ کسی شخص کے مناظر یا غیر مناظر ہونے کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے، اس لیے ذیل میں ہم مناظر کی خصوصیات کی نشاندہی کرتے ہیں، جن کے پیشِ نظر کسی شخص کے متلق اس کے مناظر ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ کرنے میں کسی قسم کی پیچیدگی اور دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ انشاء اللہ۔

مناظر کو کن کن خصویات کا حامل ہونا ضروری ہے؟ حسنِ اتفاق کہ اس امر کی وضاحت اپنی وفاتِ حسرتِ آیات سے چند روز قبل خود حضرت ممدوح رحمۃ اللہ علیہ رب الروح نے فرمادی تھی، جسے راقم نے قلم بند کرلیا تھا جبکہ آپ اپنے دولت کدہ کے کتب خانہ میں راقم الحروف اور اپنے صاحبزادہ حضرت مولانا سید ارشد سعید کاظمی صاحب مدظلہ کو تربیت دے رہے تھے، حضرت کے اس مبارک بیان کو میں ذیل میں اپنے قارئین کیلئے من وعن نقل کرنے کی سعادت حاصل کرتا ہوں، چنانچہ آپ نے ارشاد فرمایا'' مناظرہ میں چار خصوصیات کا پایا جانا ضروری ہے۔

۱) قوتِ گویائی یعنی مناظر کا اپنے مافی الضمیر کی کماحقہٗ ادائیگی پر قادر ہو۔

۲) حاضر جوابی یعنی مناظر کا ایسے ملکہ والا ہونا کہ سوال یا اعتراض ہوتے ہی وہ فوراً

اپنے مدِ مقابل کو تابڑتوڑ اور مسکت جواب دے سکے۔

۳) خوش بیانی، یعنی مناظر کا مقتضائے حال کے مطابق پر کشش پر تاثیر گفتگو والا اور شیریں کلام کرنے والا ہو۔

۴) دبنگ آوازی یعنی مناظر کا گرجدار آواز والا ہونا۔

نوٹ: بیان خصوصیات میں ''یعنی'' کے لفظ کے بعد میں تشریحی الفاظ راقم کے اپنے ہیں، حضرت نے صرف مسطورہ بالا عنوانات پر اکتفاء فرمایا تھا۔

نوٹ: بندہ کے نزدیک مذکورہ بالا مناظر کی چوتھی خصوصیت یعنی دبنگ آوازی اس کیلئے اگرچہ بے حد مفید اور بہت نفع مند چیز ہے لیکن مناظر ہونے کیلئے (خصوصاً آج کے لاؤڈ سپیکر دور میں) شرط نہیں (البتہ مذکورہ الصدر پہلی تین خصوصیات اس میں پایا جانا لازمی امر ہے) کیونکہ ''علم'' سامعین کو خود متاثر کرتا ہے اور بہت سے ایسے خفیف الصوت علماء دیکھے ہیں جو محض اپنے پہلی (مذکور الصدر) تین خصوصیات کی بناء پر اپنے مدمقابل پر غالب آجاتے ہیں اور انہیں چت کر دیتے ہیں۔

حضرت رحمۃ اللہ علیہ تمام مناظرانہ صفات سے بطریقِ اتم موصوف تھے:

اب ہم نے دلائل کی روشنی میں اس امر کی جانچ پرکھ کرنی ہے کہ ہمارے حضور غزالیٔ زماں رحمۃ اللہ علیہ مذکورۃ الصدر خصوصیات میں سے کون کون سی خصوصیتیں پائی جاتی تھیں لیکن یہ تحقیق محض ان لوگوں کیلئے ہے جنھیں حضرت سے ہم نشینی اور آپ کی خدمتِ بابرکت میں بیٹھنے کا موقع نہ ملا ہو، اور آپ کے حالاتِ زندگی اور آپ کی خدا داد بلند صلاحیتوں کے بارے میں گہرے اور بنظر غائز مطالعہ کی نوبت نہ پہنچی ہو مگر آپ کے مصاحبین اور آپ کے سوانح حیات سے واقفیت رکھنے والوں پر یہ امر کسی طرح مخفی نہیں کہ قدرت نے آپ کی تمام قوتیں بیدار فرما کر فنِ مناظر میں آپ کے اندر کسی قسم کی کوئی کمی نہیں چھوڑی تھی اور آپ کو مناظر کی تمام خصوصیات وصفات علی

الوجہ الاکمل موصوف ومخصوص فرمایا تھا۔

ذیل میں علیحدہ علیحدہ عنوانات کے تحت شواہد وواقعات کی روشنی میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے جمیع مناظرانہ اوصاف سے موصوف ہونے کا اثبات کیا جاتا ہے۔

حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی قوتِ گویائی:

بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ انسان ذی علم ہونے کے باوجود اپنے مافی الضمیر کی کما حقہٗ ادائیگی پر قادر نہیں ہوتا اور بات نہ سمجھا سکنے کی اس کمزوری کے باعث ایسے شخص کی گفتگو سے سامعین وسائلین کا مطمئن ہونے کی بجائے مخدوش وموسوس ہوجانا عین ممکن ہوتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے ہمارے ممدوح کو اس عیب سے بھی مبرا بنایا تھا، اور آپ کے اندر یہ خوبی کوٹ کوٹ کر بھر دی تھی کہ آپ سامعین وسائلین کے اذہان کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ایک طویل بات کو مختصر اور جامع پیرائے میں اور مشکل سے مشکل مسئلہ کو سہل ترین انداز میں پیش کرنے کی علی الوجہ الاتم قدرت رکھتے تھے، اس امر کی دلیل درج واقعات بھی ہیں۔

واقعہ نمبر (۱):

ایک ہندو قوم، آریہ سماج کے مشہور عیار مناظر رام چندر سے آپ کا مناظرہ طے پایا، موضوعِ مناظرہ ''عالمِ برزخ کا وجود یا عدمِ وجود'' تھا، رام چندر کا موقف یہ تھا کہ مسلمانوں کا یہ کہنا ہرگز صحیح نہیں کہ عالمِ برزخ موجود ہے جو عالمِ دنیا سے کئی حصے بڑا ہے، نیز وہ یہ بھی کہتا تھا کہ دنیا سے بڑھ کر کوئی بڑا جہان نہیں، حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے مناظرہ گاہ پہنچنے سے قبل بازار سے گولر کے پھل خرید لیے اور یہ ایسے پھل ہوتے ہیں کہ انہیں ٹکڑے کیا جائے تو ان سے مچھر نما پرندے نکل کر اڑ جاتے ہیں، حضرت کا اس وقت عنفوان شباب تھا اور رام چندر نہایت ہی معمر اور سن رسیدہ تھا، حاضرین پہلے پہل تو بہت متعجب ہوئے کہ یہ بظاہر نہ تجربہ کار نوجوان اس مجرب گھاگھ آدمی سے کیسے میدان

جیتے گا؟ لیکن حضرت نے جب اپنی خداداد قوتِ گویائی کا عظیم مظاہرہ فرمایا اور گولر کے پھلوں کے ذریعہ جو آپ نے کھانے کیلئے نہیں بلکہ بات سمجھانے کی غرض سے خریدے تھے رام چندر کے اعتراضات کے پرخچے اڑ گئے اور سامعین کو اپنے موقف کی صحت بطریق احسن سمجھائی کہ ہندو مناظر کی مٹی پلید کی تو سارا مجمع عش عش کر اٹھا اور رام چندر کو عبرتناک شکست کا سامنا کرنا پڑا۔

ہوا یوں کہ رام چندر نے جب عالمِ برزخ کے بارے میں مسلمانوں کے عقیدہ پر اپنا اعتراض واضح کر کے اس پر کیچڑ اچھالا اور اس کا مذاق اڑایا اور کہا کہ عالمِ برزخ کا کوئی وجود نہیں تو حضرت نے اپنی تقریر میں گولر کا پھل اپنے ہاتھ میں لیا اور رام چندر کو مخاطب ہو کر فرمایا'' جناب میرے ہاتھ میں کیا ہے؟ اس نے کہا گولر کا پھل، آپ نے فرمایا گولر یہ چھوٹا سا پھل میرے ہاتھ میں ہے اور میں کرسی پر ہوں اور کرسی کمرہ میں رکھی ہے اور کمرہ اس عمارت کا ایک حصہ ہے اور یہ عمارت اس شہر کا جزو ہے اور یہ شہر دنیا کا ایک حصہ ہے اب آپ ہی اندازہ لگائیں کہ گولر کا یہ پھل کتنا چھوٹا ہے کہ شہر کو دنیا، عمارت کو شہر، کمرے کو عمارت، اور کرسی کو کمرہ محیط ہے اور میں نے کرسی کو اور میرے ہاتھ نے گولر کے اس پھل کو احاطہ کر رکھا ہے، لیکن گولر کے پھل کے اتنے چھوٹے پن کے باوجود اس میں رہنے والی مخلوق محض اس بناء پر کہ اس نے عالمِ دنیا کو دیکھا ہی نہیں اسی چھوٹے سے پھل کو سب سے بڑا جہان سمجھتی ہے اور اس کے علاوہ کسی دوسرے جہان کے وجود کو نہیں مانتی مگر جب یہ مخلوق اس پھل سے نکل کر باہر آجاتی ہے تو پھر عالمِ دنیا کی عظمت اور اس کے وجود کا اسے پتہ چلتا ہے، پس یہ کہہ کر آپ نے گولر کے اس پھل کے دو حصے کیے جس سے مچھر نما پرندے نکل کر اڑ گئے، پھر رام چندر سے مخاطب ہو کر فرمایا اسی طرح چونکہ آپ نے عالمِ برزخ کو دیکھا نہیں اسی لیے آپ عالمِ دنیا ہی کو سب سے بڑا جہان تصور کرتے اور کسی اور عالم کے وجود سے انکاری ہیں لیکن جب آپ اس جہان سے کوچ کریں گے تو آپ کو تب خبر لگے گی کہ

واقعی دنیا کے علاوہ اور جہان بھی ہے جو اس سے کئی گناہ بڑا ہے حضرت کی اس دندان شکن جوابی تقریر کو سن کر سارا ہال نعرہ ہائے تکبیر سے گونج اٹھا آپ اس ہندو مناظر پر حاوی ہو گئے اور اس سے کوئی معارضہ نہ ہو سکا اس لئے وہ دم بخود اور ساکت ہو کر رہ گیا۔

واقعہ نمبر (۲):

حضرت کی نوعمری کے زمانے کا یہ واقعہ بڑا مشہور ہے اور خود حضرت کی زبان سے بہت سے دوستوں نے سنا ہوگا، آپ فرماتے ہیں کہ میرے بچپن میں لاہور حزب الاحناف میں انتہائی شاندار پانچ روزہ جلسہ ہوا کرتا تھا اس وقت حزب الاحناف جامع مسجد وزیر خان میں ہوا کرتا تھا اور یہ جلسہ بھی مسجد وزیر خان میں منعقد ہوتا تھا، آج کل تو جلسوں میں اتنے سامعین نہیں ہوتے جتنے اس جلسے میں علماء اور مقررین تشریف فرما ہوتے تھے۔ اور اس جلسے میں مجھے خطاب کرنے کا موقع ملا، میں بچہ تھا، سولہ سترہ سال عمر ہوگی، نیا نیا فارغ التحصیل ہو کر آیا تھا ایسے میں خطاب کرنے اور علم کے جوہر دکھلانے کا شوق بھی بہت ہوتا ہے، تو بڑے اور اکابر علماء سے پہلے بعض اوقات طلباء کو تقریر کرنے کا موقع حوصلہ افزائی کی نیت سے دیا جاتا ہے، اسی طرح مجھے بھی موقع مل گیا، میں نے حضور سید عالم ﷺ کی شان بیان کی، اور کہا کہ دنیا میں کوئی خوبی کوئی حسن، کوئی اچھائی ایسی نہیں جو میرے آقا ﷺ میں بدرجہ اتم نہ پائی جاتی ہو، روئے زمین پر کوئی شخص ایسا نہیں ہے جسے کسی خوبی اور صفت میں سرکار پر فوقیت ہو، نہ سرکار سے بڑھ کر کوئی عالم ہو سکتا ہے، نہ باحیا ہو سکتا ہے نہ شجاع و بہادر ہو سکتا ہے، نہ حلیم و کریم ہو سکتا ہے، میں تقریر کر رہا تھا، یہ ۱۹۲۹ء کی بات ہے، اس وقت سارا ہندوستان ہی تھا اور پاکستان معرض، وجود میں نہ آیا تھا، جلسہ گاہ کے ساتھ ہندو سکھ بھی رہتے تھے تو میری تقریر کے دوران ایک پرچہ آیا، اس میں لکھا کہ مولانا صاحب میں ایک ہندو

لڑکی ہوں اور بی، اے میں پڑھتی ہوں، میرا گھر آپ کی جلسہ گاہ کے بالکل ساتھ ہے اس لیے کئی دن سے میں آپ کے جلسے میں ہونے والی تقریریں سن رہی ہوں آج آپ کہہ رہے ہیں کہ دنیا میں کسی صفت اور کسی خوبی میں آپ کے نبی سے بڑھ کر کوئی نہیں ہو سکتا، جبکہ اسی اسٹیج پر کل ایک دوسرے مولانا صاحب تقریر کر رہے تھے اور انھوں نے حاتم طائی کی سخاوت کا ایک واقعہ بیان کیا انھوں نے بتایا کہ حاتم طائی اتنا سخی تھا کہ اس نے لوگوں میں مال و دولت تقسیم کرنے کیلئے ایک محل بنوایا جس کے سات دوازے رکھے جو سائل جس دروازے سے بھی آئے سوال کرے تو مراد پائے، ایک سائل پہلے دروازے سے آیا حاتم نے اسے خیرات دی، وہ پھر دوسرے دروازے سے آ گیا، حاتم نے پھر بھی اسے دیا، وہ تیسرے چوتھے غرض ساتوں دروازوں پر آیا اور اس کے سوال، پر حاتم نے ہر بار اسے دیا اور یہ نہیں کہا کہ تم اتنی بار لے چکے اب بار بار کیوں چلے آئے ہو، اور وہ سائل پھر پہلے دروازے پر مانگنے چلا آیا، حاتم کے ماتھے پر تب بھی شکن نہ آئی اور اس نے دستِ سخاوت پھر بھی نہ کھینچا، یہ واقعہ تاریخی اعتبار سے صحیح ہے یا غلط ہے، اس پر بحث مقصود نہیں وہ اس لیے کہ یہ آپ کے اپنے اسٹیج سے آپ کے اپنے عالم نے بیان کیا ہے اس لیے اس کو صحیح ماننا ہی پڑے گا، اب آپ یہ فرمائیں کہ آپ کا دعویٰ ہے کہ کسی خوبی میں کوئی آپ کے نبی سے بڑھ کر نہیں ہو سکتا، تو کوئی آپ کے نبی سے بڑھ کر سخی بھی نہیں ہو سکتا، اگر یہ بات درست ہے تو پھر آپ حاتم کی سخاوت کے اس واقعے سے بڑھ کر اپنے نبی کی سخاوت کا کوئی واقعہ بیان کریں ورنہ تسلیم کر لیں کہ حاتم آپ کے نبی سے بھی زیادہ سخی تھا، اس نے پرچی کے آخر میں یہ بھی تحریر کیا کہ آپ چاہے میرے اعتراض کا جواب دیں یا نہ دیں لیکن یہ پرچی پڑھ کر مجمع کو سنا ضرور دیں، ایسا لکھنے سے ظاہر ہے کہ اس کا مقصد یہ تھا کہ میرے اس اعتراض کا جواب تو کوئی دے نہیں سکے گا، اس طرح مسلمانوں کو ایک ہندو لڑکی کے اعتراض کے باعث خفت اور شرمندگی اٹھانا پڑے گی۔

میں نے جب یہ پرچہ پڑھ کر سنایا تو سٹیج پر موجود علماء میں ایک اضطرابی کیفیت پیدا ہوئی، وہ دراصل یہ سوچ رہے تھے کہ ایک طالب علم کھڑا تقریر کررہا ہے، اگر اس سے صحیح جواب نہ بن پڑا تو بڑی سبکی ہوگی، اور مجمع میں ایک دفعہ بات بگڑ جائے تو پھر اسے بنانا بڑا مشکل ہوتا ہے، لیکن میں نے ان علماء کے اضطراب کی طرف توجہ دیے بغیر اس کا جواب دینا شروع کیا۔

میں نے کہا کہ حاتم کے واقعے سے اگر کوئی یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ وہ بے حد سخی اور ''بڑا دیالو'' تھا تو یہ اس کی کم فہمی ہے، اس واقعے سے تو اس کی کنجوسی اور کم ہمتی ثابت ہوتی ہے، ایک سائل آتا ہے سوال کرتا ہے، حاتم اسے دیتا ہے، اس کی جھولی نہیں بھرتی، اس کی مراد پوری نہیں ہوتی، اس کی طلب ختم نہیں ہوتی، وہ دوبارہ جھولی پھیلاتا ہے، حاتم پھر اسے کچھ دیتا ہے، لیکن اب بھی اس نے اتنا کم دیا ہے کہ سائل دوبارہ سوال کرنے پر مجبور ہے، حاتم بار بار دیتا ہے سائل کی طلب باقی رہتی ہے وہ بار بار لوٹ کر آتا ہے، یہ کیسی سخاوت ہے یہ تو کنجوسی ہے۔

اگر سخاوت دیکھا ہو تو آؤ میرے آقا ﷺ کی سخاوت دیکھو، تہجد کا وقت ہے حضرت ربیعہ رضی اللہ عنہ سرکار ﷺ کے صحابی، سرکار کے جاں نثار سرکار کو وضو کرارہے ہیں، سرکار ان کی خدمت پر خوش ہوتے ہیں، دریائے رحمت جوش میں آتا ہے، فرماتے ہیں'' **سل یا ربیعه**'' مانگ ربیعہ کیا مانگتا ہے، ربیعہ عرض کرتے ہیں'' **اسئلك مرافقتك فی الجنة**'' سرکار میں جنت میں آپ سے آپ کی رفاقت طلب کرتا ہوں، سرکار فرماتے ہیں'' **او غیر ذالك**'' یہ تو ہم نے تجھے عطا کر دیا، تیرا سوال پورا ہوا، کچھ اور مانگنا ہو تو وہ بھی مانگ لے، ربیعہ عرض کرتے ہیں'' **هكذا یا رسول الله**'' اے اللہ کے رسول ﷺ! میرے لیے یہی سب کچھ ہے۔

سب کچھ خدا سے مانگ لیا تجھ کو مانگ کر

جب آپ مل گئے تو اور کیا چاہیے سرکار پھر فرماتے ہیں'' **او غیر ذٰلک**''

ربیعہ کچھ اور مانگ لے ربیعہ کہتے ہیں سرکار بس یہی درکار تھا، دامنِ طلب میں اب بھلا کس شے کی گنجائش ہوگی۔

ذرا دیکھو! ایک طرف وہ سائل ہے جو بار بار آتا ہے اور حاتم سے سوال کرتا ہے، ایک طرف یہ داتا ہیں جو سائل سے بار بار کہتے ہیں کہ کچھ اور مانگ لو، تو اب تم خود فیصلہ کرلو کون زیادہ سخی ہے۔

یہ واقعہ بیان فرمانے کے بعد غزالئ زماں رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ وہ ہندو لڑکی اس جواب کو سن کر مسلمان ہوگئی تھی اور حزب الاحناف کے سٹیج پر موجود علماء ششدرہ تھے کہ اتنا مکمل جواب اس نوجوان نے کیونکر دیا۔

کسی نے آپ سے سوال کیا کہ آپ (حدیث شریف سے نہیں بلکہ) قرآن مجید سے یہ ثابت کریں کہ داڑھی کم از کم ایک مٹھی ہونی چاہیے، یعنی داڑھی خشخشی نہ ہو، آپ نے فی البدیہہ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کے تذکرہ میں حضرت ہارون علیہ السلام کا یہ مقولہ ذکر فرمایا ہے'' **یا بنئوم لا تاخذ بلحیتی**'' اے میرے بھائی موسیٰ علیہ السلام میری داڑھی نہ پکڑو، اس آیت سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے نبی ہارون علیہ السلام کی داڑھی خشخشی نہ تھی ورنہ وہ موسیٰ علیہ السلام کی مٹھی میں نہ آسکتی۔

نوٹ: حضرت کے اس استدلال کی تشریح یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں حضرت ہارون علیہ السلام دیگر انبیاء کرام علیہم السلام کا ذکر فرما کر نبی کریم ﷺ سے یوں ارشاد فرمایا ہے'' **اولٰئك الذین هدی الله فبهدهم اقتده**'' یعنی پیارے حبیب ﷺ یہ حضرات ہدایت یافتہ ہیں تو آپ ان کی ہدایت کی پیروی کریں۔ (پ ۷، الانعام ۹۰) پس جب ہارون علیہ السلام کی داڑھی مبارک کا اتنا طویل ہونا کہ مٹھی میں آسکے قرآن کے ارشاد'' **لاتاخذ بلحیتی**'' سے ثابت ہوگیا پھر جب قرآن ہی میں ہیں ان کی پیروی کا حکم دیا گیا تو اس سے داڑھی کا ضروری ہونا روزِ روشن کی طرح واضح ہوگیا۔''

ایک شبہ کا ازالہ:

شاید کسی کے دل میں یہ شبہ پیدا ہو کہ حضرت ہارون علیہ السلام نبی ہونے کے ساتھ ساتھ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے عمر میں تین برس بڑے تھے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ''**لاتاخذ بلحیتی**'' فرمانا کیا ان کی توہین کے مترادف نہیں؟ تو اس کا ازالہ یہ ہے کہ عمر کے لحاظ سے بیشک ہارون علیہ السلام ہی بڑے تھے اور ہارون علیہ السلام کو نبوت اور نیابت حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا سے ملی، قرآن مجید دعائے موسوی علیہ السلام کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتا ہے'' **وجعل لی وزیر من اھلی ھارون اخی**'' یعنی اے اللہ میرے ہی خاندان سے میرے بھائی ہارون علیہ السلام کو میرا نائب بنادے۔''

بارگاہِ ایزدی سے جواب ملا'' **قداوتیت سوء لك یموسیٰ**'' اے موسیٰ جو آپ نے مانگا ہم نے آپ کو دے دیا، رہا آپ کا ان کی داڑھی کو پکڑنا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ جب آپ طور پر تشریف لے گئے اور اپنی قوم کی دیکھ بھال حضرت ہارون علیہ السلام کے ذمہ لگائی پھر جب چالیس راتیں پوری کرنے کے بعد واپس آتے ہی اپنی قوم کو بگڑا ہوا اور گاؤ سالہ کی پوجا میں مبتلا پایا تو اس سے یہ بات غیرت کی بناء پر برداشت نہ ہوسکی جبکہ آپ دینِ الٰہی کے بارے میں اس قدر غیور تھے کہ جلالِ موسوی کو بطورِ ضرب المثل بولا جاتا ہے، پس آپ نے غلبۂ عشق و محبتِ الٰہیہ کی وجہ سے اول وہلہ میں یہ سمجھا کہ شاید یہ سب کچھ ہارون علیہ السلام کے فرائض نیابت کی انجام دہی میں کمی کے باعث ہے پھر چونکہ ہارون علیہ السلام کو اپنا نائب بنا کر گئے تھے اس لیے پہلے اپنے غضب و جلال کا اظہار بھی ان پر ہی فرمایا اور باز پرس بھی انہی سے کی اور اس سے معاذ اللہ موسیٰ علیہ السلام کا قصدان کی توہین نہیں تھا ورنہ اللہ تعالیٰ موسیٰ علیہ السلام کی اس بارے میں تردید فرماتا'' واذ لیس فلیس'' اسی طرح مزاج شناس رسالتِ ہارون علیہ السلام نے اس موقعہ پر جلالِ موسوی فرو کرنے کیلئے جو الفاظ بولے وہ بھی اس امر کے شاہد عدل ہیں کہ اس

مقام پر موسیٰ علیہ السلام نے جو کچھ بھی اظہارِ جلال فرمایا تو وہ محض کمال درجہ کی غیرت وحمیت دینیہ اور قوم کے اس کرتوت کی سخت قباحت کے ظاہر کرنے کیلئے کیا، قرآن مجید نے اس موقع پر بولے گئے ہارون علیہ السلام کے وہ الفاظ نقل کرتے ہوئے فرمایا'' **قال یبنئوم لاتخذ بلیحیتی ولا براسی انی خشیت ان تقول فرقت بین بنی اسرائیل ولم ترقب قولی**'' (پ۱۶، الطٰہٰ ۹۴) ایک اور مقام پر'' **قال این ام ان القوم الستضعفو نی وحادو ایقنونی فازتشمت بی الاعداو۔**'' (پ۹ الاعراف ۱۵۱)

یعنی اے میرے ماں جائے! میرے سر اور داڑھی کے بالوں کو مت پکڑیں، قوم کے بگاڑ میں میرا کوئی قصور نہیں بلکہ جب انھوں نے بچھڑے کی پوجا شروع کی تو میں نے انہیں بہت روکا لیکن وہ نہ مانے اور الٹا مجھے ناتواں سمجھ کر میرے قتل کے درپے ہوگئے، اب اگر میں ان سے لڑائی جھگڑا کرتا تو کچھ لوگ میرے ساتھ ہوجاتے اور کچھ لوگ سامری کے ساتھ نتیجتاً پوری قوم میں پھوٹ پڑ جاتی، اور آپ ہی کہتے کہ تو نے میرے حکم کا انتظار نہ کیا اور میری قوم میں تفرقہ ڈال دیا، اس لیے میں اپنے وعظ و نصیحت کے فرضِ منصبی کو پورا کرنے کے بعد قوم سے الگ ہو بیٹھا، اب آپ جلال میں آکر مجھ سے جھگڑیں نہیں ورنہ دشمنوں کو یہ کہنے کا موقعہ مل جائے گا کہ دیکھو جی بڑا اچھا ہوا کہ دونوں بھائی آپس میں لڑے ہوئے ہیں اور مخالفین کو اس کی خوشی ہوگی اب موسیٰ علیہ السلام کو بھائی کے محبت بھرے الفاظ سن کر اس غلبہ حال سے کچھ افاقہ ہوا تو انہیں خوش کرنے اور شماتت اعداء کے دفع کیلئے بارگاہِ خداوندی میں یوں گویا ہوئے'' **رب اغفرلی ولا خی وادخلنا فی رحمتك وانت ارحم الرحمین**'' (پ۹ الاعراف ۱۵۱)

علامہ سید محمود آلوسی بغدادی'' **واخذ براس احیه یجده الیه**''

کے تحت ارقام فرماتے ھیں" ظلنامنه علیه السلام انه قصر فی کفهم ولم یتمالك لشده غضبه وفرط غیظه ان فعل ذلکوکان هارون اکبر من موسیٰ علیہ السلام بثلاث سنین الا ان موسیٰ اکبر من مرتبة وله الرسالة والریاسة استقلال وکان هارون وزیرا له وکان حمولا لینا جدو اولم یقصدر موسیٰ بهذا الامر هانة ولاستخفاف به بل اللوم الفعلی علی التقصیر المظنون بحکم الریاسة وفرط الحمیة"
(روح المعانی ج ٥ ص ٦٧ پ٩ طبع ملتان)

واقعہ نمبر (۴):

ایک نہایت ہی ان پڑھ جاٹ آدمی نے آپ سے عرض کی کہ ہمارے علاقے کے دیوبندی کہتے ہیں کہ یزید پلید حق پر تھا اور معاذ اللہ حضرت سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ ناحق تھے، اب حضرت رحمۃ اللہ علیہ اس کے جواب میں قرآن و حدیث پڑھ دیتے تو جواب تو ہو جاتا مگر اس کے ان پڑھ ہونے کی وجہ سے اس کے پلے کچھ نہ پڑتا، چونکہ عوام کے دلوں میں اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اہل بیت اطہار، صحابہ کرام و اولیاء کرام کی محبت کے نقوش بہت گہرے ہیں اور یہ سب کچھ ڈیڑھ ہزار سالہ اسلامی تاریخ کے تسلسل اور علماء و صلحاء کے اندازِ تربیت اور حسنِ بیان کا نتیجہ ہے اس لیے حضرت نے اس کے ذوق اور معیار کے مطابق جو جواب عطا فرمایا، آپ نے فرمایا" بھائی! ان سے جا کر کہہ دو کہ اللہ تعالیٰ تمہارا حشر یزید کے ساتھ کرے اور ہمارا حشر سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ کے ساتھ کرے، یہ جواب سن کر وہ نہایت خوش وخرم چلا گیا۔"

واقعہ نمبر (۵):

ایک شیعہ عالمِ دین نے حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے کہا کہ آپ حضرات وضو میں پاؤں

دھونے کو لازم قرار دیتے ہیں جبکہ ہم اہل تشیع مسح کافی سمجھتے ہیں، اپنے مسلک اور طریقے کی تائید کیلئے میرے پاس ایسی عقلی دلیل موجود ہے جس کا جواب ممکن نہیں، حضرت نے تعجب کے ساتھ کہا کہ ایسی کوئی دلیل پہلے تو کبھی نہیں سنی چلیں آج آپ کی زبانی سن لیتے ہیں، اس نے کہا اگر پانی موجود نہ ہو یا بیماری کے باعث وضو کرنا ممکن نہ ہو تو تیمم کیا جاتا ہے، تیمم کا فلسفہ یہ ہے کہ جن اعضاء کا وضو میں دھونا واجب تھا، تیمم میں وہ ساقط ہو گیا۔

چونکہ تیمّم میں صرف کہنیوں تک ہاتھوں اور چہرے کا مسح کرنا ہوتا ہے اس لیے پتہ چلا کہ وضو میں صرف انہی اعضاء کا دھونا فرض تھا، سر اور پاؤں کا وضو میں مسح تھا، اس لیے تیمّم میں سر اور پاؤں کا مسح ختم ہو گیا، حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے فوراً فرمایا" **ولا حول ولا قوة الا بالله**" یہ بھی کوئی ایسی دلیل ہے جس کا جواب ممکن نہ ہو، اس کا جواب میں کیا دوں آپ خود بھی عطا فرما دیں گے، میں تو صرف ایک سوال کروں گا، سوال یہ ہے کہ اگر تیمّم کرنا مجبوری ہو اور وضو کرنا مقصود ہو تو چہرے اور ہاتھوں کا مسح ہو گا، اور اگر آدمی پر غسل واجب ہو اور پانی میسر نہ ہو تیمّم کرنا مجبوری ہو پھر وہ کس طرح تیمّم کرے گا؟

آپ کے اس سوال نے اس شیعہ عالم کو مطلقاً لاجواب کر دیا، وہ اس لیے کہ ہم سب جانتے ہیں کہ جب واجب ہو تو سارے جسم کا ایک ایک حصہ، بلکہ ایک ایک بال دھونا اور اس پر پانی بہانا واجب ہے اگر یہ فلسفہ درست تسلیم کر لیا جائے کہ جن اعضاء کا اصل میں دھونا لازم تھا ان کا مسح کرنا بھی لازم ہو گا تو غسل واجب ہونے کی صورت میں تیمّم کرتے ہوئے سارے جسم کا مسح کرنا ضروری قرار پاتا ہے، جبکہ ایسا نہیں ہے گویا ثابت ہو گیا کہ تیمّم کا جو فلسفہ اس شیعہ عالم نے بیان کیا تھا وہ درست نہ تھا۔

واقعہ نمبر (۶):

غالباً ۱۹۷۳ء کی بات ہے آپ اپنی (شاداب کالونی) جامع مسجد میں بعد از نماز فجر درسِ قرآن دے رہے تھے، اس دوران ایک شخص نے سوال کیا کہ شیعہ کہتے ہیں کہ وضو میں پہلے پاؤں دھونے چاہییں حالانکہ اہلسنت اس کے برخلاف کرتے ہیں آپ نے سائل کے ذہن کے پیشِ نظر فی البدیہہ فرمایا ''پانی کے تین اوصاف ہیں، رنگ ذائقہ اور بُو، اگر ان میں سے اس کا کوئی ایک وصف بھی کسی غیر طاہر چیز کے اختلاط سے تبدیل ہو جائے تو پانی قابلِ طہارت نہیں رہتا، اور یہ بھی ظاہر ہے کہ پانی کی رنگت اسے چلو میں لینے سے معلوم ہوتی ہے اس کا ذائقہ اسے منہ میں رکھنے سے اور اس کی بُو ناک میں دینے سے، لہٰذا ہم سب سے پہلے پانی کو چلو میں لیتے ہیں تو ہمیں اس کی رنگت معلوم ہو جاتا ہے اور جب اسے منہ میں رکھتے ہیں تو اس کے ذائقہ کی خبر چل جاتی ہے اور اس کے بعد جب اسے ناک میں ڈالتے ہیں تو اس کی بُو کا ہمیں علم ہو جاتا ہے، پھر جب ہمیں یقین ہو جاتا ہے کہ پانی کا کوئی وصف بدلا ہوا نہیں تو ہم اس سے وضو کرتے ہیں لیکن جو لوگ اس کے برخلاف کرتے ہوئے وضو میں پہلے پاؤں دھوتے ہیں انہیں پاک ناپاک کی کوئی تمیز نہیں ہوتی۔

واقعہ نمبر (۷):

کسی نے کہا کہ وہابیہ کہتے ہیں کہ حضرت نوح علیہ السلام نے اپنے بیٹے کیلئے دعا مانگی جو قبول نہ ہوئی اس کا کیا جواب ہے؟ آپ نے فرمایا کہ ''نوح علیہ السلام نے تو اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کر رکھی تھی'' **رب لاتذرعلی الارض من الکفرین دیار''** یعنی اے میرے رب! زمین پر سکونت رکھنے والے کسی کافر کو نہ چھوڑو (یعنی تمام کفار کو ہلاک کر دے) اب نوح علیہ السلام کا بیٹا کافر تھا اگر بچ جاتا تو کہا جا سکتا تھا کہ معاذ اللہ آپ کی دعا قبول نہ ہوئی۔ پس آپ کے بیٹے کی ہلاکت آپ کی دعا کی قبولیت کی دلیل ہے۔

رہا آپ کا یہ کہنا کہ '' **ان نبی من اھلی**'' تو یہ ازراہِ شفقتِ پدری اور بطورِ اتمامِ حجت تھا اور اللہ تعالیٰ کا انہیں '' **انه لیس لك به علم**'' یعنی مجھ سے ایسی بات کا سوال نہ کرو، جس کا آپ کو علم نہ ہو'' یہ نوح علیہ السلام کے علم کے منافی نہیں بلکہ اس میں ایسی چیز کے وجود کی نفی کی گئی ہے کہ جس کا سرے سے وجود ہی نہ ہو یعنی اے نوح علیہ السلام! جب کافر کی بخشش کا تمہیں علم ہی نہیں یعنی مغفرت کافر کا وجود ہی نہیں تو آپ مجھ سے اسے کیوں طلب کرتے ہیں'' پھر حضرت نے اس بات کو ایک مثال میں سمجھایا کہ ''مثلاً کوئی مجھ سے کہے، آپ کے پاس رقم ہے؟ میں کہوں ہاں، وہ کہے اچھا آپ کے پاس واقعی رقم ہے تو مجھے سترہ روپے کا نوٹ دکھایئے؟ اس پر میں کہوں گا کہ سترہ روپے کا نوٹ میں جانتا ہی نہیں ہوں آپ کو دکھاؤں کیسے تو میں اپنے اس قول میں یقیناً سچا ہوں گا کیونکہ سترہ روپے والے نوٹ کا سرے سے وجود ہی نہیں اب اگر کوئی اعتراض کرے کہ آپ تو کہہ رہے تھے میرے پاس رقم ہے، پھر سترہ روپے کا نوٹ کیوں نہیں تو یہ اعتراض لغو ہوگا، معلوم ہوا کہ کبھی علم کی نفی کے ذریعہ کسی چیز کی نفی کرنا بھی مروج ہے'' **وهو المقصود۔''**

نوٹ: اقوال، اس کی مثالیں قرآن مجید میں بھی پائی جاتی ہیں، چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے'' **قل اتنبون الله بما لایعلم فی السموٰت ولافی الارض**'' یعنی اے حبیب ﷺ! کافروں کے اس کہنے پر کہ پتھروں سے تراشیدہ ان کے بت اللہ کے ہاں ان کی شفاعت کریں گے، آپ ان سے فرما دیں کہ کیا تم اللہ کو اس چیز کی خبر دیتے ہو جسے وہ زمینوں اور آسمانوں میں جانتا ہی نہیں (یعنی زمین و آسمان میں وہ چیز سرے سے موجود ہی نہیں۔) (الیونس ۱۸)

ایک اور مقام پر فرمایا'' **ام تنبسئونه بمالا یعلم من فی الارض الآية**'' یعنی کیا تم اسے ایسی چیز بتاتے ہو جسے وہ زمین میں جانتا ہی نہیں (یعنی زمین میں سرے سے اس چیز کا وجود ہی نہیں پایا جاتا)۔''

واقعہ نمبر (۸):

کسی نے کہا کہ آپ کہتے ہیں کہ بزرگانِ دین کے تبرکات نفع مند چیز ہے، حالانکہ حدیث شریف میں ہے کہ حضور ﷺ نے رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی ابن سلول کو اپنی قمیص پہنائی اس کے باوجود جہنم میں ہے کیونکہ وہ منافق تھا اور نفاق ہی پر اس کی موت واقع ہوئی اور قرآن نے فرمایا" **ان المنافقین فی الدرك الاسفل من النار**"، یعنی منافقین کا ٹھکانہ جہنم کا سب سے نچلا گڑھا" (النساء ۱۴۵)

اگر تبرکات میں کوئی تاثیر ہوتی تو رسول اللہ ﷺ کی قمیص مبارک کی برکت سے ابن ابئ جنت میں جاتا لیکن قمیص پہننے کے باوجود اس کا جہنمی رہنا تبرکات کے غیر موثر ہونے کی دلیل ہے۔

آپ نے سائل کو دو ہی نقطوں میں اڑا دیا، فرمایا" تبرکات غیر موثر ہوتے تو حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ کی آنکھ کا ڈھیلا رسول اللہ ﷺ کے لعابِ دہن سے درست نہ ہوتا، لیکن عبداللہ بن ابی کا معاملہ ایک مثال کے ذریعے سمجھئے! آپ کسی شدید درد کا شکار ہیں، آپ ایک ڈاکٹر کے پاس گئے، اس نے دردِ رفع کرنیکی دوا دی، فرض کریں وہ ڈاکٹر آپ کا مخالف ہے وہ نہیں چاہتا کہ آپ کو دوا فائدہ پہنچائے، کیا وہ اس دوا کی تاثیر چھین سکتا ہے، ہرگز نہیں، ہاں اگر وہ بددیانتی کا مظاہرہ کرے اور دوا غلط دے تو اور بات ہے، وگرنہ دوا کا اثر تبدیل کرنا یا سلب کرنا ڈاکٹر کے اختیار میں نہیں ہے، لیکن نبی کریم ﷺ کو اللہ نے اختیار بھی عطا فرمایا تھا کہ اگر آپ چاہیں تو آپ کے تبرکات نفع بخش ثابت ہوں، اور اگر مصلحت کے تحت آپ ایک منافق کو بھی اپنا کرتہ عطا فرمادیں لیکن اس کے نفاق کے باعث آپ یہ نہ چاہیں کہ یہ کرتہ اس کیلئے فائدہ مند ہو تو آپ اس کی برکت اس منافق تک نہ پہنچنے دیں، گویا ابن ابی کو رسول اللہ ﷺ کی

قمیص سے فائدہ پہنچنا اس لیے نہ تھا کہ اس میں برکت نہ تھی بلکہ آپ نے اس سے برکت نکال لی تھی اور پہلے ہی فرمایا دیا تھا کہ میری قمیص اسے کوئی فائدہ نہ پہنچائے گی اور اسے قمیص پہنانے کی ایک حکمت آپ نے بیان فرمائی کہ میرے اس نرم رویے سے اس کے قبیلے کے سینکڑوں لوگ مخلص مسلمان ہو جائیں گے اور ایسا ہی ہوا، ملاحظہ ہو فتح الباری شرح صحیح البخاری۔"

واقعہ نمبر (۹):

کسی نے کہا کہ آپ حضرات رسول اللہ ﷺ کو مختارِ کل مانتے ہیں، اگر یہ صحیح ہے تو آپ نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو بیٹا کیوں نہ دیا؟ حضرت نے برجستہ فرمایا کہ" آپ ﷺ نے تو انہیں کہا تھا کہ بیٹا بھی لے لو مگر عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے اس کے لینے سے خود انکار کر دیا تھا، اس کی دلیل قرآن مجید کی یہ آیت بھی ہے" **یا ایھا النبی قل الازواجك ان کنتن تردن الحیوة الدنیا وزینتها فتعالین امتعکن واسرحکن سراحا جمیلا**"، یعنی اے نبی (ﷺ) اپنی بیویوں کو بلا کر ان سے فرما دو اگر تمہیں دنیا کی زندگی اور اس کی زینت مطلوب ہے تو آؤ میں تمہیں مال دے کر اچھی طرح الگ کر دوں۔" (الاحزاب ۲۸)

اس آیت کریمہ میں رسول اللہ ﷺ نے بحکمِ خداوندی اپنی ازواجِ مطہرات کو حیاتِ دنیا کی زینت عطا فرمانیکا کہا ہے اور زینتِ حیوۃ کی وضاحت خود قرآن مجید ہی کی دوسری آیت میں ہے، چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے" **المال والبنون زینة الحیوة الدنیا**"، یعنی مال اور بیٹے دنیوی زندگی کی زینت ہیں۔" (الکھف ۴۶)

اس آیت سے ثابت ہوا کہ دنیوی زندگی کی زینت بیٹے بھی ہیں اور ابھی معلوم ہو چکا کہ رسول اللہ ﷺ نے بشمول عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اپنی تمام ازواجِ مطہرات کو

دنیوی زینت سے نوازنے کیلئے بھی بلایا لیکن احادیث میں ہے کہ اس کے لینے سے بھی انکار کردیا، حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا ان میں سرِ فہرست تھیں تو یہ امر اظہر من الشمس ہوگیا کہ آپ تو سیدہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو بیٹا بھی بعطائے خداوندی دینا چاہتے تھے، مگر انھوں نے خود نہ لیا۔''

واقعہ نمبر (۱۰):

کسی نے کہا کہ آپ کہتے ہیں کہ انبیاء کرام علیہم السلام سے خطاء اور غلطی سرزد نہیں ہوسکتی، اگر یہ صحیح ہے تو آدم علیہ السلام کو جنت سے زمین پر کیوں اتارا گیا؟ آپ نے اس کے جواب میں فی البدیہہ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے کب فرمایا تھا کہ میں آدم علیہ السلام کو جنت میں رکھوں گا؟ اس نے تو تخلیقِ آدم سے پہلے فرما دیا تھا'' **انی جاعل فی الارض خلیفہ**'' یعنی میں زمین میں اپنا نائب (آدم) پیدا کروں گا اور آپ کو جنت سے باہر تشریف لانا شجرہ ممنوعہ کے کھانے پر تقدیر پر موقوف رکھا گیا تھا، اگر آپ اسے نہ کھاتے تو اس سے کبھی باہر نہ آتے اور منظور تھا ان کو زمین پر لانا، لہٰذا ایک طرف تو انہیں'' **لا تقربا ھذہ الشجرۃ**'' فرما کر اس درخت سے کھانے کی ممانعت فرمادی اور دوسری طرف ان کی توجہ اس سے ہٹا کر انہیں اس سے کھلایا اور پھر آپ باہر آگئے، قرآن شاہد ہے کہ شجرۂ ممنوعہ کے استعمال کے وقت حضرت آدم علیہ السلام اس کی جانب بالکل غیر متوجہ تھے، چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے'' **ولقد عھدنا الٰی آدم من قبل فنسی ولم نجد لہ عزما**'' یعنی ہم نے آدم کو ایک تاکیدی حکم دیا تھا پس ان پر (ان کی شان کے لائق) نسیان طاری ہوگیا اور ہم نے ان میں (اپنی نافرمانی کا) کوئی قصد ہی نہ پایا۔'' (الطٰہٰ ۱۱۵)

رہے آپ کی دعا کے یہ الفاظ کہ'' **ربنا ظلمنا انفسنا وان لم تغفرلنا وترحمنا لنکونن من الخٰسرین**'' تو ان کے یہ الفاظ بارگاہِ

خداوندی میں عجز وانکساری پر مبنی اور تعلیمِ امت کیلئے ہیں فقط۔''

واقعہ نمبر (۱۱):

ایک مرتبہ مدرسہ انوار العلوم کے جلسہ دستار فضیلت کے موقعہ پر دن کی نشست میں حضرت محدثِ کچھوچھوی رحمۃ اللہ علیہ مدعو تھے، محدثِ صاحب رحمۃ اللہ علیہ موصوف نے اپنی تقریر کا آغاز کرتے ہی بے تکلفانہ انداز میں فرمادیا کہ علامہ کاظمی صاحب نے آج مجھے معراج کے موضوع پر تقریر کرنے کا فرمایا ہے حالانکہ معراج تو رات کو ہوئی تھی اور علامہ صاحب اس کا بیان دن کو کرا رہے ہیں، حضرت رحمۃ اللہ علیہ اس وقت سٹیج پر تشریف فرما تھے، آپ نے محدث صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی یہ بات سن کر فوراً فرمایا'' صاحب! معراج تو رات کو ہوئی تھی، اس سے انکار نہیں مگر اس کا تذکرہ دن ہی کو ہوا تھا، محدث صاحب آپ کے اس برجستہ جواب سے بہت محظوظ ہوئے اور آپ کو دعائیں دیں، اور وہ ادباً آپ کا نام نہیں لیتے تھے، بلکہ آپ کو'' علامہ کاظمی'' کہہ کر یاد فرماتے تھے۔''

آپ کی تقریر کے دوران کسی نے یہ سوال کیا کہ آپ لوگ حضور اکرم ﷺ کی تعریف حد سے زیادہ کرتے اور اللہ تعالیٰ سے آپ کو بڑھا دیتے ہیں، حضرت نے برجستہ فرمایا'' یہ بتاؤ کہ اللہ تعالیٰ کی کوئی حد ہے یا ہوسکتی ہے؟ اس نے کہا نہیں آپ نے فرمایا، جب اللہ تعالیٰ حد وغایت سے بالاتر، لامتناہی اور لامحدود ہے، تو آپ لوگ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے حضور ﷺ کو اللہ تعالیٰ سے بڑھا دیا، یا ہمیں کیا جرأت کہ ہم کسی کو اس سے بڑھا سکیں۔''

ایک موقع پر حضرت کی تقریر کے دوران کسی نے یہ اعتراض کیا کہ آپ لوگ حضور ﷺ کی تعریف وتوصیف میں مبالغہ سے کام لیتے ہیں، حالانکہ آپ کے در حق'' التحیات'' میں عبدہ ورسولہ کے الفاظ رکھے گئے ہیں جو آپ کے بندۂ خدا ہونے کی واضح دلیل ہیں تو معلوم ہوا کہ آپ کی تعریف بندے کی سی کرنی چاہیے۔

حضرت نے برجستہ فرمایا" بھائی! التحیات میں "**السلام علیك ایها النبی**" کے الفاظ بھی تو موجود ہیں، اگر معاذ اللہ حضور ﷺ عام بندوں کی طرح ہیں اور آپ کسی امتیازی شان کے حامل نہیں تو التحیات میں "**السلام علیك ایها النبی**" کی بجائے "السلام علیک یا فلاں صاحب یا خان صاحب یا چوہدری صاحب" وغیرہ کیوں نہیں کہا جاتا۔

معلوم ہوا کہ آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کے عبدِ خاص ہیں اور تمام عباد اللہ میں ممتاز فضیلت رکھتے ہیں، پھر عبد کے معنیٰ ہیں بندہ غلام اور مملوک کو بھی کہتے ہیں، اس اعتبار سے تمام انسان مطیع ہوں یا عاصی، مسلم ہوں یا غیر مسلم سب عباد ہیں، مگر کوئی بھی اہل فہم ان میں مساوات کا قائل نہیں ہوسکتا، تو جب ماننے والے اور نا ماننے والے، عاصی اور مطیع کا برابر نہ ہونا ہر ایک کے نزدیک مسلم امر ہے تو سیدِ عالم ﷺ کو عام بندوں کی طرح کہنا دور از عقل بات نہیں تو اور کیا ہے؟ حضور ﷺ کے عبد ہونے کے یہ معنیٰ ہرگز نہیں کہ آپ ہمارے جیسے بندے ہیں بلکہ اس کا مفہوم صرف اتنا ہے کہ آپ معبود نہیں، الحمدللہ کہ حضور ﷺ کی عبدیت پر بھی ہمارا ایمان ہے اور ہم آپ ﷺ کو عبد مانتے ہیں مگر بقولِ علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ۔

عبد دیگر عبدہ، چیزے دگر
او سراپا انتظار ایں منتظر

ایک مرتبہ آپ نے حضور ﷺ کی اپنی قبر مبارک میں زندہ ہونے (یعنی حیات النبی ﷺ) کے موضوع پر تقریر فرمائی تو ایک ڈاکٹر صاحب نے لوگوں سے کہا کہ کاظمی صاحب کی یہ بات حضور ﷺ سے محض عقیدت کی بناء پر ہے ورنہ اس کی کوئی حقیقت نہیں، موت کے بعد کیسے زندگی ہوسکتی ہے؟ ایک شخص مرگیا، اسے قبر میں دفنا دیا گیا، اب وہ زندہ کیسے ہوسکتا ہے؟ اگر کوئی اصرار کرے تو ذرا اسے بھی تو قبر میں دفنا دیں، سو دو سال بعد نہیں صرف ایک ہفتے بعد قبر کھود کر دیکھ لیں کہ وہ زندہ ہے یا مردہ۔

حضرت کو یہ بات پہنچی تو آپ اس سے بحث کی غرض سے بیرونِ لوہاری گیٹ ملتان اس کے کلینک پر پہنچ گئے، اتفاق سے وہاں ایک حاملہ اونٹنی کھڑی تھی، آپ نے فرمایا" ڈاکٹر صاحب آپ قبر کی زندگی کو تو تسلیم نہیں کرتے، اچھا یہ بتائیں کہ اس اونٹنی کے پیٹ میں جو بچہ ہے وہ زندہ ہے یا نہیں؟ اس نے کہا یقیناً زندہ ہے، آپ نے فرمایا اگر اونٹنی کے اس بچے کو باہر نکال کر اس کی جگہ اونٹنی کے پیٹ میں آپ کو بند کر دیا جائے تو کیا آپ کو اس میں زندہ رہ جانا چاہیے، ڈاکٹر صاحب نے کہا یہ نظام اور ہے۔ آپ نے جھٹ فرمایا کہ یہ نظام اور ہے تو قبر کا نظام بھی اور ہے اور یہی میں آپ سے منوانا چاہتا تھا۔"

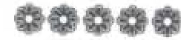
قارئین کرام! حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی حاضر جوابی کے ان واقعات سے آپ بلا شبہ بہت محظوظ ہوئے ہوں گے اور اگر حضرت سے حسنِ عقیدت کی کچھ دولت بھی آپ کو میسر ہے تو آپ کے دل ہل من مزید پکار رہے ہوں گے، لیکن چونکہ دوسرے عنوانات کے تحت بھی کچھ لکھنے کیلئے وقت نکالنا ہے، اسلیے نہایت ہی معذرت کے ساتھ عنوان کو یہیں پر اختتام کو پہنچاتا ہوں، لیکن حزن و ملال کی حاجت نہیں کیونکہ آئندہ عنوانوں کے دامن بھی آپ کے اسی مطلوب و محبوب تذکرہ کے پھولوں سے مہک رہے ہیں کہ جس کی یاد نے ابھی آپ کے مشام جاں کو معطر کیا تھا یعنی وہ کہ جس کی محبت سرمایہ ہدایت اور جس کا نام مخزن و منبع سعادت ہے، تو لیجئے پڑھیے عنوان......

علم، قوتِ گویائی اور حاضر جوابی کے اوصاف کے ساتھ ساتھ زورِ خطابت پر تاثیر، دلکش اندازِ بیان اور دورانِ مناظرہ اگر ضرورت پڑے تو ظرافت اور خوش طبعی کے ذریعہ سامعین کے دل موہ لینے کی خوبی کا بھی مناظرہ میں پایا جانا لازمی امر ہے جس سے مناظر کی مستقل مزاجی، شجاعت اور اس کا شہسوار مناظر ہونا ظاہر ہوتا ہے، حضرت رحمۃ اللہ علیہ میں بھی دوسرے اوصاف کی طرح یہ وصف بھی علی الوجہ الاتم موجود تھا جس کی دلیل گزشتہ سطور میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی حاضر جوابی کے عنوان کے تحت لکھے گے

ر واقعات بھی ہیں کیونکہ حاضر جواب ہونا، جذبات شناس ہونے کی دلیل ہے۔

حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا چوتھا مناظرانہ وصف:

آپ کی آواز بھی نہایت ہی دلکش اور گرجدار تھی، آپ میدانِ تقریر و مناظرہ میں شیر کی طرح گرجتے تھے، آپ کا مدمقابل آپ کی للکار سے لرزہ براندام ہو جاتا تھا اور آپ پر اللہ تعالیٰ کا یہ خاص فضل و کرم تھا کہ بڑھاپے، جسمانی نقاہت و ضعف اور ہمہ وقتی علالت کے باوجود آپ کی آواز میں نوجوانی والی گرج اور دبنگ آوازی میں تادمِ آخر ذرہ برابر بھی فرق نہ آیا اس امر کی مزید تفصیل کی حاجت نہیں کسی کو اس کا واضح، آسان اور پریکٹیکلی ثبوت درکار ہو تو بازار سے حضرت کی تقاریر کی کیسٹیں حاصل کر کے حضرت کی گرجدار آواز کا سماع کرے۔



بسم اللہ الرحمن الرحیم

باب نمبر 29

امامِ اہلسنت حضرت علامہ سیّد احمد سعید کاظمی رحمۃ اللہ علیہ

بحیثیتِ فقیہ

ابوالرضا علامہ اللہ بخش نیّر

مجددی سعیدی، جمن شاہ، لیہ

ماہنامہ السعید امام اہل سنت نمبر ۲۰۰۴ صفحہ ۳۶ تا ۴۴

ابوالرضا علامہ اللہ بخش نیر مجددی سعیدی، جمن شاہ، فرماتے ہیں کہ فقہ ایک ممتاز علم ہے جس کے بغیر احکامِ شرعیہ کا صحیح مفہوم سمجھنا ناممکن ہے، پروفیسر عبدالمجید خان فقہ کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں "لغوی اعتبار سے فقہ کا اطلاق "فہم و ادراک" اور "سوچ سمجھ" پر ہوتا ہے لیکن اصطلاحِ شریعت میں لفظِ فقہ علمِ دین کیلئے مختص ہے اور اسی لیے "شرعی اعمال کے مسائل کا علم" فقہ کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے علمائے فقہ کے نزدیک فقہ سے مراد شریعت کے ان فروعی اعمال کا علم ہے جو تفصیلی دلائل سے اخذ کیا گیا ہو۔"

(عبدالمجید، پروفیسر عبدالمجید خان، الفقہ ص ۱۸، ایڈیشن ۸۳،۱۹۸۲ء تاج بک ڈپو اردو بازار لاہور)

تعلیمِ فقہ کا حصول نصِ قرآنی سے ثابت ہے جیسا کہ ارشادِ خداوندی ہے " **لولا نفر من كل فرقة منهم طائفة ليتفقهوا فى الدين ولينذروا قومهم اذا رجعوا اليهم لعلهم يحذرون۔**" (التوبہ،۱۱۲)

"تو کیا نہ نکلی اس کے ہر گروہ سے ایک جماعت کہ وہ لوگ دین کی سمجھ حاصل کریں اور اپنی قوم کی طرف واپس آکر انہیں ڈرائیں تا کہ وہ (گناہوں سے) بچتے رہیں۔"

قرآن حکیم کی مذکورہ آیت مبارکہ واضح کر رہی ہے کہ مسلمانوں میں ایک مخصوص جماعت کی ضرورت ہے جو

۱) دین کی تعلیم حاصل کرے۔

۲) پھر اپنی قوم کو تعلیمِ دین (خوفِ خداوندی) سے مستفیض کرے، بخاری شریف میں حدیثِ رسول ﷺ ہے۔

"من يرد الله به خيراً يفقهه فى الدين"

(بخاری، محمد بن اسمٰعیل الجامع الصحیح، ج ۲ ص ۱۰۸۷ کارخانہ تجارت کتب خانہ)

"یعنی جس سے اللہ تعالیٰ بھلائی کا ارادہ فرماتے ہیں اسے دین میں سمجھ دیتے ہیں۔"

یہ دین میں سمجھ بہت بڑی نعمت ہے، یہ عالمِ دین ہی ہوا کرتے ہیں جو ان فرائض کو سرانجام دیتے ہیں انہی کی تعلیم سے حکمرانِ وقت نفاذِ شریعت کے قابل ہوتے ہیں اور عوام وخواص فقہاء کے اعمال واقوال سے تربیت پاتے ہیں، جب ہم مذکورہ بیان کی روشنی میں کاظمی شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو دیکھتے ہیں تو ہمیں تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ انھوں نے فقیہ ہونے کا پورا حق ادا کر دیا ہے جو کچھ آپ نے اس سلسلہ میں خدمات سرانجام دیں، اس کا تھوڑا سا بیان، ہم یہاں کرتے ہیں۔

فتاویٰ وحلِ مسائل:

فقہ کا ایک بڑا حصہ اجتہاد و قیاس پر مبنی ہے جو کہ شرائعِ دین کا مملکت اسلامی میں نفاذ کی خاطر ضروری ہے، مختلف ادوار میں آئمہ دین گزرے جنھوں نے وقت کے تقاضے اور حالات کی نزاکت کے پیشِ نظر پیدا شدہ مسائل کے حل و استنباط کیلئے قرآن وحدیث کی روشنی میں اجتہاد وقیاس سے کام لیا اور ایسے نت نئے مسائل کو حل کیا جن کے متعلق قرآن و حدیث میں ارشادۃً تو ذکر تھا لیکن تفصیل موجود نہ تھی، جب حضور ﷺ نے معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو یمن کا قاضی بنا کر بھیجا تو پوچھا کہ تم کس طرح فیصلہ کرو گے؟ تو عرض کیا قرآن کے مطابق، ارشاد ہوا کہ اگر وہ قرآن میں نہ پاؤ تو؟ معاذ رضی اللہ عنہ نے عرض کی سنت کے مطابق فیصلہ کروں گا پھر ارشاد ہوا کہ اگر سنت میں بھی نہ پاؤ؟ تو عرض کی کہ میں اپنی رائے سے کام لوں گا، اس پر حضور ﷺ نے اجازت بھی دی اور معاذ کی تحسین بھی فرمائی۔

اجماع واجتہاد:

اجتہاد قرآن وحدیث کی رو سے جائز ہے، اسی فقہی معاملہ کے متعلق حضور پاک

ﷺ نے حضرت عبداللہ بن عباس کیلئے دعا فرمائی۔

" اللھم فقھه فی الدین وعلمه التاویل"

(حریری، پروفیسر غلام احمد، تاریخ تفسیر و مفسرین، ص ۶۹، ۱۹۸۴ء، ملک سنز پبلشرز فیصل آباد)

حضور کی دعا ہی کا اثر تھا کہ حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ حبرالامت کہلائے، اگر چہ تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم دینِ اسلام میں ہمارے پیشوا ہیں، لیکن امت کیلئے جن علوم میں امتیاز حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کو حاصل تھا وہ فتاویٰ و اجتہاد کی نوعیت کا تھا اور یہ فقاہت فروعی مسائل سے متعلق ہے فقہ اسلامی کے اول دو مآخذ قرآن و حدیث کے بعد تیسرا مآخذ اجماع ہے اور اجماعِ امت سے مراد صحابہ کرام، تابعین، اتباع تابعین یا کسی زمانے کے عدم اور اہلِ حق مجتہدین وعلماء کا کسی مسئلہ پر اتفاق ہے، کسی مسئلہ میں عوام الناس یا اصولِ فقہ سے بے خبر متکلمین، محدثین کا اتفاق اجماع نہیں کہلاتا۔

اسی اجماع کی ایک قسم سکوتی ہے، جس میں اگر کسی مجتہد نے کوئی فیصلہ دیا اور دیگر آئمہ حق نے اس کے بارے میں سکوت اختیار کیا یعنی نہ تو اس کے فیصلے کی تصدیق کی نہ تردید تو وہ جائز قرار دیا جاتا ہے اس بارے میں صحیحین کی ایک روایت ہے" **قال رسول اللہ ﷺ اذا حکم الحاکم فاجتهد ثم اصاب فله اجرن واذا حکم اجتهد ثم اخطاء فله اجر"**

(بخاری محمد بن اسمٰعیل، الصحیح "کتاب الاعتصام" ج ۲، ۱۰۹۲، طبع ۲، ۱۹۶۱ء، تجارت کتب کراچی "مسلم" مسلم ابن الحجاج قشیری الصحیح (کتاب الاقضیہ) ج ۲ ص ۷۶، کارخانہ تجارت کتب کراچی)

یعنی جب کوئی حاکم "مجتہد" فیصلہ دینے میں صحیح فیصلہ پر پہنچے اس کیلئے دو اجر ہیں، اگر اجتہاد میں اس سے خطا ہو جائے تو (بھی) اس کیلئے ایک اجر ہے۔

اسی معاملہ میں قرآن حکیم کے اندر حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام کا ایک معاملہ دو طرح پر فیصلہ کرنا ثابت ہے اور ساتھ یہ بھی فرمان ہے" **لقد اتینا داؤد وسلیمان علما"**

یہاں رب تعالیٰ دونوں کو اپنی طرف سے علم دینے کے بارے میں فرمایا جس کے ہوتے ہوئے کوئی شخص فیصلہ دے سکتا ہے، علم کے بغیر تو بات ناممکن ہے۔

شرائط مجتہد:

فتاویٰ عالمگیری میں اجتہاد کی تعریف یوں بیان کی گئی ہے" اجتہاد کا بالکل صحیح اور شرعی مفہوم لیجئے اور وہ یہ ہے کہ ہمارے علماء فقہاء کی ہر تحقیق، ہر غور و فکر، ہر بحث و تمحیص اور ہر فیصلہ سو فیصد آیاتِ قرآنی، سنتِ نبی ﷺ اور معمولِ خلفائے راشدین کے عین مطابق ہو، اور اس میں کتاب اللہ و سنت رسول اللہ ﷺ سے کہیں بھی انحراف نہ پایا جائے تو یہ ہے صحت مند مستند اور قابلِ قبول اجتہاد۔"

(امیر علی، مترجم، ترجمہ فتاویٰ عالمگیری، دیباچہ، ص، ز، ج ۱، طبع ۱، ۱۹۶۴ء، شیخ غلام علی اینڈ سنز)

علماء کی تصریحات کی روشنی میں ایک مجتہد کیلئے صائب الرائے ہونا، منصف مزاج ہونا، پاکیزہ اطوار کا حامل ہونا، اعلیٰ فہم و فراست کا مالک ہونا ضروری ہے، ساتھ ساتھ میدانِ علم میں قرآن کا علم، حدیث کا علم، علمائے سلف کے اقوال کا علم، اسباب نزول، ناسخ و منسوخ کا علم، علمِ لغت، علمِ قیاس اور راویوں کے حالات میں جرح و تعدیل کے طریقوں سے واقف ہونا بھی ایک مجتہد کیلئے لازم ہے۔

مذکورہ اصول کی روشنی میں دیکھا جائے تو کاظمی رحمۃ اللہ علیہ میں قرآن و حدیث کی روشنی میں اجتہاد کرنے کی تمام شرائط پائی جاتی تھیں اور ایک اچھا فقیہ بننے کی بھرپور صلاحتیں موجود تھیں، ان کے قرآن و حدیث کے علم سے متعلق ہم پہلے بیان کر چکے ہیں، ہم ابھی بیان کر آئے ہیں کہ ایک مجتہد کیلئے علمِ لغت کو جاننا ضروری ہے کیونکہ بعض ایسے الفاظ زبان عربی میں ہیں جن کے لغت کے لحاظ سے کئی معانی نکلتے ہیں، اس طرح اصطلاحی معنیٰ اور عرف شرع کے لحاظ سے ان کی تہہ تک پہنچنا ضروری ہوتا ہے، جیسے لفظِ صلوٰۃ، زکوٰۃ وغیرہ اس بارے میں ہم کاظمی شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے لفظِ "نبی" کے بارے میں تحقیق سے ایک اقتباس پیش کرتے ہیں۔

''علمائے لغت نے لفظِ ''نبی'' کے آٹھ معنیٰ لکھے ہیں، پہلے میں لغوی معنیٰ عرض کروں گا اس کے بعد یہ عرض کروں گا کہ وہ تمام معنیٰ شرعی نبی میں پائے جاتے ہیں علمائے لغت نے فرمایا۔''

۱) النبی، المخبر۔
۲) المخبر۔
۳) الطریق الواضح۔
۴) الخارج۔
۵) المخرج۔
۶) الظاہر۔
۷) السامع الصوت الخفی۔
۸) المرتفع۔

۱) نبی کو مخبر اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ ہدایاتِ الٰہیہ اور پیغاماتِ ربانیہ کی خبر اللہ کے بندوں کو دیتا ہے۔

۲) نبی کو مخبر اس لیے کہتے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے خبر دیا جاتا ہے۔

۳) نبی کو ''الطریق الواضح'' اس لیے کہا جاتا ہے چونکہ نبی کی ذات دنیوی سعادتیں اور نجاتِ اخروی حاصل کرنے کا روشن راستہ ہے، نبی خدا تک پہنچنے کا روشن راستہ ہے۔

۴) ''الخارج'' کے معنیٰ ہیں ایک جگہ سے نکل کر دوسری جگہ جانے والا، چونکہ نبی صاحبِ ہجرت ہوتا ہے اور ہجرت کے معنیٰ ایک جگہ سے نکل کر دوسری جگہ جانا۔

۵) نبی کو ''المخرج'' اس لیے کہا جاتا ہے کہ چونکہ نبی اعدائے دین کی ایذا رسانی کی وجہ سے ایک جگہ سے نکل کر دوسری جگہ جاتا ہے۔

۶) نبی کو ''الظاہر'' اس لیے کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نبی کو وہ علامتِ نبوت عطا فرماتا ہے اور وہ آیاتِ نبوت اور معجزات عطا فرماتا ہے کہ نبی جن کا حامل ہو کر کمالِ ظہور کی

صفت کے ساتھ متصف ہوتا ہے۔

۷) نبی شرعی میں ''السامع الصوت الخفی'' کے معنیٰ مخفی موجود ہیں کیونکہ نبی اللہ کی وحی سنتا ہے اور وہ ایسی ہلکی اور ایسی خفیہ ہوتی ہے کہ جس تک نبی کا ہی ادراک پہنچ سکتا ہے۔

۸) اور نبی کے معنیٰ ہیں ''المرتفع'' رفعت اور بلندیوں والا تو اس میں کوئی شک نہیں کہ نبی ساری کائنات سے بلندتر ہوتا ہے۔

(۱) (کاظمی، علامہ سید احمد سعید، خطباتِ کاظمی، (مقامِ نبوت) ج ۱ ص ۱۳۶ طبع اول (ت،ن) بزمِ سعید علی پور مظفر گڑھ)

علامہ کاظمی رحمۃ اللہ علیہ کی یہ لغوی تحقیق اس بات کی دلیل ہے کہ آپ کو علمِ لغت پر مکمل عبور حاصل تھا، اس کے بعد پھر ان لغوی معانی کو اصطلاحی طور پر استعمال کرنا بھی ایک کمال ہے جو کہ علامہ کاظمی رحمۃ اللہ علیہ میں بدرجۂ اتم پایا جاتا ہے، یہ تو محض ایک مثال تھی، اگر ہم ان تصانیف و تقاریر کو اس حوالے سے دیکھیں تو پتہ چلتا ہے کہ زبان و کلام اور لغت کے اعتبار سے عربی، فارسی اور اردو ہر تین زبانوں میں وہ قابلِ رشک مہارت کے حامل تھے اور یہی تین زبانیں دینی علوم کا سب سے بڑا ذخیرہ رکھتی ہیں۔

عورت کی دیت:

مرد کے مقابل عورت کی نصف دیت پر بعض ناسمجھ اشخاص نے جرح کی ہے کہ یہ ان کی کم علمی کی دلیل ہے، خاص طور پر ادارہ منہاج القرآن ماڈل ٹاؤن لاہور کے سرپرست پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری نے اس مسئلہ کو مختلف فیہ ظاہر کیا ہے، اور عوام میں بڑی شد و مد کے ساتھ اسے اچھالا گیا ہے، کاظمی شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے قرآن، حدیث، اجماعِ امت اور اجتہاد سے اس مسئلہ پر سیر حاصل گفتگو کی ہے اور ثابت کر دکھایا ہے کہ اسلام میں عورت کی دیت مرد کے مقابلہ میں نصف بیان کی گئی ہے اور اس میں اختلاف کی قطعاً گنجائش نہیں ہے اس موضوع میں سے اقتباس ملاحظہ ہو۔

''قرآن کریم میں لفظِ دیت کے اجماع کی تفصیل رسول اللہ ﷺ کے فرمان کی

روشنی میں ہمارے سامنے آگئی کہ قتل خطا کی صورت میں مرد کی دیت کی مقدار سو اونٹ ہے اور عورت کے قتل خطا میں دیت کی مقدار مرد کی دیت کا نصف ہے، یعنی پچاس اونٹ، آیت کریمہ کا اجمال دور ہو جانے کے بعد اس آیت کریمہ کا یہ مفہوم متعین ہو گیا کہ مومن کے قتلِ خطا میں کفارہ واجب ہے اور مقتول کے اہل کو دیت ادا کرنا بھی یقیناً واجب ہے دیت کے واجب ہونے میں مرد و عورت مساوی ہیں مگر مقدارِ دیت میں مساوی نہیں، مرد کی دیت سو اونٹ ہے اور عورت کی دیت اس کا نصف یعنی پچاس اونٹ، دیت اور اس کی مقدار عقل و قیاس سے بالاتر اور محض بیان شارع پر موقوف ہے، کسی کی رائے کو اس میں دخل نہیں، اس لیے اس باب میں موقوف حدیثیں بھی مرفوع کا حکم رکھتی ہیں۔''

(کاظمی، علامہ سید احمد سعید کاظمیh، مقالاتِ کاظمی (مقالاتِ کاظمی) عورت کی دیت، ج ۳ ص ۳۳۲ مکتبہ فریدیہ ساہیوال)

اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ کاظمی رحمۃ اللہ علیہ احکاماتِ الٰہی کا جمالی و تفصیلی علم رکھتے تھے بعض لوگوں نے عورت اور مرد کی دیت معلوم کرنے میں خطاء کی ہے، کاظمی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو کھول کر بیان کیا کہ وجوبِ دیت میں مرد اور عورت برابر ہیں، لیکن مقدارِ دیت میں فرق ہے، یہ آپ کی مجتہدانہ شان کی دلیل ہے اور آپ کا یہاں یہ ثابت کرنا کہ اس ضمن میں موقوف ہے کہ آپ علمِ حدیث میں مکمل دسترس رکھتے ہیں جو کہ ایک فقیہ کیلئے ضروری ہے کاظمی صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس باب میں چند موقوف حدیثیں پیش کرنے کے بعد لکھتے ہیں۔

''ہم بتا چکے ہیں کہ قرآن میں لفظِ دیت بیان مقدار کے لحاظ سے مجمل ہے، امام ابو النصر مروزی رحمۃ اللہ علیہ اپنی تصنیف جلیل ''السنہ'' میں فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ''**ومن قتل مومنا**'' کے ضمن میں لفظِ دیت کا ذکر فرمایا اور بیانِ مقدار میں اسے مجمل اور مبہم رکھا، اس کی تفسیر بذریعہ وحی رسول اللہ ﷺ کو تعلیم فرمائی، حضور ﷺ نے

مسلمان مرد کی دیت سو اونٹ مقرر فرما دی، معلوم ہوا کہ مقدارِ دیت کی تعیین صرف وحیِ الٰہی سے ہے، عقل و رائے کو اس میں کوئی دخل نہیں اور علمائے محدثین اس بات پر متفق ہیں کہ کوئی ایسی بات رسول اللہ ﷺ کی طرف نسبت کیے بغیر صحابی بیان کر دے تو وہ بات صحابی کی نہ ہوگی بلکہ حضور ﷺ کا فرمان قرار پائے گی، ایسی موقوف حدیث حکماً مرفوع ہوتی ہے۔''

(کاظمی، علامہ سید احمد سعید کاظمی رحمۃ اللہ علیہ، مقالاتِ کاظمی (مقالاتِ کاظمی) عورت کی دیت، ج ۳ ص ۳۳۲ مکتبہ فریدیہ ساہیوال)

بہر حال علامہ کاظمی رحمۃ اللہ علیہ نے اس مسئلہ میں مخالفین کو مدلل اور مسکت جواب دے کر ہمیشہ کیلئے خاموش کر دیا، اگر کوئی ضدی اور ہٹ دھرم تسلیم نہ کرے تو اس کا کوئی علاج نہیں، مسئلہ دیت کو آپ نے بڑی وضاحت سے بیان کیا ہے، شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا مکمل مقالہ پڑھنے اور سمجھنے کے لائق ہے اور اس سے آپ کی فقیہانہ شان ظاہر ہوتی ہے۔

رجم اسلامی سزا:

مذہب سے بیگانہ اشخاص اپنی بیہودہ سوچ اور غیر مسلموں کی غلط تنقید سے متاثر ہو کر یہ کہنے لگے کہ ''رجم'' ایک غیر انسانی سلوک ہے اور قرآن و اسلام کے خلاف ہے، اس غلط اور بے جا تنقید کے رد میں شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے سیر حاصل بحث کی ہے اور ''رجم اسلامی سزا'' کے عنوان سے مقالہ لکھ کر امتِ مسلمہ پر احسان کیا ہے اور انہیں بد عقیدگی میں پڑنے سے بچایا ہے اور یہ بات ثابت کر دی ہے کہ احادیثِ صحیحہ سے رجم کا ثابت ہونا عین حکمِ قرآنی ہے اور اس کے ساتھ آپ رحمۃ اللہ علیہ نے قرآن کریم سے ثابت کر دیا کہ رجم حکمِ الٰہی ہے، آپ سورۂ مائدہ کی درج ذیل آیت کی تشریح کرتے ہوئے ثابت کرتے ہیں کہ رجم حکمِ خدا ہے۔

'' وکیف یحکمونک وعندھم التوراته فیھا حکم

الله" (المائدہ، ٤٢)

"اور (اے اللہ کے رسول ﷺ! وہ یہودی) کس طرح آپ کو حکم بناتے ہیں حالانکہ ان کے پاس تورات ہے جس میں اللہ کا حکم پایا جاتا ہے" اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے علامہ کاظمی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں۔

"اس آیت کریمہ میں لفظ "حکم اللہ" کے معنیٰ متواتر صرف رجم ہیں اور رسول اللہ ﷺ سے لے کر آج تک یہی معنیٰ تواتر سے منقول ہوتے چلے آئے ہیں جس طرح الفاظِ قرآن کے الفاظ منقول متواترہ قرآن ہیں بالکل اسی طرح الفاظِ قرآن کے معانی منقولہ متواترہ بھی قرآن ہیں، اسی لیے کہا گیا کہ "**القرآن اسم للنظم والمعنٰی جمیعا**" یعنی قرآن لفظ اور معنیٰ کے مجموعہ کا نام ہے، بیشک لفظ "رجم" اس آیت میں صراحۃً مذکور نہیں لیکن "حکم اللہ" کے معنیٰ چونکہ "رجم" ہی ہیں اس لیے یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ کسی نے رجم کی نفی کی ہے تو اس سے مراد صرف لفظِ رجم ہے اس کے معنیٰ کی نفی مراد نہیں اور معنیٰ جب تواتر سے ثابت ہیں تو یہ کہنا بالکل صحیح ہوگا کہ قرآن میں رجم حق ہے یعنی اس کا حکم موجود ہے۔"

(کاظمی، علامہ سید احمد سعید کاظمی رحمۃ اللہ علیہ، (رجم اسلامی سزا ہے) ج ۳ ص ۳۹۹ طبع اول ۱۹۸۷ء مکتبہ فریدیہ ساہیوال)

قرآن پاک سے آج تک کسی فقیہہ یا مجتہد نے رجم کو حکمِ الٰہی ثابت نہیں کیا یہ صرف کاظمی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی بصیرت وفہم وفراست تھی جس نے قرآن سے ثابت کیا کہ رجم حکمِ الٰہی ہے، حضور ﷺ سے لیکر آج تک کے بزرگانِ دین علمائے امت محدثین، مجتہدین وغیرہم تمام نے قرآن سے ثابت شدہ حضور ﷺ کے ہر فرمان کو اللہ کا فرمان سمجھا اور اس پر عمل کیا لیکن جدید دور کے ملحدین نے اعتراض کرکے مذہب حقہ سے علیحدگی اختیار کی، علامہ کاظمی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں۔

"اللہ تعالیٰ کے احکم الحاکمین ہونے میں کوئی شک نہیں، حقیقی حکم اسی کا ہے اور احکم الحاکمین حقیقی وہی ہے اور یہ حقیقت بھی شک وشبہ سے بالاتر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے

اپنے رسول کو نائب بنایا، قانون حکم اور فیصلہ کا بنیادی مرکزی اور سرچشمہ اپنے رسول کی ذات کو قرار دیا اور قرآن مجید میں اعلان فرمایا" **فلا وربك لايومنون حتّٰى يحكموك فيما شجر بينهم ثم لايجدوا فى انفسهم حرجا مما قضيت ويسلموا تسليما" (النساء، ٦٥)**

"اے رسول ﷺ! آپ کے رب کی قسم! وہ مومن نہیں ہو سکتے یہاں تک کہ وہ اپنے ہر اختلاف میں آپ کو حاکم نہ مانیں پھر جو بھی فیصلہ آپ کردیں اپنے دل میں اس سے تنگی محسوس نہ کریں اور بہ دل وجان اسے پوری طرح مان لیں۔" یہ آیت کریمہ علیٰ رؤس الاشہاد اعلان کررہی ہے کہ اللہ کی زمین پر اللہ کے رسول ہی حاکم ہیں انہیں اختیار ہے کہ وہ اللہ کے نائب ہونے کی حیثیت سے جو چاہیں فیصلہ کریں "مما قضیت" میں "ما" عام ہے ان کے ہر فیصلہ کو (خواہ قرآن میں مذکور ہو یا نہ ہو) بلا چون وچرا تسلیم کرنا مدارِ ایمان ہے، اس کے بعد بھی رسول کے قول وفعل کو حجتِ شرعیہ نہ سمجھنا ہماری سمجھ سے بالاتر ہے۔"

(کاظمی، علامہ سید احمد سعید کاظمی رحمۃ اللہ علیہ، رجم اسلامی سزا ہے، ج ۳ ص ۳۹۶ مکتبہ فریدیہ ساہیوال)

شاہ صاحب نے احادیث سے ثابت کیا کہ نبی کریم ﷺ نے رجم پر عمل کیا ہے اور نبی کریم ﷺ کا قول وفعل ہمارے لیے حجتِ تامہ ہے، اگر کوئی اس کی مخالفت کرتا ہے تو وہ حکمِ خدا کی مخالفت کرتا ہے، شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس مقالہ کے ساتھ یہ بھی ثابت کیا ہے کہ "رجم" حد ہے تعذیر نہیں جیسا کہ بعض لوگوں نے اسے سمجھا ہے، آپ حد، قصاص اور تعذیر کی تعریف یوں بیان کرتے ہیں۔

حد، قصاص، تعذیر:

شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے مختلف آئمہ کرام کی کتب کے حوالہ جات کے بعد فرمایا" مختصر الفاظ میں اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے کہ حدود عقوبت مقدرہ ہے جو حق اللہ ہونے کی حیثیت سے واجب ہوتی ہے اس میں جبر نقصان کا کوئی تصور نہیں پایا جاتا

اور قصاص ایسی عقوبت مقدرہ ہے جو حق العبد ہونے کی حیثیت سے واجب ہوئی جس
میں جبر نقصان بھی پایا جاتا ہے اور تعذیر ایسی عقوبت ہے جس کا اندازہ شرع کی طرف
سے مقرر نہیں کیا گیا، کیونکہ وہ کبھی ضرب سے ہوتی ہے اور کبھی حبس سے، وہ حاکم کی
رائے کی طرف مفوض ہوتی ہے۔''

(کاظمی، علامہ سید احمد سعید کاظمی رحمۃ اللہ علیہ، رجم اسلامی سزا ہے، ج ۳ ص ۷۷۴ مکتبہ فریدیہ ساہیوال)

شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے اس طرح اور بہت سے مقالات میں جن میں ''التبشیر''
میں حضور ﷺ کے خاتم النبیین کی حیثیت سے واضح کیا گیا ہے ''صمصام'' میں ملائک و
رسل کو طاغوت کہنے والوں کا رد ہے۔ ''تسبیح الرحمٰن'' میں کذب باری تعالیٰ ثابت
کرنے والوں کا رد ہے۔ ''الحق المبین'' میں حضور ﷺ کے حق میں بعض لوگوں کے
گستاخانہ اقوال کا رد ہے۔ ایک مقالہ ''وما اہل بغیر اللہ بہ'' کے عنوان سے تحریر فرمایا،
ایک مقالہ میں ''بیس رکعت تراویح کا ثبوت'' پیش کیا گیا، غرضیکہ اسی طرح بے شمار
مسائل ہیں جنھیں کاظمی رحمۃ اللہ علیہ نے حل کیا ہے۔

وفاقی شرعی عدالت کے چیف جسٹس کے استفسار پر علامہ کاظمی رحمۃ اللہ علیہ نے فتویٰ دیا
کہ اہانتِ رسالت مآب اور تنقیص نبی کریم ﷺ کی سزا کتاب وسنت اجماعِ امت
اور تصریحات علمائے امت سے واضح ہے کہ ہر گستاخِ رسول کی سزا قتل ہے، اس مسئلے
میں اہلِ حق میں سے کبھی کسی نے اختلاف نہیں کیا۔

(کاظمی، علامہ سید احمد سعید کاظمی رحمۃ اللہ علیہ (گستاخ رسول کی سزا قتل) ص ۷ اشاعت اول، ۱۹۸۸ء مرکزی مجلسِ رضا لاہور)

علامہ کاظمی رحمۃ اللہ علیہ دلائل دینے کے بعد تحریر فرماتے ہیں ''یہاں تک ہمارے بیان
سے یہ بات واضح ہوگئی کہ کتاب وسنت اجماعِ امت اور اقوالِ علمائے دین کے مطابق
گستاخِ رسول کی سزا یہی ہے کہ وہ حداً قتل کیا جائے، اس کے بعد حسبِ ذیل امور کی
وضاحت بھی ضروری ہے۔

۱) بارگاہِ نبوت ﷺ کی توہین وتنقیص کو موجب حد جرم قرار دینے کیلئے یہ شرط صحیح
نہیں ہے کہ گستاخی کرنے والے نے مسلمانوں کے مذہبی جذبات کو مشتعل کرنے کی
غرض سے گستاخی کی ہو، یہ شرط ہر گستاخِ نبوت کے تحفظ کے مترادف ہوگی، اور توہینِ
رسالت کا دروازہ کھل جائے۔

۲) صریح توہین میں نیت کا اعتبار نہیں ''راعنا'' کہنے کی ممانعت کے بعد اگر کوئی
صحابی نیتِ توہین کے بغیر حضور ﷺ کو راعنا کہتا تو وہ ''واسمعو للکافرین عذاب الیم''
کی قرآنی وعید کا مستحق قرار پاتا جو اس بات کی دلیل ہے کہ نیتِ توہین کے بغیر بھی
حضور ﷺ کی شان میں توہین کا کلمہ کہنا کفر ہے۔

۳) یہاں اس شبہ کا ازالہ بھی ضروری ہے کہ اگر کسی مسلمان کے کلام میں ننیانوے
وجوہ کفر کی ہوں اور اسلام کی صرف ایک وجہ کا احتمال ہو تو فقہاء کا قول ہے کہ کفر کا فتویٰ
دیا جائے گا، اس کا ازالہ یہ ہے کہ فقہاء کا قول اس تقدیر پر ہے کہ کسی مسلمان کے کلام
میں ننانوے وجوہ کفر کا صرف احتمال ہو کفر صریح نہ ہو لیکن جو کلام مفہوم توہین میں صریح
اس میں کسی وجہ کو ملحوظ رکھ کر تاویل کرنا جائز نہیں۔

آخر میں عرض کروں گا کہ توہینِ رسالت کی حد اس پر جاری ہو سکے گی جس کا یہ
جرم قطعی اور یقینی طور پر ثابت ہو جائے اس کے بغیر کسی کو اس جرم کا مرتکب قرار دے کر
قتل کرنا ہرگز جائز نہیں، تواتر بھی قطعی دلیل ہے اگر کوئی شخص توہین کے کلمات صریحہ
بول کر یا لکھ کر اس بات کا اعتراف کرے کہ یہ کلمات میں نے بولے یا میں نے لکھے
ہیں تو یقیناً وہ واجب القتل ہے، خواہ وہ کتنے ہی بہانے بنائے اور کہتا پھرے کہ میری
نیت توہین کی نہ تھی۔''

(کاظمی، علامہ سید احمد سعید کاظمی رحمۃ اللہ علیہ، (گستاخ رسول کی سزا قتل) ص ۳۰، اشاعتِ اول ۱۹۸۸ء مرکزی مجلسِ رضا لاہور)

قرآن مجید، سنت اور اجماعِ امت سے گستاخِ رسول کی سزا قتل ثابت کرنے

کے بعد علامہ کاظمی رحمۃ اللہ علیہ نے وضاحت فرما کر ان لوگوں کا ہمیشہ کیلئے ناطقہ بند کر دیا جو توہینِ رسالت کر مرتکب ہونے کے بعد جان خلاصی کیلئے مختلف عذر پیش کرتے ہیں، جو کہ علامہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی گہری سوچ اور عظیم فہم وفراست کی دلیل ہے۔

شمالی آئرلینڈ میں ایک مقام کا نام لنڈی ڈیری ہے، جس کا عرض بلند شمالی ۵۵ درجہ ہے اور طول بلند غربی سات درجہ بیس دقیقہ ہے وہاں موسمِ گرما کی راتوں میں غروبِ آفتاب سے لے کر صبح صادق ہونے تک تقریباً سوا تین گھنٹے کا زمانہ ہوتا ہے اور ان راتوں میں وہاں غروبِ آفتاب سے لیکر آدھی رات کو صبح صادق ہو جاتی ہے، اس کے متعلق علامہ کاظمی رحمۃ اللہ علیہ سے تین سوال کیے گئے جن کا انھوں نے مدللانہ جواب دیا، پہلے دو سوالوں کا جواب انھوں نے مختصر دیا اور آخری سوال کے جواب میں خوب بحث کی، ان کی بحث کے چند اقتباسات ہم نے پیش کیے ہیں تا کہ بات سمجھ آجائے، استفسار کے سوال درج ذیل ہیں۔

۱) اگر کوئی آدمی وہاں ان راتوں میں مغرب کی نماز پڑھ کر فوراً عشاء کی نماز پڑھ لے تو عشاء کا فرض ادا ہو جائے گا یا نہیں؟

۲) اگر آدمی وہاں ان راتوں میں غروبِ آفتاب کے گھنٹہ یا سوا گھنٹہ کے بعد عشاء کی نماز پڑھی تو عشاء کا فرض ادا ہو جائے گا یا نہیں؟

۳) ان ایام میں وہاں عشاء کی نماز کس وقت پڑھی جائے؟

علامہ کاظمی رحمۃ اللہ علیہ نے ان کے جواب ترتیب وار یوں بیان کیے۔

۱) وہاں مغرب کی نماز پڑھنے کے فوراً بعد اگر عشاء کی نماز پڑھی گئی تو عشاء کا فرض ادا نہ ہوگا۔

۲) صورتِ مسئولہ میں عشاء کی نماز کا وجوب طلوعِ فجر کے بعد ہی ہوگا اس لیے طلوعِ فجر سے پہلے عشاء کینماز پڑھی تو ذمہ سے ساقط نہ ہوگی۔

۳) عشاء کی نماز طلوعِ فجر کے بعد پڑھی جائے گی ترتیب کا تقاضہ یہ ہے کہ پہلے

عشاء کی نماز پڑھیں اس کے بعد فجر کی نماز ادا کریں، صورتِ مسئولہ میں علماء کا اختلاف ہے، بعض کا قول یہ ہے کہ جب تک نماز کا وقت متحقق نہ ہو تو نماز فرض نہیں ہوتی گویا وقت کا ہونا نماز کی فرضیت میں ان کے نزدیک اصل ہے، لیکن بعض دوسرے فقہاء کہتے ہیں کہ اوقات اصل نہیں بلکہ صلوٰۃ خمس کا وجوب اصل ہے، ان کا کہنا ہے کہ دراصل پانچ نمازیں فرض ہیں جن میں سے ایک کا کم ہونا بھی دلائلِ قطعیہ کے خلاف ہے، ان فقہاء کی تحقیق یہ ہے کہ جس جگہ کسی نماز کا وقت خاص نہ آئے وہاں بھی نماز فرض ہوگی، وہ یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ نماز فرض موقف ہے، مگر ان اوقاتِ مخصوصہ کو یہ فقہاء کرام بطورِ علامت مانتے ہیں، جہاں وہ اوقات پائے جائیں گے پانچ نمازیں ان پر تقسیم کر دی جائیں گی اور اگر کسی مقام پر کسی نماز کا وقت خاص متحقق نہ ہو تو نماز کا نفسِ وجوب ان کے نزدیک ساقط نہ ہوگا اور تقدیری وقت میں اس نماز کا پڑھنا واجب ہوگا۔" کاظمی رحمۃ اللہ علیہ کے جواب سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کا تعلق موخر الذکر فقہاء کرام سے ہے، کیونکہ آپ نے موخر الذکر فقہاء کے حق میں دلائل دیے ہیں اور استفتاء میں بھی لکھے ہیں۔

"ہمارے نزدیک مسئلہ زیرِ بحث میں قائلین فرضیتِ صلوٰۃ کا قول راجح ہے کیونکہ ان کی ترجیح کے دلائل اقویٰ ہیں۔"

علامہ کاظمی رحمۃ اللہ علیہ آگے لکھتے ہیں۔

"نمازِ عشاء پڑھنے والا ادا یا قضاء کی نیت نہ کرے گا کیونکہ اس کا وقت متحقق نہیں ہوا اور قضاء فرع ہے ادا کی، اصل کے بغیر فرع کا تحقق کیسے ہوگا؟ لہٰذا ادا یا قضا کی تعیین کے بغیر عشاء کے فرض پڑھے جائیں گے، وتر، فرض عشاء کے تابع ہیں اس لیے فرض عشاء کی طرح ان کا پڑھنا بھی واجب ہے، لیکن نمازِ تراویح نہ پڑھیں گے کیونکہ یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ نمازِ عشاء کا وقت آیا اور گزر گیا۔"

(اس استفتاء کی اصل فوٹو کاپی ہمارے پاس موجود ہے جس پر علامہ

کاظمی رحمۃ اللہ علیہ کے دستخط موجود ہیں، مقالہ نگار)

اس فتویٰ میں علامہ کاظمی رحمۃ اللہ علیہ نے قرآن وحدیث علمائے سلف کے اقوال اور قیاس کے وہ دلائل پیش کیے ہیں جن کو دیکھ کر ہمیں کہنا پڑتا ہے کہ علامہ کاظمی رحمۃ اللہ علیہ وقت کے بہت بڑے فقیہہ تھے جنھوں نے اپنے دور کے ہر مشکل مسئلہ کا حل پیش کیا ہے حکمرانوں اور عوام الناس کو ہر وقت صحیح راستہ دکھایا ہے جو کہ ایک فقیہ کی شان ہوتی ہے۔



بسم اللہ الرحمن الرحیم

باب نمبر 30

حضرت غزالئ زماں رحمۃ اللہ علیہ اور عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم

از:

پروفیسر محمد منشاد علی، بہاولپور

ماہنامہ السعید امام اہل سنت نمبر ۲۰۰۶ صفحہ ۴۱ تا ۴۳

ادب گاہیست زیر آسمان از عرش نازک تر

نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید اینجا

پروفیسر محمد منشاد علی فرماتے ہیں کہ غزالی زماں حضرت علامہ سید احمد سعید کاظمی رحمۃ اللہ علیہ کی تعلیمات کا خلاصہ اور آپ کے ارشادات کا لب لباب ہے عشقِ رسول ﷺ آپ نے عشقِ رسول ﷺ کو اپنی حیاتِ مقدسہ کا نصب العین بنایا اور ہمیشہ مسلمانوں کو عشقِ رسول ﷺ ہی کا درس دیا، کوئی دعویٰ بغیر دلیل کے قابل قبول نہیں ہوتا، اسیطرح جب کوئی شخص عشقِ رسول ﷺ کا دعویٰ کرے تو اس کے اقوال وافعال پر نظر ڈالی جائے گی، اگر اس نے اپنی گفتار اور اپنے کردار سے رسول اللہ ﷺ کی تعظیم وتوقیر کا ثبوت فراہم کر دیا اور اس کا دعویٰ ہے، کہ وہ رسول اللہ ﷺ سے محبت رکھتا ہے مان لیا جائے بصورتِ دیگر اسے کاذب اور جھوٹا سمجھا جائے، قرآن مجید میں صاف طور سے رب تعالیٰ نے اعلان فرمایا کہ منافقین اگرچہ اپنے آپ کو مومن کہتے ہیں لیکن وہ مومن نہیں۔

"وما هم بمومنين" (پ ۱ ، البقره ۸)

نیز ارشاد فرمایا کہ اگرچہ منافق بہت زور وشور سے کلمہ شہادت پڑھ کر اپنے مومن ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اور اے محبوب تمہاری رسالت کی گواہی دیتے ہیں لیکن یہ سب کچھ زبانی دعویٰ ہے ان کے دل میں ایمان نہیں اور فرمایا کہ بیشک منافقین جھوٹے ہیں۔ (پ۱۲، الاحزاب ۶)

اس سے معلوم ہوا کہ جو شخص رسول اللہ ﷺ کو جان سے زیادہ عزیز نہ جانے وہ مومن نہیں، بہت سی احادیث مبارکہ میں بھی یہی مضمون وارد ہے، حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے حضور سید العالمین نے فرمایا کہ تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہوسکتا جب تک میں اسے اسکے باپ بیٹے اور سب لوگوں سے زیادہ محبوب ہو جاؤں۔ (اشعۃ اللمعاۃ، ج۱ ص۴۷)

اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ بھی واضع طور پر فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ کی تعظیم وتوقیر بھی ہر مسلمان پر لازم ہے کیونکہ تعظیم کے بغیر محبت کا دعویٰ باطل ہے جو شخص محبت رسول اللہ ﷺ کا مدعی ہو اور پھر شانِ اقدس میں توہین اور تنقیص کا مرتکب ہو وہ ہرگز مومن نہیں ہوسکتا، حضراتِ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم امت کا بہترین گروہ انہیں زبانِ رسالت ﷺ نے نجومِ ہدایت قرار دیا، صحابہ کرام تعظیم رسول ﷺ میں بھی ہمارے مقتداء اور راہنما ہیں وہ عشقِ رسول سے سرشار تھے محبت رسول الہ ﷺ ان کے رگ وریشے میں رچ بس گئی تھی بکثرت احادیث اور آثارِ صحابہ کرام کے عشق ومحبت کے کیف آور واقعات سے مالا مال ہیں اس باب میں حضرت عروہ بن مسعود کو حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں بھیجا واپس جا کر عروہ نے قریش کو بتایا کہ میں نے روم ایران اور حبشہ کے بادشاہوں کو دیکھا ہے ان کے درباری اپنے بادشاہوں کی ایسی تعظیم نہیں کرتے تھے جیسی میں نے حضرت محمد ﷺ کے صحابہ کو ان کی تعظیم کرتے ہوئے دیکھا، ہاں یقیناً جسے اللہ تعالیٰ عشق، رسول ﷺ کی دولت سے مشرف فرمائے اور جسے تعظیم رسول ﷺ کی سعادت سے نوازے وہ نہایت ہی خوش نصیب ہے، ایسے ہی لوگ فلاح پانے والے ہیں اور انہیں کو رضا رضوان اور خوشنودی خداوندی حاصل ہوگی، اب اس موضوع پر حضرت غزالی زماں کی مشہور تصنیف "الحق المبین" سے چند نہایت گراں قدر خدمات ہدیہ قارئین ہیں قرآن کریم اور تعظیم رسول اللہ ﷺ کا عنوان قائم فرما کر حضرت غزالی زماں رحمۃ اللہ علیہ یوں رقمطراز ہیں "اس حقیقت سے انکار نہیں ہوسکتا کہ تمام دین ہمیں حضور اقدس ﷺ کی ذاتِ اقدس سے ملا ہے، حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات اس کے ملائکہ اس کی کتابوں رسولوں اور قیامت وغیرہ عقائد واعمال سب چیزوں کا علم رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ مقدسہ سے ملا ہے اور بس بناء بریں رسول کریم ﷺ کی حیثیت ایسی عظیم ہے جس کے وزن کو مومن کا دل ودماغ محسوس کرتا ہے، مگر کماحقہٗ اس کا اظہار کسی صورت میں ممکن نہیں، ایسی صورت میں تعظیم کی اہمیت

کسی مسلمان سے مخفی نہیں رہ سکتی اس لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں نہایت اہتمام کے ساتھ مسلمانوں کو بارگاہِ رسالت ﷺ کے آداب کی تعلیم فرمائی۔'' اس مضموم کی تائید میں حضرت غزالیٔ زماںؒ نے قرآن مجید کی چار آیات مبارکہ درج فرمائی ہیں، جن کا ترجمہ مندرجہ ذیل ہے۔

۱) اے ایمان والو! بلند نہ کرو اپنی آوازیں نبی کریم ﷺ کی آواز پر اور نہ ان کے ساتھ بہت زور سے بات کرو جیسے تم آپس میں ایک دوسرے سے زور سے بولا کرتے ہو کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارا کیا کرایا سب کچھ غارت جائے اور تمہیں خبر بھی نہ ہو۔

۲) بیشک جو لوگ اپنی آوازیں پست کرتے ہیں رسول اللہ ﷺ کے نزدیک وہ ایسے لوگ ہیں جن کے دل کو اللہ تعالیٰ نے پرہیز گاری کیلئے پرکھ لیا ہے ان کیلئے بخشش اور بڑا ثواب ہے۔

۳) اے نبی ﷺ! بیشک جو لوگ آپ کو آپ کے رہائشی حجروں کے باہر سے پکارتے ہیں ان میں اکثر بے عقل ہیں، اگر یہ لوگ اتنا صبر کرتے کہ آپ خود حجرہ سے نکل کر ان کیطرف تشریف لے آتے تو ان کے حق میں بہت بہتر ہوتا اور اللہ تعالیٰ بخشنے والا اور مہربان ہے۔

۴) اے ایمان والو! تم نبی کریم ﷺ کے ساتھ ''راعنا'' کہہ کر خطاب نہ کرو بلکہ ''انظرنا'' کہا کرو اور دھیان لگا کر سنتے رہا کرو اور کافروں کیلئے عذاب دردناک ہے۔

قرآن مجید کی مقدس آیات اور ان کا ترجمہ تحریر فرمانے کے بعد ارشاد فرماتے ہیں کہ ان آیاتِ طیبات میں بارگاہِ رسالت ﷺ کے آداب اور طرزِ تخاطب میں تعظیم و توقیر کو ملحوظ رکھنے کی جو ہدایات اللہ تعالیٰ نے فرمائی ہیں محتاجِ تشریح نہیں، نیز ان کی روشنی میں شانِ نبوت کی ادنیٰ گستاخی کا جرمِ عظیم ہونا آفتاب سے زیادہ روشن ہے، اب حضرت امام اہلسنت کے یہ ایمان افروز کلمات بھی ملاحظہ فرمائیے جو آپ نے الحق المبین کے پیشِ لفظ میں درج فرمائے ہیں، سبحان اللہ! حق تو یہ ہے کہ رخسارِ محمدی ﷺ

آئینۂ جمالِ حق ہے اور خد و خالِ مصطفیٰ ﷺ مظہرِ حسنِ کبریا، پھر کس طرح ممکن ہے کہ ایک کا انکار دوسرے کے اقرار کے ساتھ جمع ہو جائے، اگر حق کیساتھ باطل، نور کے ساتھ ظلمت، کفر کے ساتھ اسلام کا اجتماع متصور ہو تو یہ بھی ممکن ہوگا، جب وہ محال ہے تو یہ بھی محال ہے۔

حضرت غزالیٔ زماںؒ کی عادت کریمانہ تھی کہ ہر مسئلہ کو قرآن و حدیث سے ایسے انوکھے طریقے سے استدلال فرماتے کہ جس سے خود اہل علم دنگ رہ جاتے تھے ایک دفعہ استاذی المعظم نے عرض کی کہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے بے پناہ ملکہ عطا فرمایا ہے، شکر ہے کہ آپ ہماری صفوں میں شامل ہیں، اگر مخالفین میں ہوتے تو پھر ہماری خیر نہ تھی، آپ نے برجستہ فرمایا کہ اگر میں ان میں ہوتا تو ان کے گستاخانہ عقائد اور بے ادبی کے باعث مجھے علمِ دین میں کبھی ایسا ملکہ حاصل نہ ہو پاتا، پھر فرماتے ہیں بنابریں اس حقیقت کو تسلیم کرنیکے سوا کوئی چارہ کار نہیں کہ حسنِ محمدی ﷺ کا انکار جمالِ خداوندی کا انکار اور بارگاہِ نبوت کی توہین ہے، پس یہ نتیجہ نکلا کہ اللہ تعالیٰ کی شان میں گستاخی اور رسول الہ ﷺ کی توہین کسی صاحبِ ایمان سے ممکن نہیں، امام المتکلمین ہر مسلمان کو دعوت دیتے ہیں اور ہر صاحب عقل و شعور سے دریافت فرماتے ہیں کہ بتاؤ کہ شانِ الوہیت کی توہین کرنے والا مومن نہیں تو گستاخِ نبوت کیونکر مسلمان ہو سکتا ہے، کل پاکستان سنی کانفرنس ملتان منعقدہ ۱۶، ۱۷، اکتوبر ۱۹۷۸ء کے موقعہ پر خطبہ میں حضرت امام اہلسنت نے فرمایا تھا کہ'' منافقین کا گروہ اقوال و اعمال کے اعتبار سے مومنین کے ساتھ شامل تھا لیکن ان کے اعتقادات قلبی امور کا حال قرآن و حدیث کی روشنی میں سب کو معلوم ہے اس لیے صرف اقوال و اعمال کو ایمان کا معیار قرار نہیں دیا جا سکتا، اس حکمت کی بناء پر جس طرح اقوال و اعمال کو عقائد کی بنیاد پر قائم کیا گیا ہے بالکل اسی طرح حضرت رسول اللہ ﷺ کے عشق و محبت اور تعظیم و توقیر کو عقائد کی بنیاد بنایا گیا، مومنین اور منافقین کے درمیان یہ چیز حد فاصل ہے اور امتیازی

نشان کی حیثیت رکھتی ہے، خلاصہ یہ ہوا کہ مومنین کو منافق سے ممتاز کرنے والی چیز در حقیقت عشق ومحبت اور تعظیم وتوقیر نبوی ﷺ ہے۔



بسم اللہ الرحمن الرحیم

باب نمبر 31

امامِ اہلسنت رحمۃ اللہ علیہ کی حاضر جوابی کے چند نمونے

مولانا سراج احمد سعید، اوچ شریف

ماہنامہ السعید امام اہل سنت نمبر جنوری ۲۰۰۰ صفحہ ۱۲۶ تا ۱۲۹

مولانا سراج احمد سعید فرماتے ہیں کہ امامِ اہلسنت غزالیٔ زماں، رازیٔ دوراں، شیخ المحدثین، سند المفسرین، زبدۃ المحققین، عمدۃ الواصلین، قطب العارفین، فخر الصالحین، قدوۃ الکاملین، غوثنا وغیاثنا حضرت علامہ سید احمد سعید کاظمی رحمۃ اللہ علیہ ووسع اللہ قبرہ بالرحمۃ والبرکۃ، واعلی اللہ مقامہ فی الجنۃ کا دیدار پرانوار، بندۂ ناچیز کو مدرسہ اسلامیہ عربیہ انوار العلوم، بستی فیض آباد علاقہ اوچ شریف میں نصیب ہوا جبکہ میری عمر بارہ برس کی تھی اور میں استاذ العلماء، مناظرِ اسلام شیخ المحدثین حضرت علامہ مولانا منظور احمد فیضی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس فارسی کے اسباق پڑھتا تھا، حضور قبلہ غزالیٔ زماں رحمۃ اللہ علیہ مدرسہ کے سالانہ جلسہ دستارِ فضیلت پر تشریف لائے، نمازِ ظہر کی تیاری کیلئے آپ نے وضو کیا، وضو کیلئے پانی لانے کی سعادت بندہ کو نصیب ہوئی، نماز کے بعد حضور غزالیٔ زماں رحمۃ اللہ علیہ کا خطاب لاجواب ہوا اور دستارِ فضیلت کی تقریب ہوئی، اس کے بعد آپ شہر اوچ شریف میں انجمن فدایانِ رسول کے سالانہ رجبی شریف پر تشریف لائے اور محققِ وقت، مناظرِ اسلام نائب شیخ الحدیث مدرسہ انوار العلوم، حضرت علامہ مولانا مفتی محمد اقبال سعیدی صاحب حفظہ اللہ کے گھر جلوہ گر تھے، طالب علموں کے ہمراہ میں بھی آپ کی زیارت کیلئے خدمت اقدس میں حاضر ہوا، آپ اس وقت نمازِ ظہر ادا فرما رہے تھے، میرے ہمراہی طالب علم تو جلسہ گاہ میں چلے گا اور میں وہاں رک گیا اور کہا کہ میں حضرت کی قدم بوسی کے بعد جلسہ گاہ میں آؤں گا، حضرت قبلہ نہایت ہی خشوع وخضوع سے عباداتِ الٰہی میں مصروف رہے، اسی دوران مولانا مفتی محمد اقبال سعیدی نے مجھے فرمایا کہ مولانا آج وقت ہے اور حضور تخلیہ میں جلوہ گر ہیں، بیعت کیلئے گزارش کرو! کام بن جائے گا، جب آپ نماز سے فارغ ہوئے اور وظائف پڑھ لینے کے بعد دعا مانگ لی تو نیاز مند حضرت کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا اور بعد از قدم بوسی عرض کیا حضور! مجھے اپنے دامنِ رحمت اور آغوشِ شفقت میں پناہ دیجئے اور شرفِ بیعت سے سرفراز فرمائیے۔

آپ ابھی اپنی جائے نماز پر قبلہ رخ تشریف فرما تھے، ہلکی سی مسکراہٹ کے بعد فرمایا، اچھا مولانا، آپ کی یہ تمنا ہے، میں نے عرض یا، حضور مجھے خواب میں یہی حکم دیا گیا ہے، آپ نے اشارۃً فرمایا کہ خاموش ہو جاؤ اور مجھے اپنے سامنے بیٹھنے کا حکم دیا، میں نے اپنے شیخ، ہادی ومرشد کے سامنے اپنے زانو تہہ کر دیے اور مودب ہو کر بیٹھ گیا، آپ نے میرے ہاتھوں کو اپنے مقدس ہاتھوں میں لیا ہی تھا کہ حضرت مولانا خورشید احمد فیضی صاحب کے نعت خواں اور حضرت کے مرید ملک سلطان دوڑتے ہوئے آئے اور اپنے بیٹے کو بھی ساتھ لائے اور عرض گزار ہوئے کہ حضور اس غلام کو بھی اپنے حلقۂ ارادت میں شامل فرما لیجئے، ملک سلطان نے اپنے بیٹے کو میرے ساتھ بٹھا دیا اور آپ نے اس کے ہاتھ بھی شامل کر لیے اور ہم دونوں کو سلسلۂ چشتیہ صابریہ، سلسلۂ قادریہ، سلسلۂ نقشبندیہ اور سلسلۂ سہروردیہ میں بیعت فرمایا، حالانکہ عام طور پر آپ پہلے دو سلسلوں میں بیعت کیا کرتے تھے، اسی طرح آپ کے ساتھ ایک روحانی رشتہ قائم ہو گیا اور آپ کی غلامی کا قلادہ ہمارے گلے کی زینت بن گیا، اس کے بعد حضرت قبلہ کی خدمت میں حاضری دینا ایک معمول بن گیا، سرکار غزالیٔ زماں رحمۃ اللہ علیہ بھی ہمیشہ اپنی دعاؤں اور شفقتوں اور محبتوں سے نوازتے رہے، ان ملاقاتوں وزیارتوں کے دوران جو کچھ دیکھا اور جو کچھ سنا اس کا احاطۂ تحریر میں لانا فی الحال ممکن نہیں، البتہ کچھ یادیں اور کچھ باتیں برکت حاصل کرنے کیلئے اور ذکر الصالحین کفارۃ کے تحت پیش خدمت ہیں۔

کاتب الحروف نے آپ کی دعا سے مشکلیں حل ہوتی دیکھیں، لوگوں کی پریشانیاں کافور ہوتی دیکھیں، بے اولاد جوڑی کی جھولیاں گوہر مراد سے بھرتی دیکھیں، علم کی بزم میں باطل سے حق کی رزم دیکھی، پیچیدہ مسئلے اور لاینحل عقدے چشم زدن میں کھلتے دیکھے، سیف زبانی اور قادر الکلامی کا حسین امتزاج دیکھا، فی الحال حضرت والا کی دور اندیشی اور حاضر جوابی کے چند نمونے ملاحظہ کریں ایک سائل نے عرض کیا

کہ حضور! حدیث شریف میں ہے "**انا مدینة العلم وعلی بابها**" میں علم کا شہر ہوں اور علی اس کا دروازہ ہیں، نیز "**علی منی**" علی مجھ سے ہے نیز "**انت منی بمنزلة هارون منی موسٰی**" اے علی تم مجھ سے اسی طرح ہو جس طرح موسیٰ علیہ السلام سے ہارون علیہ السلام تھے" ان تینوں حدیثوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضور پرنور ﷺ کے بعد خلافت کے مجاز حضرت علی رضی اللہ عنہ تھے، سیدی ومرشدی قبلہ غزالی زماں رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو دو لفظوں میں جواب عنایت فرما کر خاموش کر دیا، آپ نے فرمایا "ارے بھائی! ان حدیثوں اور ان جیسی دوسری حدیثوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت صدیق اکبر مظہر اسرارِ نبوت تھے اور حضرت علی مظہر اسرارِ ولایت ہیں، نبی کے بعد خلافت کا حق دار وہ ہوتا ہے جو مظہر اسرارِ نبوت ہو۔

کسی نے عرض کیا حضور حضرت صدیق اکبر اور حضرت مولا علی رضی اللہ عنہما دونوں موجود ہوں تو پہلے کس کے پاس جانا چاہیے، آپ نے فرمایا کہ تشرعاً پہلے حضرت صدیق اکبرؓ کے پاس جانا چاہیے اور (لفظ لکھنا ہے) پہلے حضرت علی المرتضیٰ کے پاس جانا چاہیے آپ نے فرمایا کہ حضرت سیدنا جبیر بن معطم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک عورت، بارگاہِ رسالت مآب ﷺ میں حاضر ہوئی اور کسی معاملہ میں گفتگو کی سرکار نے اسے دوبارہ آنے کا حکم فرمایا وہ عرض گزار ہوئی کہ یا رسول اللہ ﷺ اگر میں آؤں اور سرکار کو نہ پاؤں تو کہاں جاؤں، سرکار ﷺ نے فرمایا "**فان لم تجدینی فاتی ابی بکر**" (بخاری ومسلم) اگر تو مجھے نہ پا سکے تو ابوبکر کے پاس آجانا۔

کسی نے کہا حضور! مجھے ایک شیعہ نے چکر دے رکھا ہے، وہ کہتا ہے کہ وضو میں پاؤں کا دھونا فرض نہیں بلکہ ان کا مسح ضروری ہے اور دلیل دیتا ہے کہ جب تیمم کیا جاتا ہے تو اس میں پاؤں کے مسح کی ضرورت نہیں، رہتی، آپ نے فرمایا "اس سے پوچھو کہ نہانے کی ضرورت کے وقت پانی پر قدرت نہ ہونے کی صورت میں بھی وہی تیمم کرنا پڑھتا ہے تو کیا ضروری غسل کے وقت بھی پانی پر قدرت ہونے کیصورت میں ہاتھ اور

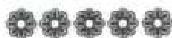
منہ کے ماسوا کا دھونا بھی فرض نہیں ہے؟ جو جواب اس کا ہوگا وہی ہمارا جواب ہے۔

کسی نے گزارش کی کہ سرکار، شیعہ کہتے ہیں کہ وضو میں پہلے پاؤں دھونے چاہییں، کیونکہ ظاہری لحاظ سے پاؤں پورے جسم کی بنیاد ہیں، نیز اس پر گرد وغبار وغیرہ زیادہ پڑتی ہے لہٰذا پہلے ان کا دھونا ضروری ہوا، آپ نے فرمایا "پانی کی تین صفتیں ہوتی ہیں، رنگ، ذائقہ، بُو، اگر ان میں سے پانی کی کوئی ایک صفت بھی کسی غیر طاہر چیز کے اختلاط سے تبدیل ہو جائے تو پانی قابلِ طہارت نہیں رہتا اور یہ بھی ظاہر ہے کہ پانی کی رنگت اس کو چلو میں لینے سے معلوم ہوگی، اس کا ذائقہ منہ میں لینے سے اور اس کی "بُو" پانی کو ناک میں ڈالنے سے معلوم ہوگی لہٰذا پہلے پاؤں تو نہ دھلے بلکہ دیکھو تین عضو دھل گئے جو لوگ پہلے پاؤں دھوتے ہیں پانی کے پاک اور ناپاک ہونے کی تمیز کیسے کریں گے؟

آپ نے فرمایا "اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کی جس آیت میں وضو کرنے کا حکم دیا ہے اس میں جو ترتیب بیان فرمائی گئی ہے اہلسنت اس کے مطابق وضو کرتے ہیں، مثلاً "**اغسلو وجوهكم**" پہلے ہے "**وایدیکم الی المرافق**" دوسرے نمبر پر "**وامسحو برئوسکم**" تیسرے نمبر پر ہے "**وارجلكم الی الكعبين**" چوتھے نمبر پر ہے اللہ تعالیٰ نے جب پاؤں کو دھونا بعد میں رکھا ہے تو ہم کیوں نہ ان کو بعد میں دھوئیں، آپ نے فرمایا اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ پاؤں کو وضو کے آخر میں دھونا فرض ہے، ہمارے پیرانِ پیر حضرت قطب الاقطاب حضرت سید مخدوم جہانیاں بخاری اوچی رحمۃ اللہ علیہ نے عرب کے شیعوں سے مناظرہ کرتے ہوئے فرمایا "پاؤں کو دھونے کی فرضیت پر دلیل "**وایدیکم الی المرافق**" انھوں نے پوچھا وہ کس طرح آپ نے فرمایا الی غائب انتہاء کیلئے آتا ہے، جو یہاں دھونے کی حد بتانے کیلئے آیا اور **وارجلکم الی الکعبین** میں بھی **الی المرافق** کی طرح "**الی**" آیا جو پاؤں کے دھونے کی حد پر دلالت

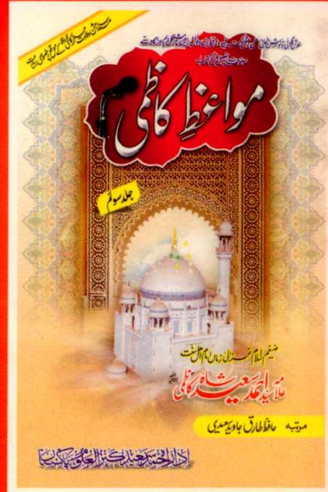
کرتا ہے، آپ کے اس فرمان پر شیعہ لا جواب ہو گئے اور میدان چھوڑ کر بھاگ گئے۔

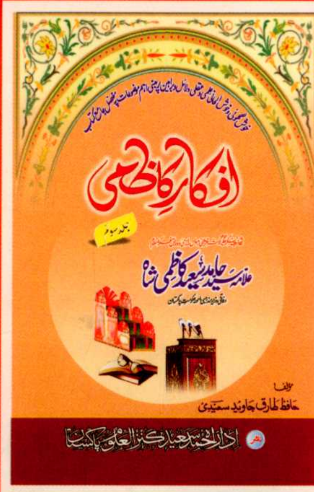
الدام المنظور اسی طرح کے واقعات میں سے ایک واقعہ ۱۴، اگست ۱۹۷۷ء کا زیرِ قلم ہے، رات کو صدرِ پاکستان جناب ضیاء الحق مرحوم کی تقریر تھی اس تقریر میں قائد اہلسنت مولانا امام نورانی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ لاہور ائیر پورٹ پر ہونے والی زیادتی پر صدر نے معافی مانگی اور معذرت کی اور ذوالفقار علی بھٹو کو اس کا ذمہ دار ٹھہرایا، ہم نے تقریر حضرت صاحب قبلہ رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ ریڈیو سے سنی، اس وقت قومی اتحاد پر کاتب الحروف نے سوال کیا تو آپ نے فرمایا، مولانا ایک طرف سوشلسٹ، سوشلزم کا نعرہ لگا رہے ہیں اور ان کے مدمقابل اسلامی بیڑہ موجود ہے اور اس میں وہ جماعتیں سوار ہیں جو اسلامی آئین کے داعی ہیں، سوشلسٹوں کے کفریہ نظام کو روکنا اور اس کے آگے سینہ سپر ہو جانا اور اسلامی بیڑے کو بچانا ہر مسلمان پر فرض ہے، آپ نے فرمایا لوگ کہتے ہیں کہ اتحاد میں بیڈ کریکٹر لوگ امیدوار ہیں، اگر ایسے لوگ اسلام کی بالادستی اور اس کی حفاظت کیلئے آئے ہیں تو ہمارا فرض ہے کہ ہم ان کی اصلاح کریں، ان کی صحیح تربیت کریں اور انکی اس قربانی کی قدر کریں کہ انھوں نے محض نظامِ مصطفیٰ کیلئے سوشلسٹوں کو ٹھوکر مار کر علماء کا ساتھ دیا، اپنی زندگی اسلام کیلئے وقف کر دی، تمام تکلیفیں برداشت کیں، کال کوٹھڑیوں تک کی سزا جھیلی، ان کے گھروں پر گولیاں برسائی گئیں، ان کو صفحہ ہستی سے مٹا دینے کے پروگرام بنائے گئے، لیکن انھوں نے ظالم کے ہر ظلم کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور دامنِ اسلام سے وابستہ رہے۔''

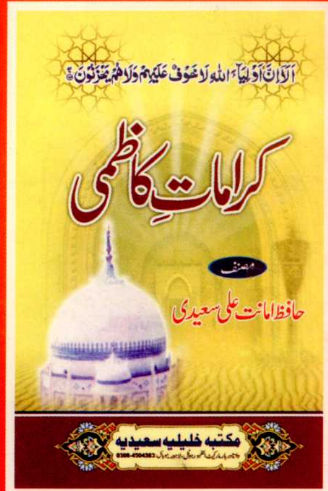


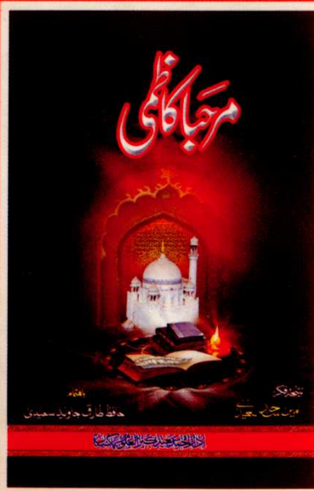


ہماری دیگر مشہور کتب (زیر طبع)









ادارہ احمد سعید کنز العلوم پاکستان